فہرست مضامین

نمبر ۸	بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۶ء	جلد ۹

کیا آپ نے ہمایوں کی توسیعِ اشاعت
کے متعلق اپنا فرض ادا کیا

رسالہ کی ترقی باہمی امداد پر منحصر ہے۔ ہم رسالے کو دلچسپ اور مفید بنانیکی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ نے اس کی توسیعِ اشاعت میں کہاں تک حصہ لیا ہے۔

آپ ہی کہئیے!!

جہاں نما

نباتات کا نظامِ عصبی۔ آجتک یہ خیال عام تھا کہ صرف حیوانات ہی کو دیکھنے، محسوس کرنے اور اپنی زندگی کی روش کو اپنے نظامِ عصبی کے ماتحت رکھنے کی قوت ودیعت کی گئی ہے۔

حال میں سرجے۔ سی۔ بوس نے اس قدیم خیال کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ ساربون کی ایک مجلس میں جہاں سائنس کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے اور جس کے صدر علم نباتات کے مشہور ماہر پروفیسر مالیئرڈ تھے۔ بوس نے اپنی تحقیق و تدقیق کے نتائج کا ایک خاکا پیش کیا۔ اس وقت تک نباتات کے افعال بخلاف حیوانات کے بالکل غیر ارادی سمجھے جاتے تھے۔ بہت سے عمیق تجربوں کے بعد ڈاکٹر بوس نے یہ اکتشاف کیا ہے کہ نباتات کا نظامِ عصبی انسان سے دس گنا زیادہ نازک ہے۔ ڈاکٹر بوس نے اپنے نازک آلات کی مدد سے نباتات کے اُن تمام عصبی سلسلوں کا سراغ لگا لیا ہے جن کے عمل سے نباتات کا کوئی خاص فعل متاثر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بوس کے اس علمی اجتہاد کی داد تو صرف ماہرین سائنس ہی دے سکتے ہیں لیکن اُن کی فلسفیانہ نکتہ آموزی نے فلسفۂ حیاتِ کائنات میں جو ہم آہنگی پیدا کر دی ہے کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سولھویں صدی کے ایک انگریز نے دَورانِ خون کا پتا چلایا تھا لیکن موجودہ صدی کے اس عظیم الشان ہندوستانی عالم نے جو شاعرانہ اور پُراسرار اکتشاف کیا ہے اس کی نظیر سائنس کی دنیا میں نہیں ملتی۔ اس اکتشاف کے بعد کسی رنگین مزاج نوجوان کا یہ شک بجا ہوگا کہ اگر کسی خاتون پر دُور سے ایک پھُول پھینکا جائے تو دونوں میں سے کس کو زیادہ تکلیف ہوگی خاتون کو یا پھُول کو؟

سمندر کے اسرار۔ زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی کے نیچے ہے۔ ۳۵۰۰ فٹ کی گہرائی میں لہریں محسوس نہیں ہوتیں۔ اور اتنی گہرائی پر درجۂ حرارت ہر جگہ یکساں ہوتا ہے۔ قطبی اضلاع کی سخت سردی اور خطِ استوا کے قریب کے گرم علاقوں کی تمازت اس پانی پر نہایت خفیف طور سے

اثر انداز ہوتی ہے۔

ایک میل کی گہرائی میں پانی کے ہر مربع انچ پر ایک ٹن کا دباؤ ہوتا ہے۔

اگر ایک چھ فٹ گہرا لوہے کا صندوق سمندر کے پانی سے بھر لیا جائے اور پھر وہ پانی بھاپ بنا کر اُڑا دیا جائے تو اس صندوق میں نمک کی دو انچ گہری تہ بیٹھی ہوئی نظر آئیگی۔ اگر دُنیا بھر کے سمندروں کی گہرائی کا اوسط تین میل فرض کیا جائے اور پھر کسی طرح سے اس پانی کو تبخیر کے ذریعہ سے اُڑا دیا جائے تو سمندر کے نیچے ہر جگہ دو سو تیس فٹ گہری نمک کی تہ جمی ہوئی نظر آئیگی۔

سمندر کی موجیں بہت فریب دیتی ہیں۔ طوفان میں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تمام کا تمام پانی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو رہا ہے حالانکہ پانی ایک ہی مقام پر رہتا ہے اور صرف حرکت ہی ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ بعض دفعہ طوفان میں سمندر کی لہروں کی بلندی چالیس فٹ تک پہنچ جاتی ہے اور انکی رفتار ۵۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے حالانکہ تیز سے تیز جہاز کی رفتار عام طور پر ۳۵ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ عام طور پر موج کی تہ کا پھیلاؤ اس کی بلندی سے پندرہ گنا زیادہ ہوتا ہے مثلاً ایک عام موج جس کی بلندی ۲۵ فٹ کے قریب ہو اس کی تہ تین سو پچھتر فٹ پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔

چین کا تندرست شہنشاہ - عام طور پر لوگ ڈاکٹر کو بیماری کی حالت میں فیس ادا کرتے ہیں۔ لیکن چین کے ایک شہنشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ صرف صحت کی حالت میں ڈاکٹروں کو تنخواہ دیا کرتا تھا اور جب وہ بیمار ہوتا اسی وقت ڈاکٹروں کا وظیفہ شہنشاہ کے صحتیاب ہونے کے وقت تک کیلئے بند کر دیا جاتا۔ اپنی تنخواہوں کے حصول کے خیال سے یہ شاہی طبیب اس کے معالجہ میں حیرت انگیز سرگرمی کا اظہار کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ چین کے اس شہنشاہ کی صحت دنیا بھر کے انسانوں سے اچھی تھی اور اس کے ڈاکٹروں کی ایک دن کی تنخواہ بھی کبھی ضبط نہ ہوئی۔

انسان کے قد اور وزن کا تناسب

پانچ فٹ ایک انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۲۰ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ دو انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۲۶ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ تین انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۳۳ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ چار انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۳۶ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ پانچ انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۴۲ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ چھ انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۴۵ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ سات انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۴۸ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ آٹھ انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۵۵ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ نو انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۶۲ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ دس انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۶۹ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
پانچ فٹ گیارہ انچ لمبے آدمی کا وزن ۱۷۴ پاؤنڈ ہونا چاہیئے
چھ فٹ لمبے آدمی کا وزن ۱۷۸ پاؤنڈ ہونا چاہیئے

الفاظ کا ذخیرہ۔ شکسپیئر نے جس کے نام کے ساتھ شاید "علمیت" سے زیادہ حیرت وابستہ ہے ... ۱۵ مختلف الفاظ اپنی تصنیفات وغیرہ میں استعمال کئے ہیں۔ ملٹن کے پاس آٹھ ہزار الفاظ کا ذخیرہ تھا اوسط درجہ کے تعلیمیافتہ آدمی کا ذخیرۂ الفاظ آٹھ ہزار سے بہت کم ہوتا ہے اور ایک اوسط درجہ کا غیر تعلیمیافتہ شخص تین یا چار ہزار الفاظ کے ذخیرہ سے اپنا کام چلالیتا ہے ایک ایسا شخص جس میں غور و تفکر کا مادّہ بالکل کم ہو اسکے لئے تقریباً ایک ہزار الفاظ کافی ہوتے ہیں ٭

تیرہ غلطیاں۔ (۱)۔ عیب و صواب کا ایک خود ساختہ معیار قائم کر کے لوگوں کو اسکے مطابق جانچنا ٭

(۲)۔ اپنی مسرت سے لوگوں کی خوشی کا اندازہ کرنا ٭

(۳)۔ دوسرے لوگوں سے ہمخیالی کی امید رکھنا ٭

(۴)۔ جوانی سے تجربہ کاری اور مآل اندیشی کی توقع رکھنا ٭

(۵)۔ مختلف طبیعتوں میں یکسانی پیدا کرنے کی کوشش کرنا ٭

(۶)۔ بے نتیجہ اور فضول خواہشات سے مغلوب ہونا ٭

(۷)۔ اپنے اعمال کو بے عیب و بے نقص دیکھنے کی کوشش کرنا ٭

(۸)۔ اپنے آپ کو اور دوسروں کو کسی ایسی بات کے لئے جس کا علاج ناممکن ہو کشمکش میں ڈالنا ٭

(۹)۔ جن لوگوں کی تکلیفات کا کم کرنا ہمارے مقدور میں ہے اُن کی مدد سے احتراز کرنا ٭

(۱۰)۔ انسانی کمزوریوں کو ملحوظ رکھے بغیر دوسروں کے متعلق فیصلہ قائم کرنا ٭

(۱۱)۔ ہر اُس کام کو جس پر ہم خود قادر نہ ہوں، ناممکن سمجھنا۔

(۱۲)۔ صرف انہیں باتوں کو جو ہمارے محدود دماغ میں سما سکیں قابلِ یقین تصور کرنا۔

(۱۳)۔ ہر بات کو سمجھنے کے قابل بننے کی خواہش کرنا۔

پھیپھڑوں کی ورزش پھیپھڑوں پر صحت کا بہت کچھ انحصار ہے جن لوگوں کے پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں اور صحیح طور پر اپنا کام کرتے ہیں انکی عمریں بالعموم لمبی ہوتی ہیں ہر شخص کیلئے پھیپھڑوں کی نگہداشت نہایت ضروری ہے۔ دوسرے اعضا کی طرح پھیپھڑے بھی ورزش سے مضبوط ہوتے ہیں اور ان کی ورزش عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے یہ ورزش روز صبح اور شام اگر صرف پانچ منٹ کے لئے بھی کی جائے تو صحت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس ورزش کا طریقہ یہ ہے:۔

تلووں کے سہارے کھڑے ہو کر سر پیچھے کی طرف جھکالو، اور ایک گہری سانس لو، اس طرح کہ پہلے تو پھیپھڑوں کے نچلے حصہ میں ہوا بھرے اور اسکے بعد آہستہ آہستہ اوپر کے حصہ میں۔ پھر آہستہ آہستہ سانس کو خارج کرو حتیٰ کہ ہوا خارج ہو جائے۔

اگر یہ عمل باقاعدگی سے جاری رکھا جائے تو زکام اور نزلہ وغیرہ سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

(ریویو)

دی "پیپل" لاہور

گزشتہ سال یہ گراں پایہ انگریزی ہفتہ وار اخبار لالہ لاجپت رائے صاحب نے جاری کیا تھا اس اخبار کے اقتصادی اور سیاسی مقالے نہایت قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ پیپل نے ہندوستان کی انگریزی صحافت میں ایک نئے دَور کی بنیاد رکھی ہے اور ملک اس اخبار کی جتنی بھی قدر کرے کم ہے ۴ر جولائی ۱۹۲۶ء کو پیپل کی پہلی سالگرہ کا پرچہ شائع ہُوا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ پیپل کی مفید اور شاندار کوششیں اپنے زندگی کے دوسرے سال میں اَور بھی زیادہ ترقی پر پہنچ جائیں۔ ہم نہایت مسرت کے ساتھ لالہ لاجپت رائے صاحب کو انکی اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں۔

خوابِ کامرانی

یہ عظیم الشان تصویر اُس شہرۂ آفاق فرانسیسی مصوّر کا شاہکار ہے جسکے خداداد جوہر نے اُسے فرانسیسی فوجوں کا مؤرخ بنادیا۔ اگر ہم اس تصویر کو فلسفے، تاریخ اور شاعری کا ایک مرقع کہیں تو بجا ہے کوئی نظم کوئی نثر کوئی تقریر ایک سپاہی کی آرزوؤں اور امیدوں، اسکی فرض شناسیوں اور قربانیوں کا وہ نقشہ نہیں کھینچ سکتی، جو یہ تصویر اک نگاہ میں انسان کی آنکھ کے سامنے پیش کردیتی ہے۔ اس تصویر نے فرانسیسیوں کے دلوں میں حب وطن کا ایک ہمہ گیر ولولہ پیدا کردیا اور وہ افسردہ خیالات جو ۱۸۷۰ء کے منحوس معرکوں نے پیدا کردئے تھے۔ حب وطن کے اس بے پایاں سیلاب میں بہ گئے۔

(مدیر)

دن بھر رہا یہ حال کہ میدانِ جنگ میں ۔۔۔ ہر سمت حشر آتش و خوں تھا شرارہ بار
کس کو تھا یہ خیال کہ میدانِ جنگ میں ۔۔۔ کام آئے گی نہ آج مری جانِ مستعار



تقدیر کرچکی تھی یہ سازش عدو کے ساتھ ۔۔۔ ہم سے کشیدہ آج رہے گی تمام دن
کھیلے گی خوب آج ہمارے لہو کے ساتھ ۔۔۔ لیکن بجھے گی پیاس نہ اُس کی تمام دن



سارا دن آفتاب یہ ہنگامہ دیکھ کر ۔۔۔ آخر افق کے پردہ میں جاکر نہاں ہُوا
دن نے بھی تنگ آکے سپر ڈالدی اُدھر ۔۔۔ اور اک جہاں پہ لشکرِ شب حکمراں ہُوا



تھک تھک کے لڑنے والے بھی جی ہارنے لگے ۔۔۔ آخر ہر ایک بات کی اک انتہا بھی ہے
ناچار پھر بھی رن میں برابر ڈٹے رہے ۔۔۔ راہِ وفا میں شیوۂ صبر و رضا بھی ہے



چشمِ عدو بھی خواب سے مغلوب ہوگئی ۔۔۔ آغوشِ خوابِ عیش میں وہ بھی چلا گیا
ظالم کی آنکھ ظلم سے محجوب ہوگئی ۔۔۔ میداں میں کیفِ خواب سے نشہ سا چھا گیا

ازبس کہ تھا شکست کا دھڑکا لگا ہُوا
ہر دل ہجوم یاس سے بشکستہ حال تھا
باقی نشان تک نہ رہا تھا امید کا
مشکل ہے اب ہو فتح، یہ سب کا خیال تھا

لیکن کسی کا نیند کے آگے نہ بس چلا
سب سو گئے کہ نیند کا ٹلنا محال ہے
شب کٹ چکی تو نورِ سحر جلوہ گر ہُوا
وہ نُور جس سے شب کو پیامِ زوال ہے

دیکھا یہ خواب ایک سپاہی نے اُس گھڑی
اک فوج بڑھ رہی ہے سنہرے غبار میں
یہ فوج اُسکے اپنے ہی آبا کی فوج تھی
رہتے تھے کامیاب جو ہر کارزار میں

خون اُس کا گرم جوشِ حمیّت سے ہو گیا
ہر چند شور بخت تھا برگشتہ حال تھا
ہم بھی وہی ہیں جن کے اب و جد کا حوصلہ
دشمن کے واسطے سببِ انفعال تھا"

اُٹھا وہ دل میں عزم کا طوفان سمیٹ کر
اَور اُٹھ کے ساری فوج کو ہمت کی دی صلا
زندہ ہوئے دل اُس نے اُٹھائی جدھر نظر
ہر دل کو اس نے جوشِ حمیّت کی دی صلا

اُٹھے اور اُٹھ کے ٹوٹ پڑے وہ حریف پر
اس ڈھنگ سے کہ جنگ کا نقشہ بدل گیا
دشمن کی فوج ہو گئی اک پل میں منتشر
اَور غل ہُوا کہ معرکہ آخر یہ سر ہُوا

اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر

اسلام کے سیاسی اثرات یورپ پر

عربوں کا ہسپانیہ میں داخل ہونا اور ایک باقاعدہ حکومت کا قائم کرلینا بذاتِ خود ایک انقلابِ عظیم تھا۔ شخصی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور ہر شہر کو بیش بہا آزادی کے حقوق دیئے گئے تمام عہدے ہر کہ ومہ کے لئے خواہ وہ کسی مذہب کا کیوں نہ ہو ممکن الحصول سمجھے گئے۔ غلاموں کو آزادی اور یہودیوں کو برابری کا رتبہ ملا۔ دوزی کہتا ہے کہ ملک میں ایک عجیب وغریب انقلاب آگیا یہاں تک کہ "شروع میں تو پادری بھی مطمئن تھے"۔ وضعِ قوانین کے لئے ایک دیوان یا قانونی مجلس قائم کی گئی اور قانون مسلمان عیسائی یہودی دہریئے سب کو ایک نظر سے دیکھنے لگا۔

اُموی خلفا کے زمانے میں اور اُنکے بعد بھی ہسپانیہ کی حکومت متعدد شعبوں میں تقسیم کی گئی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یورپین قوموں نے تقسیم حکومت کے بعض اصول اُن سے اخذ کئے۔ بلکہ سید امیر علی (مصنف عربوں کی مختصر تاریخ) کا خیال ہے کہ یہ تقسیم بعض حیثیتوں میں آج کل کی حکومتوں کی ترتیب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔

مرکزی حکومت صوبوں اور شہروں کی حکومت کی جزئیات میں دخل نہ دیتی تھی اور محض خراج کے مناسب طور پر جمع کرلینے پر اکتفا کرتی تھی۔ شہر بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبے آپ اپنی حکومت کے امانت دار تھے اور بڑے شہروں میں تو مجالس شوریٰ بھی ہوتی تھیں۔ فوج میں کام کرنا عربوں اور بربریوں کے لئے ضروری تھا اور خوف وخطر کے اوقات میں جبریہ بھرتی سے بھی کام لیا جاتا تھا۔

صلیبی لڑائیوں کے اثرات۔ اس ضمن میں یہ بیان کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے بعض سیاسی اثرات یورپ پر اُنکے بے جانے بوجھے ہوئے۔ مثلاً صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے فرانس اور اطالیہ میں جاگیرداروں کی حکومت متزلزل ہوگئی۔ صلیبی سرداروں کو شہروں

کی آزادی اور حقوقِ مالکانہ کو شہریوں کے ہاتھ فروخت کرنا پڑا۔ ایک مشہور مورخ کہتا ہے کہ اسی طرح خود مختار حکومتوں کا خاتمہ اور مجالسِ بلدیہ کی حکومتوں کا آغاز ہُوا۔ بادشاہ کی قوت فرانس میں روز بروز بڑھتی گئی اور جاگیرداروں کا نام ہی نام رہ گیا۔ جرمنی اور انگلینڈ کے لوگوں نے ان لڑائیوں میں زیادہ حصہ نہ لیا تھا بلکہ وہاں کے بادشاہوں اور شہزادوں نے اس میں دلچسپی لی تھی اس لئے وہاں نتیجہ اس کے برعکس ہُوا۔ امرا نے موقع پاکر شاہی قوت کو اور بھی محدود کر دیا۔ انگلستان کی مستحکم طرزِ حکومت کے آغاز کا ایک بڑا سبب یہ لڑائیاں بھی تھیں۔

اسلام کے معاشرتی و اخلاقی اثرات یورپ پر

عربوں کا ہسپانیہ میں داخل ہونا ایک بڑا بھاری معاشرتی انقلاب بھی تھا۔ غلاموں کو آزاد کیا گیا اور طبقاتِ اسفل بلکہ طبقۂ متوسط کو اپنے گوناگوں فرائض سے رہائی ملی۔ ملک میں صنعت وحرفت اور تجارت کے پھیل جانے سے سب جماعتوں کو فائدہ پہنچا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ اپنی اپنی قدرتی حیثیتوں پر قائم ہوگئیں اور انہیں اپنی ہستی اور اپنے حقوق کا مناسب طور پر احساس ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ قرطبہ میں مزدوروں اور صناعوں کی جماعت کے مسلک میں وہی خود مختاری پائی جانے لگی جو آج کل یورپ میں دیکھنے میں آتی ہے۔

طبقۂ اناث کی آزادی۔ آج کل اکثر غیر مذہب والے اسلام پر یہ الزام دھرتے ہیں کہ اُس نے عورتوں کے حقوق کی مطلق نگہداشت نہیں کی۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگرچہ اسلام نے کہیں ایسی کوتاہ بینی سے کام نہیں لیا بلکہ وہ طبقۂ اناث کی بہبود کا اور مذاہب کے مقابل میں بہت بڑا جانبدار رہا ہے لیکن حال کے مسلمانوں نے جو اپنے آپ کو اپنے باپ دادا کے مذہب کا پیرو سمجھے ہوئے ہیں صنفِ نازک کو صنفِ ناقص العقل بنانے میں ذرا کوتاہی بھی نہیں کی۔ انہیں نصِ قرآنی کے خلاف چاردیواری میں بند رکھنے انہیں نصِ قرآنی کے خلاف جاہل قرار دینے میں وہ مطلق نہیں ہچکچائے۔ کیا خوب ہو اگر وہ بجائے اپنے مذہب کے اپنے حالات اور اپنی مرزبوم کو اُس غیر متناہی معاشرتی سکون کا موجب قرار دیں جس کے محدود دائرہ کو انکی بے توجہی

اپنی مصروفیت کی دُنیا سمجھ رہی ہے۔ ہم انہیں لوگوں کے جانشین ہیں جو اپنے عروج کے زمانہ میں بازاروں اور کوچوں باغوں اور انجمنوں اور دار العلوموں میں اپنی قوم کی عورتوں سے بے تکلف ملتے جلتے تھے موزخین بیان کرتے ہیں کہ ہسپانیہ میں مُسلمانوں کی عورتیں نہایت بے باک اور ساتھ ہی نہایت باعصمت بھی تھیں۔ وہ بے دھڑک مردوں سے معاشرتی تعلقات رکھتیں اور اپنی شرکت سے اُن کی سوسائٹی کو اُن مذموم باتوں سے بچاتیں جو آجکل علانیہ ہمارے طبقۂ رجال میں کیجاتی ہیں۔ یہ معاشرتی نظام غرناطہ میں اپنے عروج پر پہنچا۔ عرب سپاہی رزمگاہوں میں اپنی بیوی یا معشوقہ کا نام اپنے قومی نشانوں پر لکھے ہوئے لڑنے کو جاتا تھا۔ کبھی اُسکے نام کا پہلا حرف کبھی ایک ستارہ اور جہاز کبھی ایک دل تیروں سے چھدا ہُوا۔ شریف سپاہی طبقۂ اناث کی موجودگی میں اپنے ہنر دکھاتے اور اُن سے خراجِ تحسین طلب کرتے۔ ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ مساجد میں جب عورتیں گنگا جمنی ملبوسات پہن کر آتی تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی خوبصورت چراگاہ میں بہار کے پھُول کھلے ہیں۔

بغداد اور قرطبہ اور غرناطہ کی وہ لائق خاتونیں جنکے گھروں میں اکثر علم و ادب کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں آجتک اسلامی تاریخ کے متبرک صفحات کی زیب و زینت ہیں۔ لیکن ان نقش و نگار پر محض ایک سرسری نگاہ ڈالنا غائت درجہ کا عقلی ظلم ہوگا!

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ وہی مسلمان جن کی قوم کا نصف حصّہ مدتوں سے اس قدر بیکار ہے کہ کھلی ہوا میں اُنکی عدم موجودگی پر غور کرکے خیال پیدا ہوتا ہے کہ شائد وہ مُردہ ہوچکا ہے انہیں مُسلمانوں نے دیارِ مغرب میں اُس معاشرت کی بنا ڈالی تھی جس پر اہل تمدن کو آج اس قدر ناز ہے؟ ـــــ "انہیں مسلمانوں نے" نہیں بلکہ وہ زمانہ اور تھا وہ لوگ اور تھے اور اُن کا مذہب بھی وہ اسلام تھا جس سے آج ہم محض بے بہرہ اور ناواقف ہیں ـــــ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں بلکہ یہ ایک عبرت کی جگہ اور افسوس کا مقام ہے۔

بہادرانہ برتاؤ۔ دی آردو (VIARDOT) اور رینو (REINAUD) کہتے ہیں کہ وہ جسے یورپ میں (CHIVALRY) یعنی بہادرانہ برتاؤ کہا جاتا ہے اور جسے آج یورپ نے اپنی ایجاد اور فقط اپنی میراث سمجھ رکھا ہے پہلے پہل قرطبہ کے مُسلمانوں میں نمودار ہُوا۔

بہادرانہ برتاؤ کے سارے نظامات یہیں سے شروع ہوئے اور پھر غرناطہ کے شہر میں تکمیل کو پہنچے
سپاہ گری (KNIGHTHOOD) کا قانون جس کے مطابق کوئی شخص بہادر نہ سمجھا جاتا تھا جبتک
اُس میں دس خصلتیں نہ ہوں یورپ نے سپین ہی سے لیا وہ دس خصائل یہ تھیں:۔ نیکی، شجاعت
خوش اخلاقی، شاعری، فصاحت، طاقتِ جسمانی، شہسواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور تیراندازی ۔
مُسلمانانِ شام و اندلس کی زندگی بہت پاک اور تمدن کی حیثیت سے بہت بلند پایہ کی
تھی، اُنکی مجالس میں شراب کا استعمال مطلق نہ تھا اور اسی لئے وہ صدیوں عیش و عشرت کی تحریصوں
سے بچے رہے، علمِ حفظِ صحت تو گویا اُنکی گھٹی میں موجود تھا۔ علاوہ شراب سے اجتناب کرنے کے
غسل اور وضو کی عادات نے گویا اُنکے نزدیک صفائی اور عبادت کو ہم پلّہ قرار دیدیا تھا ۔
ہر شخص کو ترقی کا موقع ملتا تھا اور وہ اپنی استعداد کے موافق ملک و قوم کے تمدن کا حِصّہ دار
بن جاتا تھا۔ عربوں کے اخلاق میں نرمی انکسار صاف گوئی راستبازی اور رواداری کے وصف خصوصیت
سے قابلِ ذکر ہیں۔ اُنکے دُشمنوں نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے وہ اپنے زمانے
میں اپنے معاصرین کے اُستاد تھے ۔

صلیبی لڑائیوں کا اثر۔ مُسلمانوں کا معاشرتی اور اخلاقی اثر یورپ پر صلیبی لڑائیوں کی وجہ
سے بھی ہُوا۔ یورپ میں صلیبیوں کو بتایا جاتا تھا کہ تم جاہلوں اور وحشیوں کے ہاتھوں سے عیسیٰ
ابن اللہ کے مقدس مقامات کو چھڑانے کے لئے جاتے ہو۔ وہ وہاں جاکر دیکھتے کہ بجائے
جہالت و وحشت کے یہ لوگ تہذیب و تمدن کے نام لیوا ہیں اور دُنیاوی ترقی کو اپنے دینی ارکان کا
ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں، صلاح الدین کی نرمی اور حلم کا اثر بھی ضرور ہُوا۔ اور آہستہ آہستہ اہلِ یورپ
کی مصنوعی نفرت عزت و توقیر سے بدل گئی ۔ عیسائی سرداروں نے اپنے لباس اور گھر بھر کو
مشرقی طریقے کے مطابق سنوارا اور مُسلمانوں سے اچھی عادتیں اور نیک خصلتیں سیکھیں۔
کاریگروں اور صناعوں نے اُنکے فنون سے صنعت و حرفت میں مدد لی اور جو باتیں ارضِ مقدس
میں سیکھیں یورپ میں جاکر اُن پر عمل کیا صلیبیوں نے شام میں یہ اہم اور نتیجہ خیز سبق سیکھا۔ کہ
یونہی سُنے سُنائے کسی شخص یا کسی بات کے متعلق اپنی رائے قائم کرلینا پرلے درجے کی حماقت
اور سفلہ پن ہے۔ انسان کو ہر وقت اپنے مشاہدے اور تجربے سے کام لینا چاہیئے نہ کہ دوسروں

کی بتائی ہوئی ہدایتوں سے۔

عربوں کا خون یورپ میں۔ اس عنوان کے تحت میں یہ بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ مسلمانوں کا خون سپین کے بہت سے باشندوں کی رگوں میں تو موجود ہے ہی لیکن فرانس میں بھی اس حیثیت سے اُنہوں نے اپنا اثر چھوڑا۔ کروز CRUEZE کے صوبہ میں آلپ بالا HAUTAL P میں اور علی الخصوص ان مقامات میں جو حوالی مُوں مور MONT MOOR یعنی جبل المسلمین میں واقع ہوئے ہیں بین کے صوبہ میں اور بعض مقامات لاندو، رُوزیاں، لانگے داب LANGUEDOC دبرن میں عربوں کی اولاد بآسانی پہچانی جاتی ہے۔ اُن کا گندمی رنگ سیاہ آبنوسی بال خمدار ناک بیٹھی ہوئی چمکدار آنکھیں دوسرے باشندگان ملک سے بالکل الگ معلوم ہوتی ہیں۔ عورتوں کا سانولا رنگ سیاہ آبنوسی بال لمبا قد بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بھری ہوئی ابرو وغیرہ اُن کا عربی النسل ہونا ثابت کرتی ہیں

اسلام کے مذہبی اثرات یورپ پر

اب ہم اُن اسلامی اثرات کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں جن کی وجہ سے یورپ کے مذہب میں نئی نئی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اگرچہ بظاہر اسلام نے یورپ میں زیادہ ترقی نہیں کی یعنی سوائے ترکی اور رُوس کے یا اُن ممالک کے جہاں کسی زمانے میں ترکی کی حکومت تھی یورپ کے کسی مُلک میں اس وقت مُسلمانوں کی جماعت موجود نہیں ہے لیکن اس کا بڑا سبب وہ خوں ریزا در وحشیانہ سلوک ہے جو ہسپانیوں نے مُسلمانوں سے اُنکی سلطنت کے برباد ہوجانے کے بعد کیا۔

تاہم وہ یورپی مورخین جو انصاف کو دل میں جگہ دے کر یورپ کی مذہبی تاریخ پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں ہمیں بتاتے ہیں کہ دماغی ترقی کے بعد اسلام نے یورپ کی مذہبی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔

اغلب ہے کہ اگر مُسلمان یورپ کے کسی حصّے کو فتح نہ کرتے تو اہلِ یورپ ابھی تک اُسی بُت پرستی کی حالت میں رہتے جس میں وہ برابر پندرہ سو برس تک غرق رہے۔

اسلام کی عقل پسندی۔ خود مُسلمانوں کا اپنا مذہب اس قدر عقل پسند واقع ہُوا تھا کہ انہوں نے ابتدا سے اُسکو عقل و ادراک پر مبنی سمجھا اور ساتھ ہی دوسروں کو اپنے اپنے مذہب میں عقل و

ادراک ہی کی کسوٹی کو استعمال کرنا سکھایا ۔

رواداری ۔ ایک زمانے میں اسلام کی یہ مذہبی رواداری اس درجہ تک بڑھ گئی تھی کہ عوام الناس خلیفۂ وقت پر علانیہ کفر کا فتوے لگاتے تھے ۔ مامون الرشید کی بلند نظری عام لوگوں کی نگاہوں میں ایک گناہِ کبیرہ سے کم نہ تھی اُسکی علمی مجالس میں ہر مذہب اور ہر فرقہ کے پیرؤوں کو اظہارِ خیالات کی عام اجازت تھی ۔

اسی طرح ہسپانیہ میں بھی جہاں یورپ کے دوسرے مُلکوں کی طرح اختلاف رائے کو کفر سمجھ کر صدائے ضمیر کے دلدادوں کو سزائے موت دی جاتی تھی مُسلمانوں نے پہلے پہل مذہبی رواداری کی بنا ڈالی ۔ انہوں نے اہلِ ذمہ کی حفاظت کے لئے ایک خاص دیوان قائم کیا اور انہیں اختیار دیا کہ وہ آپ اپنے قاضی مقرر کر لیں ۔ جو اُنکے اپنے قوانین کے مطابق اُن میں عدل و انصاف کریں ۔ شاہنشاہانِ جرمنی من فرڈ اور فریڈرک ثانی نے اُن سے یہ رواداری سیکھ کر اپنی اقلیم میں اُسے رواج دینا چاہا ۔ مگر یورپ کی جہالت اُنکی عاقلانہ دُور اندیشی پر ایک خوفناک آندھی بن کر چھا گئی اور پیشتر اسکے کہ وہ اسلامی آزاد منشی کی دیارِ مغرب کے رہنے والوں میں عام اشاعت کریں اُنکے مُنہ خاک سے بھر دیئے گئے ۔ اسلام کا مسلک رواداری کی صورت میں تو اہلِ یورپ کو مقبول نہ ہُوا لیکن اس نے نئی نئی شکلیں اختیار کر کے نئے نئے طریقوں سے یورپ پر یورشیں کیں جو بتدریج کامیابی اور نیکنامی کو پہنچیں اور جس کا مقابلہ پاپائیت اور ساری مسیحیت کے پادری بھی بالآخر نہ کر سکے ۔

یُورپ کی بُت پرستی ۔ یونان و روما کے ممالک میں پُرانی بت پرستی کے تصوّرات لوگوں کے دلوں سے کبھی محو نہ ہوئے تھے[1] ۔ عیسائیت ایک ہزار برس میں اُنکے احساسات و اعتقادات راسخہ کو نہ مٹا سکی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روحانی حیثیت سے وہ جہاں تھے اب بھی وہیں ہیں ۔ ایسے مذہب سے جسے عصمتِ تخیل اور فوقیتِ کامل کا دعوے تھا توقع کیجا سکتی تھی کہ وہ یورپ کے زمانۂ جہالت میں اُسے یوں قعرِ مذلت میں گرنے سے بچا لیگا ۔ مگر عیسائیت بجائے اس اہم فرض کے سرانجام دینے کے خود کفر و جہل میں پھنس گئی اور ایک مذہبِ باطل کی طرح

---

[1] ڈریپر جلد ۱ ۔ صفحہ ۳۶۴

اپنے پیرؤوں کو اندھا دھند جادۂ انحطاط پر لے گئی ◆

افریقی و شامی فتوحات کا اثر۔ اسلام کی افریقی اور شامی فتوحات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو چکی تھی کہ عیسائیوں کے وہ بُت جنہیں اُنکی توہم مزاجی نے اپنے شہروں کی محافظت کا اہم کام سپرد کیا تھا اپنے اس فرض کی تکمیل میں محض ناکارہ اور بودے نکلے۔ وہ شہر فتح ہو گئے۔ اور وہ بُت ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اسلام کے ایک خدا کے آگے مسیحیت کے کروڑوں دیوتا اس طرح بھاگ نکلے جیسے آندھی کے آگے کوّے! اس کا اثر یورپ پر پڑا اور ایسا پڑا کہ بُت پرست بھی اپنی اس شکست کو کبھی نہ بھولے اور ہمیشہ اس امر میں کوشاں رہے کہ کسی طرح ہماری اس شکست کا خیال دُنیا والوں کے دل سے مٹ جائے اور عیسائیوں کے بت پرستانہ خیالات کو پھر فروغ حاصل ہو!

بُت پرستی اور مشرقی شاہنشاہ۔ لیوؔ اسورئین (LEO THE ISAURIAN) شہنشاہ قسطنطنیہ نے ۷۲۶ء میں بُت پرستی کے خلاف ایک حکمنامہ جاری کیا۔ پادریوں نے شور مچایا۔ اور ہر جگہ لوگوں کو اُسکی حکومت کے خلاف برانگیختہ کیا۔ مائیکل توتلے MICHAEL THE STAMMERER کے بیٹے نے مُسلمانوں کی معاشرت اور اُنکے مذہبی خیالات سے متاثر ہو کر اپنا محل عربی خلفاء کی طرز پر بنایا اور شاعر بن کر بُت پرستی کی ہجو کی اور وہ اسکے انسداد کی تدابیر بھی عمل میں لایا —— غرض قسطنطنیہ کے شاہنشاہوں نے ایک سو بیس برس تک بُت پرستی کے خلاف جنگ کی اُنہیں کافر اور مُسلمان کا لقب دیا گیا۔ پادریوں نے رعایا کے بہکانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور بالآخر قسطنطنیہ کی سلطنت میں پھر اُسی طرح بُت پرستی کا دَور دورہ ہو گیا!

پاپائے روما اِن مذہبی تغیرات سے بہت متاثر ہُوا اور ڈرا کہ مبادا اطالیہ بھی ایسے لا مذہبی کے خیالات سے پائمال ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے ایک ایسی حکومت سے اتحاد پیدا کر لیا جو اُن مُسلمانوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ برسرِ پیکار ہو چکی تھی جنہوں نے اِن ہولناک خیالات کی تلقین سے مسیحیت کی رُوح کو خطرے میں ڈال دیا تھا[1]

اسلامی فتوحات کے نتائج۔ افریقہ اور ایشیا میں مُسلمانوں کی فتوحات کا یہ اثر ہُوا کہ عیسائیت دو صورتوں میں منقسم ہو گئی ایک لاطینی دوسری یونانی۔ اسکے علاوہ ان فتوحات کے تین مہتم بالشان

---

[1] ڈریپر جلد اول صفحہ ۴۱۳

سیاسی نتیجے ہوئے۔ اوّل پاپائے روما کا شاہنشاہِ قسطنطنیہ کے اثر سے آزاد ہو جانا۔ دوم۔ فرانس میں ایک نئے شاہی خاندان کا قائم ہو جانا۔ سوم یورپ کے وسط اور مغرب میں ایک مقدس سلطنتِ روما HOLY ROMAN EMPIRE کا دوبارہ رُونما ہونا ——— یہ سب واقعات اُس خطرناک بحث کا نتیجہ تھے جو بُت پرستی کے متعلق یورپ میں مُسلمانوں کی وجہ سے شروع ہوئی

تحریکِ بُت شکنی کے اسباب۔ اس سے ظاہر ہے کہ بت شکنی کی تحریک کے تین بڑے اسباب تھے[1] اول مُسلمانوں کے طعن و تشنیع اور مضحکہ آمیز کنایات دوسرے لیوا سورئین کی آزاد منشی جو اُس نے مُسلمانوں اور یہودیوں سے سیکھی تھی۔ تیسرے افریقہ اور ایشیا میں مُسلمان حملہ آوروں کے خلاف عیسائی بتوں اور مورتوں کی بے بسی۔ اس سے پہلے خلیفہ یزید نے شام کے تمام بتوں کو توڑنے کا حکم صادر کیا تھا اس سے وہاں کے عیسائیوں کو پہلے رنج پھر مایوسی اور بعد میں شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہوئے۔

پوپ کی کوششیں اسکے خلاف۔ لیکن عیسائیت کو ان مٹی کی مورتوں سے اس قدر جلد رہائی نصیب نہ ہو سکتی تھی اُنکے دلدادوں نے چاردانگ یورپ میں ایسا بے طرح شور مچایا کہ حق کی آواز بہت جلد خاموش ہوتی معلوم ہوئی۔ پوپ جو اُس وقت تک شاہنشاہانِ قسطنطنیہ کا فرمانبردار تھا یہ عمدہ موقع پاکر خود مختار ہو گیا اور عوام الناس کی توہم پرستی اور مسیحیت کی متفقہ آواز نے اُسے وہ طاقت عطا کی جو اُسے اس سے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ رہبانیت MONASTICISM اور پاپائیت PAPACY کے اتحاد نے آزاد خیالی اور بیباکی کے جرگے کو مذہب کے میدان میں فاش شکست دی اور ازسرِنو یورپ کے پاؤں میں اعتقادو اوہام کی بیڑیاں پہنا دیں۔ غرض انہیں بتوں نے جنہیں عربوں اور اُن عیسائیوں نے جو عربوں کی عملی منطق کے قائل ہو چکے تھے بے جان اور بے حس سمجھ رکھا تھا پاپائے روما کو اُس کی سخت ترین شکل کے وقت اُبھارا جس میں وہ جنوب کے اس رُوحانی حملے کے باعث مبتلا ہو گیا تھا۔

لیکن یہ روحانی حملہ ایسی بیباکی بلکہ گستاخی سے کیا گیا تھا کہ اُس کا محض باتوں سے ٹال دینا ناممکن ہو چکا تھا اور عیسائیت کچھ عرصے کے لئے اُسکے طفیل ایک جانگزا امتحان میں گرفتار ہو گئی!

---

[1] صفحہ ۲۱۵

مذہب روما پر تین حملے ۔ اس سخت وقت میں مذہب روما پر تین حملے ہو رہے تھے ایک تو وہ ادبی حملہ جو مغرب کی طرف سے مسلمانانِ ہسپانیہ کر رہے تھے اور اس کے علاوہ وہ اخلاقی حملے جو مشرق کی طرف سے مسلمانانِ شام اور شمال کی طرف سے جرمن قومیں کر رہی تھیں!

پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ اس نازک ساعت میں ایک ایسا شخص پاپائیت کی کرسی پر جلوہ افروز ہو گیا جس نے شاہنشاہ اوٹو سوم OTTO III کے ساتھ مل کر اسلامی خیالات کے مطابق کلیسا کی اصلاح کرنی چاہی ۔ یہ بھی خدا کی ایک عجیب قدرت تھی کہ بالآخر اسلام کا اثر حضرتِ پوپ کے گھر میں گھس آیا اور پاپائیت اسلام کو استحسان کی نظروں سے دیکھنے لگی ۔

پوپ جربرٹ ۔ اس فرانسیسی پوپ جربرٹ GERBERT کے اوائل عمر کے دن بھی انہیں حقیر مسلمانوں کے ہاں گذرے تھے جو پاپائیت کے گویا جانی دشمن تھے ۔ اس نے قرطبہ کے دارالعلوم میں تعلیم پائی تھی اور وہ اہلِ زبان کی طرح عربی بول سکتا تھا۔ فرانس میں واپس آ کر اس نے بمقام ریں RHEINS ایک مدرسہ کھولا جس میں وہ عجیب عجیب چیزیں پڑھانے لگا۔ منطق علم ہیئت فن موسیقی وغیرہ کی نسبت لوگ سمجھتے تھے کہ یہ وہ شیطانی علوم ہیں جن کی تحصیل انہیں سرکش کافروں سے حاصل ہو سکتی تھی ۔ جو پیرنیز کے اُس پار رہتے تھے ۔ جربرٹ نے ایک کرۂ ارضی کے ذریعہ سے جغرافیہ سکھانا شروع کیا وہ ستاروں کو لمبی لمبی نالیوں کے ذریعے سے دیکھتا تھا۔ اُس نے ایک گھڑی ایجاد کی اور ایک ارغنوں بھی بنایا جو بھاپ سے بجتا تھا ۔ یورپ میں ہر شخص اُسکی مدح میں رطب اللسان تھا لیکن عوام کے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ وہ ہر رات شیطان سے درس لیا کرتا ہے ۔ اورلیاں ORLEANS کے پادری نے ریں RHEINS کی مذہبی مجلس میں جو تقریر کی وہ جربرٹ ہی کی لکھی ہوئی تھی ۔ اُس سے اُسکی اسلامی روشن خیال آئینہ ہوتی ہے ۔ رشوت ستانی کے علاوہ پاپائی گناہوں کی اُس نے ایک مکمل فہرست تیار کی اور شہرِ روما کی دقیانوسی دماغی اور اخلاقی حالت کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچا جو اُس زمانے میں ایک نہایت مشکل کام تھا ۔ بلکہ ایک مقام پر تو وہ اُس تحریک کی سی باتیں کرتا ہے جو اُس سے صدیوں بعد اصلاحِ کلیسا کے متعلق یورپ میں ہوئی اور پوپ کی بابت کہتا ہے کہ کیا وہ دجال نہیں ؟ وہ گنہگار نابکار وہ پرانے زمانے کا مجسم معما !!! اب اسکی تباہی کے دن قریب ہیں ۔ پھر کہتا ہے کہ پادریوں کو شادی

کرنے سے کیوں روکا جاتا ہے کیا وہ انسان نہیں کیا اُن میں انسانی جذبات نہیں ڈریپر کہتا ہے یہ بالکل مُسلمانوں کی سی عملی باتیں تھیں۔ کلیسا والوں نے اُس کو کفر کے جرم میں دھر پکڑا اور اُسکی سرکوبی کرنی چاہی لیکن یہ خوبیٔ تقدیر ہی تھی کہ جربرٹ تھوڑے عرصہ کے بعد انہیں اہل کلیسا کا سرگروہ بن کر انکے سر پر سوار ہو گیا اور اُسی نے اُنہیں اُس صراطِ مستقیم پر چلے آنے کا حکم دیدیا جسکی طرف اُسکے مُسلمان اُستادوں نے اُسکی رہنمائی کی تھی۔ یورپ کی تاریخ میں وہ ایک عجیب وقت تھا قریب تھا کہ تحریک اصلاح کلیسا REFORMATION صدیوں پہلے یورپ میں شروع ہو جائے اور یورپ اُس خونریزی اور جور و ظلم سے بچ جائے جو اُسے بعد میں سہنا پڑا۔

لیکن اہل یورپ کی راستبازی اور راست روی اس بات کی کب متحمل ہو سکتی تھی۔ کہ انہیں سیدھی راہ دکھائی جائے۔ نوجوان شاہنشاہ (۱۰۰۲ء) اور بڈھے پوپ دونوں کو زہر دے کر جنت خواہوں نے اپنا الو سیدھا کر لیا۔ سیدھی اُنگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ پاپائیت سے اصلاح کی امید رکھنا گویا جمادات سے حرکت کی توقع کرنا تھا۔

مذہبی مصلحین۔ ایریجینیا ERIGINA پیٹر ایبی لرڈ PETER ABBELARD اور پیٹر معزز PETER THE VENERABLE اور دیگر مذہبی مصلحین نے جنہوں نے مسلمانوں کے دار العلوموں میں تعلیم پائی تھی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اور عشائے ربانی TRANSSUBSTANT-IATION اور شکل زمین وغیرہ کے مسئلوں پر بحث کرنی شروع کی۔

مگر صلیبی لڑائیوں کے آغاز نے پاپائیت کو ایک نئی زندگی بخشی اور اب اُس کا اثر یورپ کے سب طبقوں میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان لڑائیوں نے یورپ پر کیا اثرات کئے اور کس طرح یورپ کی مذہبی اصلاح کا دروازہ ایک عرصہ تک بند رہا۔

فرڈریک ثانی۔ اُس وقت کے ایک حکمران فرڈریک ثانی (فرِدَریک) شاہنشاہِ جرمنی کی کہانی ہمارے لئے بہت دلچسپ ہے۔ وہ نہایت آسانی کے ساتھ عربی سمجھتا اور بولتا تھا مُسلمان اور یہودی طبیبوں اور فیلسوفوں نے اُسے کلیسا کے دعادی پر ہنسی اُڑانا سکھا دیا تھا۔ اُسکے دربار میں ابن رشد کے دو بیٹے تھے۔ اُس نے مُسلمانوں کے ساتھ اس قدر دوستی ظاہر کی

کہ سلطان نے اُسکی درخواست پر اُسے یورشلیم کا شہر دے دیا۔ اُس کے پاس تیس ہزار عرب سپاہی تھے اور اُس نے اطالیہ کے بعض مقدس حصوں میں اُنکی چھاؤنیاں قائم کردی تھیں+ اُس نے اپنے سیاسی نظامات کو درست کیا۔ ایک مجلسِ شوریٰ بنائی اور قانون کی عظمت کو یہ کہہ کر بالا کیا کہ کلیسا بھی قانون کے ماتحت ہے+ اس پر پوپ میں اور اُس میں لڑائی ٹھن گئی۔ اُسکے مُسلمان سپاہی اطالیہ میں چاروں طرف پھیل گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس مسیحیت فرڈرک کی جانبدار ہُوا چاہتی ہے لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہُوا+ ڈریپر کہتا ہے کہ تمدن عرب کے اثرات شہرِ لیاں LYONS کے غریب سے غریب آدمی سے لیکر جرمنی کے شاہنشاہ تک سب میں سرایت کر چکے تھے+ فرڈرک کو خاموش ہونا پڑا اور کلیسا نے بظاہر سارے یورپ کو اپنی جانب کر لیا لیکن وہ خیالات و احساسات جن کا انتشار ہسپانیہ اور شام کے عرب کر چکے تھے اور اس وقت بھی کر رہے تھے چُپکے چُپکے اپنا اثر کئے گئے ؛

پوپ اور کفر کی اشاعت۔ کفر بجائے مٹ جانے کے اور پھیلا اور جانبدارانِ کلیسا کے دلوں تک پہنچ گیا۔ نقرمنش راہبوں MENDICANT FRIARS میں زندقی خیالات کا چرچا ہونے لگا اور ٹمپلروں TEMPLARS کو شدید سزائیں دی گئیں+ پاپائے روما انوسنٹ سوم INNOCENT III نے سائنس کا مطالعہ جبراً بند کر دیا اور حکم دیدیا کہ ارسطو کی طبعی اور فلسفیانہ تصنیفات اور اُنکی شرحیں جو مُسلمانوں نے لکھی ہیں ہرگز اہلِ یورپ کی نظر نہ پڑیں+ اس حکم کے سو سال بعد پاپائیت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور ایک وہ وقت آیا کہ یورپ میں بجائے ایک کے تین پوپ تھے جو گویا مسئلہ تثلیث کا ایک مجسم ثبوت تھے۔ پاپائیت لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہوگئی اور تحریکِ اصلاحِ کلیسا نے آکر اُسے بالکل کمزور اور پسپا کر دیا+

اسلام اور تحریکِ اصلاحِ کلیسا۔ پاپائے روما کا یہ تدریجی انحطاط اور اُسکے عہدۂ عظمیٰ پر وہ شمالی حملہ جو پہلے جرمنی کی جانب سے ہُوا اور پھر رفتہ رفتہ اور اطرافِ یورپ سے بھی ہونے لگا اُسی ادبی اور اخلاقی تحریک کا نتیجہ تھا جو دُنیائے اسلام سے اُٹھ کر سارے یورپ میں پھیل گئی!

خوارقِ عادات پر اسلام کا اثر۔ خوارقِ عادات کا خبط جو اہلِ یورپ کے دلوں پر اک بلا کی طرح سوار تھا۔ عربوں اور اُن کے شاگرد یہودیوں ہی کے عملی سبقوں اور بالخصوص طبی تعلیم

کی وجہ سے کمزور ہوا۔ بھوت پریت کا ڈر اور اولیا کی کرامات پر یقین متزلزل ہونے لگا۔ تمام یورپ میں سنجیدہ اور متین لوگ جو ان باتوں سے متاثر ہو گئے تھے اس امر کا احساس کرنے لگے۔ کہ اگر عیسائیت زندہ رہ سکتی ہے تو محض ایک ایسے علم دینیات کی مدد سے رہ سکتی ہے جو جدید علوم و فنون کے انکشافات سے مستفید ہو کر اپنے پرانے لایعنی اعتقادات کو ترک کر دے ۔

زمین کی شکل و شباہت پر جو بحث چھڑی اُس میں کلیسا نے یہ پہلو اختیار کیا کہ زمین اجسامِ فلکی کا اعلیٰ ترین رُکن اور انسان کون و مکان میں اشرف المخلوقات کا رتبہ رکھتا ہے۔ عیسائیوں کو یقین تھا کہ اگر زمین کا کروی الشکل ہونا (جو مسلمانوں کا خیال تھا) ثابت ہو گیا تو مذہبی اعتقاد کی بنا متزلزل ہو جائیگی۔ اس بحث میں جس پر کلیسا نے اپنی ساری قوت صرف کر دی اُسے شکست ہوئی۔ اور میدان گویا عربوں ہی کے ہاتھ رہا ۔

فلسفۂ اسلام کا اثر۔ قرونِ وسطیٰ میں اسلام کے فلسفیانہ نظریات نے عیسائیت پر ایک بہت بڑا اثر ڈالا ۔

ابنِ رشد کے مسلّاتِ انفصال و انجذاب۔ ابنِ رشد کے مسلّاتِ انفصال و انجذاب EMANATION S ABSORPTION جو اول اول ارسطو نے مشرق سے اخذ کئے اور پھر اسکندریہ کے یونانی حکما سے مسلمانوں نے سیکھے یورپ کی فلسفیانہ اور مذہبی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ابنِ رشد نہ صرف ان مسلّوں کا جامع اور شارح تھا بلکہ اُس نے انکی ایک ایک شق پر اپنی جدت طرازیوں کی مہر چھوڑی ہے۔ اُسکی تصنیفات ایک طرف تو سپین سے گذر کر جنوبی فرانس سے شمالی اطالیہ میں پہنچیں اور دوسری طرف فریڈرک ثانی کے وقت میں جزیرہ صقلیہ سے نیپلز (NAPLES) اور نیپلز سے تمام جنوبی اطالیہ میں رائج ہو گئیں ۔

ابن رشد کہتا ہے کہ کائنات کی رُوح یا اصل وہ عقلِ فعّال ہے جس سے عقلِ انفعالی یا عقلِ منفرد جدا ہو کر عالمِ اسفل میں حیاتِ انسانی کا جامہ پہنتی ہے اور بالآخر اپنے اس سفر کو طے کر کے اُسی عقلِ کل میں فنا ہو جاتی ہے۔ کائنات کی ہر شئے دُنیا کا ہر متنفس انسان کے دل کا ہر خیال سب کسی ایسی ہستی یا کیفیت کے ذریعے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو اُن سے پہلے موجود ہے۔ کوئی چیز خود بخود پیدا نہیں ہوتی اور نہ پیدا کی جاتی ہے۔ کائنات میں ایک ہمہ گیر روحانی ہستی ہے جس کا

نیّرِ اعظم ہر مظہرِ قدرت میں پرتو افگن ہے ایک ایسی رُوح جو مشہور جرمن فیلسوف کے خیال کے مطابق "جمادات میں سوتی ہے حیوانات میں خواب دیکھتی ہے اور انسان میں بیدار ہو جاتی ہے"
انسان کی روح اس عقلِ فعال سے اس طرح نکلتی اور پھر اُس میں جا ملتی ہے جیسے بارش کا ایک قطرہ سمندر سے آتا ہے اور پھر سمندر ہی میں جا ملتا ہے۔ یہ عقل کل نہ مخلوق ہے نہ فساد پذیر ہے۔ یہ مادّہ سے مُنزّہ ہے اور اس میں کسی شے کا نفوذ ممکن نہیں۔ اس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام اور یہ انسانوں کی آبادی کے گھٹنے بڑھنے سے حجم میں کم یا زیادہ نہیں ہو جاتی۔ عقلِ منفرد کا عقلِ کُل میں جذب ہو جانا ہی اُسکا انتہائی مقصد ہے۔ اس غیر شخصی عقل اس غیر معین خدا کے تصور نے اُس کی وحدانیت کے خیال کے ساتھ مل کر ایک ایسی ہستی قائم کی جسکے سامنے عیسائیت کے خلافِ نطرت توہمات کا ٹھہرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا۔ ابنِ رشد کا یہ مسئلہ اسلامی توحید کے مسئلے سے گویا ہم آغوش تھا اور مسلمانوں کے تعلیمیافتہ طبقہ کے ذریعے سے یہ خیالات یورپ کے دائرۂ علم و فلسفہ میں پھیل گئے فرانسسکن اور ڈومنیکن راہب۔ اس زمانے میں مسیحیت میں راہبوں کے دو فرقے تھے فرانسسکن اور ڈومنیکن (FRANCISCAN & DOMINECAN) فرانسسکنوں نے ابنِ رشد کے مذہب کو بخوشی قبول کیا اور پیرس کا دارالعلوم گویا اُس مذہب کا یورپی مسکن بن گیا جہاں اُس زمانے کے طالبانِ علم کا ایک خاصا جمگھٹا رہتا تھا۔ لیکن ڈومنیکنوں نے بہت جلد اُسکے خلاف اپنا نعرہ بلند کیا کہ یورپ والوں کے دین و ایمان میں یہ نیا فلسفہ بدعت کا باعث ہوگا اور اس لئے اس کا اخراجِ کلی صیانتِ مذہب کے لئے لابدی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابنِ رشد آفرینشِ عالم سطوتِ خلاق الہام، مسئلہ تثلیث، استجابتِ دُعا اور خیرات وغیرہ سے منکر ہے اور اُسکی نظری تعلیم کا نتیجہ فنائے ذات اور جبر یہ اصولوں کا مان لینا ہوگا۔ غرض ان لوگوں نے اُس زمانے کی ساری بدعتوں کے الزام کو ابنِ رشد کے سر تھوپا۔ وُینا کی کونسل میں ابنِ رشد کی تصنیفات کے مطالعہ کو جبراً بند کرنیکی تجویزیں ہوئیں۔ ڈومنیکن راہبوں نے مذہبی عدالتوں کے اسلحہ سے مُسلح ہو کر عربی فیلسوف پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ کی اور اُسے مسیحیت کی بدقسمتی کا موجب قرار دیا۔ لیکن اُسکے شاگردوں اور پیرووں نے چپکے سے ان الزامات کو مان نہ لیا اور برسوں پیرس اور شمالی اطالیہ کے شہروں نے اُسکے خیالات کی تائید کی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یورپ کو اس زمانے میں پورا روحانی آرام کبھی نصیب نہ ہُوا اُسکے

مسئلے پیڈوا (PADUA) کے دار العلوم میں سترھویں صدی تک رائج رہے اور قرونِ وسطیٰ
میں تو وہ گویا سارے یورپ کا ایک ہی فلاسفر تھا + اُسکے فلسفہ کے اثر سے مسیحیت میں ہزاروں
مذہبی فرقے قائم ہو گئے جن میں بعض علانیہ طور پر مسئلاتِ انفصال و انجذاب کی تعلیم دیتے تھے
اطالیہ میں جہاں پاپائے روما کا بہت اثر تھا واقعۂ اصلاح کلیسا کے وقت مذہبِ ابنِ رشد
کے پیرو موجود تھے جن کی ایک خاصی جماعت تھی۔ وہ کلیسا کے اعتراضات کا جواب یوں دیتے
تھے کہ ہمارا فلسفہ ہمارے مذہب سے جدا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک بات فلسفہ کی رُو سے تو
صحیح ہو مگر دینیات کی رُو سے محض غلط۔ پوپ لیو دہم (LEO X) نے بعد میں اس طریقۂ استدلال
کو کفر قرار دیدیا +

اسلام اور اصلاحِ عیسائیت - اس بیان سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ عربوں نے یورپ کے
مذہب پر کس قدر اہم اثرات چھوڑے ہیں + ڈاکٹر ڈریپر اسلام کو "جنوب کی اصلاحی تحریک" کے نام
سے یاد کرتے ہیں۔ یعنی اصلاحِ کلیسا کے واقعہ سے آٹھ صدیاں پیشتر ایک مذہبی تحریک یورپ
میں شروع ہوئی تھی جس کے علمبردار مسلمان تھے۔ اُس تحریک نے ایسے ایسے حکما اور فلسفہ دان
پیدا کئے جن کا اثر یورپ کی دماغی ترقی پر دوام کا حکم رکھتا ہے۔ اُنکے فلسفیانہ خیالات نے
اہلِ یورپ کے اعتقادات و توہمات کو باطل ثابت کر کے ایک نئے نظامِ مذہبی کی بنا ڈالی
جو اوّل اوّل تو طالبانِ علم کے دلوں میں چھپا رہا لیکن بتدریج گویا یورپ کے رگ و پے میں انتشار
کر گیا اور جس نے اُس کی معاشرتی اور روحانی زندگی کو قطعاً اَور کا اَور بنا دیا + اس میں کچھ بھی
شک نہیں کہ اگر جنوب کی یہ اصلاحی تحریک مسلمانوں کے ذریعہ سے یورپ میں نہ پھیلتی۔ تو
پاپائے روما اصلاحِ کلیسا کی اُس شمالی تحریک سے بھی صاف بچ جاتا جو موجودہ تمدنِ
یورپ کا ایک بڑا سبب تھی +

باقی

بشیر احمد

پھول اور ستارہ

۱

میں لالۂ صحرا ہوں   تو عرش کا تارا ہے

چاہوں کہ پہنچ جاؤں

اُڑ کر تری محفل میں

کیا میری تگ و دو ہے؟

کچھ دُور ذرا اڑ کر

پھر خاک پہ گر جاؤں

گرتے ہی فنا ہوں میں

میں لالۂ صحرا ہوں   تو عرش کا تارا ہے

۲

تُو عرش کا تارا ہے   میں لالۂ صحرا ہوں

تیرے لئے ممکن ہے

تُو چاہے تو بن جائے

قطرۂ شبنم کا

اور صبحِ بہاراں میں

میرے دلِ سوزاں پر

اِک بار برس جائے

تُو عرش کا تارا ہے میں لالۂ صحرا ہوں

آثر صہبائی

اقوالِ زرّیں

تُو اپنے آئینۂ دل کے ہزاروں ٹکڑے ہو جانے دے تاکہ اُن میں تو اپنی زندگی کے لاکھوں پہلو دیکھ سکے۔

زندگی ایک خواب ہے اور موت ایک بیداری۔

زندگی تو اک بلبلہ ہے اور اک فریب اور نیند کے اندر اک اور نیند۔

(گلچیں)

رہائی

جناب مرزا محمد سعید صاحب دہلوی ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے اپنے فاضلانہ مضمون "ہندی بھاشا کا جدید ادب" (ہمایوں بابت ماہ جنوری ۱۹۲۶ء) میں تحریر فرمایا تھا " . . . . . اور بھی بعض ہندی اہلِ قلم اس خاص صنفِ تحریر میں بہت سلیقہ رکھتے ہیں۔ اِن میں شاید سب سے زیادہ قابلِ تعریف پنڈت بشمبر ناتھ شرما کوشک ہیں۔ جن کی کہانیوں کا مجموعہ حال ہی میں "چترشال" کے نام سے شائع ہُوا ہے۔ یہ کتاب واقعی ایک "چترشال" یا "تصویر خانہ" ہے جسکے اوراق میں مختلف الطبائع زن و مرد اپنے مرقعے پیش کرتے ہیں۔ اگر کاپی رائیٹ کی دِقت مانع نہ ہوتی۔ تو میرا قصد تھا کہ اس مجموعہ کی کسی کہانی کا ترجمہ اس مضمون میں شامل کر لیتا۔ جس سے اُردو خوان ناظرین کو میرے بیان کا ثبوت مل جاتا۔ لیکن چونکہ سرِدست یہ ممکن نہیں اس لئے صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ کہ مسٹر پریم چند اور مسٹر کوشک دونوں مختصر قصّوں کے لکھنے میں ایک طرزِ خاص کے ماہر ہیں۔ اور اگر اوّل الذکر کی سلاست و روانی دلکش ہے۔ تو ثانی الذکر کا غائر مطالعۂ فطرت بھی کچھ کم قابلِ داد نہیں ۔" "چترشال" کا اُردو زبان میں ترجمہ کرنیکی اجازت میں نے پنڈت صاحب موصوف سے پانچ چھ ماہ ہوئے حاصل کر لی تھی۔ اس مجموعہ کی ایک کہانی کا ترجمہ ارسال خدمت ہے۔

۱

"بیٹی سو شیلا۔ اب رہنے دے۔ بارہ تو بج گئے۔ سویرے دیکھا جائیگا۔ آج سارا دن اور اتنی رات کام کرتے ہی گذری ہے۔"

رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ دنیا کا بیشتر حصّہ نیند کی گود میں خراٹے لے رہا ہے۔ جاگ صرف وہ لوگ رہے ہیں جنہیں جاگنے میں سونے کی بہ نسبت زیادہ مزا اور آرام ملتا ہے۔ یا وہ لوگ جو دن کو رات اور رات کو دن سمجھتے ہیں۔ اور یا پھر وہ لوگ جو رات کی تاریکی اور لوگوں کے عالمِ خواب سے ناجائز فائدہ اٹھانے کو بے چین رہتے ہیں۔ مگر انکے علاوہ کچھ اَور قسم کے لوگ بھی جاگ رہے ہیں۔ یہ لوگ

وہ ہیں جنکے پیٹ پالنے کے لئے دن کے بارہ گھنٹے کافی نہیں۔ جنکے لئے سونے اور آرام کرنیکا مطلب دوسرے دن فاقہ کرنا ہے۔ جو نیند کی دیوی کے محبت بھرے وصال کی طرف سے بے رخی کا اظہار صرف اسلئے کر رہے ہیں کہ اسکے بدلے میں اُنہیں دوسرے دن بُھوک کی ڈائن کی سختیاں سہنی پڑیں گی ؛

اُنکی آنکھیں جُھکی پڑتی ہیں۔ سر چکرا رہا ہے۔ مگر پیٹ کو بھوک کی تکلیف سے بچا نیکے لئے وہ اپنی بچی کھچی طاقت و ہمت سے کام لے رہے ہیں ؛

ایک چھوٹے سے مکان میں ارنڈی کے تیل کا دیا ٹمٹما رہا ہے۔ اُسی چراغ کے پاس ایک پھٹی پُرانی چٹائی پر دو عورتیں جُھکی ہوئی بیٹھی ہیں۔ اُن کے سامنے ایک نیلی مخمل کا لہنگا ہے۔ اور وہ دونوں اس پر سلمے ستارے کا کام بنا رہی ہیں۔ ایک کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہے اور دوسری کی پچیس کے لگ بھگ اُنکی رُک رُک کر چلنے والی اُنگلیاں کام کرنے سے مُنہ موڑ رہی ہیں۔ اور خاموش زبان میں یہ بتا رہی ہیں۔ کہ وہ اس قدر تھکی ہوئی ہیں۔ کہ ان سے زیادہ کام لینا گویا اُن پر ظلم کرنا ہے ؛

کام کرتے کرتے یکایک بُڑھیا نے سُوئی چھوڑ دی۔ چند ساعت آنکھوں پر ہاتھ رکھے رہنے کے بعد وہ بولی :- "بیٹی سوشیلا۔ اب رہنے دے۔ بارہ تو بج گئے۔ سویرے دیکھا جائیگا۔ آج سارا دن اور اتنی رات کام کرتے ہی گذر رہی ہے"؛

سوشیلا اسی طرح کام کرتی ہوئی بولی :- "نہیں۔ سویرے نہیں۔ اب تو لگے ہاتھوں ہو بھی جائیگا۔ اسے سویرے بھجوا دینا چاہیئے۔ اس کی اُجرت ملے تو کچھ کام چلے۔ گھر میں ایک پیسہ تک نہیں ہے۔ کل کا خرچ کیسے چلیگا؟ اور کل رادھے کی فیس بھی دینی ہے۔ کئی دن سے ٹال رہے ہیں۔ کل دے ہی دینی چاہیئے۔ اماں تمہیں نیند آتی ہو تو تم سو رہو۔ میں کر لونگی۔ گھنٹے بھر ہی کا تو کام رہ گیا ہے"؛

بڑھیا بولی :- "بیٹی۔ میری تو اب اُنگلیاں نہیں چلتیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا ہو رہا ہے۔ نیند کے مارے بُرا حال ہے۔ میرے خیال میں تو اب تُو بھی سو جا۔ سویرے ہم دونوں مل کر جلد ہی کام ختم کر لیں گے"؛

سوشیلا نے جواب دیا :- "نہیں اماں۔ سویرے نہیں۔ سویرے اور بہت کام کرنے ہیں۔ رادھے کے لئے کُرتہ سینا ہے۔ کئی دن سے میلا کُرتہ پہنے پھر رہا ہے۔ تم سو رہو۔ میں ابھی اسے پورا کئے دیتی ہوں"

بڑھیا نے بیٹی کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھ کر سوشیلا کے چہرہ

کی طرف دیکھتی رہی اسکے بعد ایک لمبی سانس لیکر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑے ہو کر اس نے ایک زور کی انگڑائی لیکر اپنے جکڑے ہوئے بدن کو سیدھا کیا۔ پھر وہ ایک چارپائی کے پاس پہنچی۔ چارپائی پر ایک میلا بچھونا بچھا ہُوا تھا۔ اور اس پر ایک طرف ایک آٹھ دس سال کا لڑکا سو رہا تھا۔ بُڑھیا بھی اُسی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اور جلد ہی سو گئی۔ جب ماں سو گئی تو سوشیلا اُٹھی۔ اور اس نے بھی ایک انگڑائی لی۔ تھوڑا سا پانی پیا آنکھوں پر پانی کے دو چار چھینٹے مارے اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ کر کام کرنے لگی۔ پندرہ منٹ تک اسکے کام کی رفتار کچھ تیز رہی۔ مگر اسکے بعد پھر اُنگلیوں نے جواب دینا شروع کیا۔ اور آنکھیں اپنے تئیں نیند کے حوالے کر دینے کے لئے ضد کرنے لگیں۔ مگر سوشیلا یہ کہکر کہ تھوڑا سا کام اور ہے اُن سے زبردستی کام لینے کی کوشش کرتی رہی۔ بیچ میں اس نے ایک بار پھر پانی پیا۔ اور آنکھیں دھوئیں۔ آخر کار تقریباً ڈیڑھ بجے سوشیلا نے آخری ٹانکا لگایا۔ مگر اس میں اتنا دم نہیں تھا۔ کہ اُٹھ کر اپنی چارپائی پر جاتی۔ کام ختم ہوتے ہی اس نے سوئی ہاتھ سے رکھ دی۔ چراغ کو منہ سے پھونک مار کر بجھا دیا۔ اور اس کے بعد اسی چٹائی پر لیٹ گئی۔

حالانکہ اتنی رات گئے سوئی تھیں مگر دونوں عورتوں کے فکرمند دلوں نے اُنہیں پوری نیند نہ لینے دی۔ صبح چھ ہی بجے دونوں بیدار ہو گئیں۔ اگرچہ تھکے ہوئے جسم ابھی اور آرام کرنا چاہتے تھے۔ آنکھوں پر بھی ابھی نیند کا پورا پورا غلبہ تھا۔ مگر پھر بھی حوائج سے فارغ ہو کر آٹھ بجنے سے ذرا پہلے سوشیلا نے اپنی ماں سے کہا "اماں! اب تم بھیا کو ساتھ لے جا کر لہنگا دے آؤ۔ پھر یہ سکول چلا جائیگا"۔

یہ کہہ کر سوشیلا نے لہنگے کو ایک کپڑے میں لپیٹ دیا۔

بُڑھیا لہنگا لے کر رادھے کے ساتھ بازار میں ایک دکان پر پہنچی۔ یہ دکان ایک بہت بڑی دوکان تھی۔ اور اس میں سلمے ستارے اور چکن کے کام کے کپڑے اور ٹوپیاں وغیرہ بکتی تھیں۔

دوکان پر پہنچ کر بڑھیا نے دوکاندار کو لہنگا دیا۔

دوکاندار نے لہنگا کھولا اور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بولا "کچھ بہت اچھا تو بنا نہیں۔ کچھ سلمہ بچا ہے؟"

بُڑھیا "ہاں تھوڑا سا بچا ہے"۔

دکاندار:۔ اچھا۔ اسے ابھی اپنے پاس رہنے دو۔ ایک ٹوپی بنوانی ہے۔ اسی میں لگا دینا۔ ہاں تو یہ کام تم نے کچھ جی لگا کر نہیں کیا"۔

بُڑھیا:۔ پندرہ دن سے ہم دونوں اسی کام میں لگی رہیں۔ تب جا کر کہیں یہ آج بن سکا۔ اچھا نہیں بنا تو بُرا بھی نہیں بنا۔ کوئی بیل بُوٹا ٹیڑھا ترچھا نہیں ہؤا۔ جیسا تم نے کہا تھا۔ ویسا ہی بنایا ہے"۔

دکاندار:۔ ٹیڑھا ترچھا نہ سہی۔ پھر بھی بہت اچھا نہیں بنا۔ خیر۔ اس کی بنوائی دو تین دن میں لیجانا ایک ٹوپی بھی لیتی جاؤ۔ اُسے بھی جلد ہی بنا کر دے جانا"۔

بُڑھیا:۔ لاؤ۔ ٹوپی دے دو۔ اور اس کی بنوائی بھی ابھی دے دو تو بڑا کام کرو۔ گھر میں کھانے پینے کو نہیں رہا۔ رادھے کی فیس بھی دینی ہے"۔

دکاندار چند لمحے سوچتا رہا۔ اسکے بعد بولا "اچھا تو اسکی بنوائی سات روپے ہوئے۔ کیوں۔ نہیں؟"

بُڑھیا عاجزی سے بولی "اب تمہیں سمجھ لو بیٹا! میں کیا کہوں۔ پندرہ دن کام کیا ہے"

دکاندار:۔ سات روپے بھی تو تھوڑے نہیں ہیں۔ تمہیں تو ہم ایک آدھ روپیہ زیادہ ہی دیدیا کرتے ہیں"۔

بُڑھیا:۔ بیٹا۔ سات روپے میں تو پیٹ نہیں بھرتا۔ کچھ اور دو۔ ہم بڑے غریب ہیں۔ گھر میں کوئی مرد مانس نہیں۔ جو آج اس لڑکے کا باپ یا جیجا (بہنوئی) ہوتا۔ تو ہمیں یہ دن کاہے کو دیکھنے پڑتے"۔

یہ کہہ کر بڑھیا آنکھوں میں آنسو بھر لائی"۔

دوکاندار بولا "اچھا آٹھ روپے دینگے۔ بس۔ اب تو خوش ہو؟"

بُڑھیا:۔ بیٹا۔ بھگوان تمہیں دُودھ پوت سے سُکھی رکھے! تمہاری بدولت ہمارا بھی پیٹ بھرتا ہے"۔

دکاندار نے بُڑھیا کو آٹھ روپے دئے۔ ٹوپی کا پلّہ بھی دیدیا۔ اور اسکے متعلق ضروری باتیں سمجھا دیں۔

بڑھیا کے چلے جانے پر دوکاندار نے اپنے منیب کو مخاطب کر کے کہا "یہ لہنگا تیار ہو گیا ہے اسے آج ہی رائے صاحب کے ہاں بھجوا دینا۔ ساتھ ہی اسکی اُجرت کا پرچہ بھی بھیج دینا"

منیب نے پُوچھا "کتنے کا پرچہ بناؤں؟"

دوکاندار کچھ دیر سوچ کر بولا "ایکسو چالیس روپے کا پرچہ بنادینا۔ سو روپے مال کے اور چالیس ہنوائی"

رائے صاحب بابو جوتی سروپ کے بڑے بیٹے بابو کرشن سروپ ایک انگریزی اخبار پڑھ رہے تھے۔ پاس ہی اُنکے دو تین دوست بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ یکایک کرشن سروپ نے اخبار میز پر رکھدیا۔ اور بولے "آجکل بڑی ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ یہ بات کیا ہے؟ آخر یہ مزدور چاہتے کیا ہیں؟ کیا ان لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ سرمایہ لگانے والوں کے برابر منافع میں انہیں بھی حصہ ملا کرے؟"

ایک دوست نے کہا "برابر نہ سہی۔ کم سے کم اتنا تو ضرور ملے۔ جس میں وہ آرام سے گذر کر سکیں"

کرشن سروپ مُنہ بنا کر بولے "یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ جو روپے لگائیگا۔ دماغ خرچ کریگا۔ وہ اپنی کمائی میں سے دے کر نقصان کیوں اُٹھانے لگا؟"

دوسرا "صرف روپیہ لگادینے ہی سے اُسے اس قدر اختیار حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ مزدوروں سے سخت شدید کام لے اور مزدوری اتنی دے۔ جیسے کُتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے فرض کیجئے ایک مزدور سے کسی سرمایہ دار کو پانچ روپے کا فائدہ ہوتا ہے۔ اور وہ اُن پانچ روپوں میں سے مزدور کو صرف دو آنے یا چار آنے دیتا ہے۔ باقی خود ڈکار جاتا ہے۔ تو یہ بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے؟ بالخصوص اس حالت میں جب اُن دو چار آنوں سے مزدور کا پیٹ نہیں بھرتا"

کرشن "اگر دو چار آنوں میں اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ تو وہ ایسی جگہ مزدوری ہی کیوں کرے؟ اُس جگہ کیوں نہ کرے جہاں زیادہ ملے؟"

تیسرا "آپ بھی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ زیادہ دیتا ہی کون ہے؟ سب کا یہی حال ہے۔ اگر ایک آدھ ایسا ہو بھی جو اطمینان بخش اُجرت دیتا ہو۔ تو اس سے کتنے مزدوروں کا کام چل سکتا ہے؟ ایک دو سرمایہ دار تو دُنیا بھر کے مزدوروں کو رکھ ہی نہیں سکتے"

کرشن "ہاں ممکن ہے۔ مگر میری سمجھ میں تو مزدور مزدور ہی ہے۔ اُسے مزدوری ہی دی جائیگی علاوہ اسکے اتنا اندھیر تو شاید ہی کہیں ہوتا ہو کہ جس مزدور سے پانچ روپے کا فائدہ ہو اُسے صرف دو ہی چار آنے دئے جائیں"

تیسرا:۔ شاید ہی کہیں نہیں۔ سب جگہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو۔ تو یہ کب ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ بڑی بڑی کمپنیوں کارخانوں کا سرمایہ بڑھتا ہی چلا جائے اور بیچارے مزدور وہی موچی کے موچی بنے رہیں؟

کرشن:۔ روپیہ لگانے والے سرمایہ بڑھانے کے لئے ہی لاگت لگاتے ہیں۔ اور مزدور صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے مزدوری کرتے ہیں"

چوتھا:۔ اگر پیٹ بھی بھر جایا کرے تو بھی ٹھیک ہے۔ مگر مشکل تو یہی ہے۔ کہ انکا پیٹ بھی نہیں بھرتا"

دوسرا:۔ پیٹ بھرنے کا کہیں یہ مطلب نہ نکال لیجئے گا کہ چنے چبا کر بھی پیٹ بھر سکتا ہے۔ اپنے لئے آپ پیٹ بھرنے کے یہ معنے لیتے ہیں کہ انواع و اقسام کے گھی سے چہچہاتے ہوئے پکوان ہوں کھٹی میٹھی چیزیں ہوں۔ ربڑی ہو۔ بالائی ہو۔ دودھ ہو۔ اور اُن کے لئے پیٹ بھرنے کا یہ مطلب کہ چنے چبا کر بھی پیٹ بھر سکتے ہیں!"

کرشن:۔ (کچھ سوچ کر) نہیں۔ اس قدر بے انصافی تو میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ مگر ساتھ ہی میں یہ بھی ٹھیک نہیں سمجھتا کہ مزدوروں کی ہمت اتنی بڑھائی جائے۔ کہ وہ سرمایہ داروں کے منافع پر دانت رکھیں"

تیسرا:۔ خیر۔ اگر ابھی آپ نہیں سمجھتے۔ تو رفتہ رفتہ سمجھنے لگینگے"

کرشن:۔ میری رائے میں تو ان ہڑتالوں میں مزدوروں کو کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ بھلا سرمایہ دار اُنکی شرائط کیوں منظور کرنے لگے؟"

چوتھا:۔ منظور نہ کرینگے تو جائینگے کہاں؟ جب انہیں مزدور ہی نہ ملیں گے تو جھک مار کر منظور کرینگے۔ مگر اس میں بات اتنی ہے کہ مزدور بھی اپنی بات پر ڈٹے رہیں"

کرشن سروپ کچھ کہنے ہی کو تھے کہ ایک خدمتگار کمرے کے اندر آیا۔ اور کرشن سروپ سے بولا:۔ سرکار۔ گلاب چند کمپنی کا آدمی آیا ہے"

کرشن:۔ یہاں بلا لاؤ"

کچھ دیر بعد نوکر ایک چپراسی کو ساتھ لے کر آیا۔

چپراسی نے سلام کر کے کرشن سروپ کے سامنے ایک کاغذ میں لپٹا ہوا پلندہ سا رکھدیا۔ اور ساتھ ہی ایک لفافہ بھی پلندہ کے پاس رکھدیا۔

کرشن سروپ نے پلندہ کھولا۔ اس کے اندر سے ایک نیلی مخمل کا لہنگا نکلا۔ جس پر نیچے سے اوپر تک زری کا کام کیا ہوا تھا۔ کرشن سروپ کچھ دیر تک اسے اُلٹ پُلٹ کر دیکھتے رہے۔ اسکے بعد اپنے دوستوں کو مخاطب کرکے بولے "دیکھئے کتنا اچھا کام ہے"

دوستوں نے بھی دیکھ کر کام کی تعریف کی۔ اسکے بعد کرشن سروپ نے لفافہ پھاڑ کر اندر سے بل نکالا۔ بل پڑھ کر چپراسی سے بولے "اچھا۔ روپے شام کو یا کل سویرے بھجوا دئے جائینگے"

"بہت اچھا" کہہ کر اور سلام کرکے چپراسی کمرے سے نکل گیا۔

جب چپراسی چلا گیا تو کرشن سروپ کے دوستوں نے ان سے پُوچھا "یہ کتنی قیمت کا ہے؟"

کرشن "اب یہ سمجھ لیجئے کہ سو روپے کی تو مخمل ہے دس گز۔ سو روپے کی زری لگی ہے اور چالیس روپے بنوائی کے"

دوسرا "چالیس روپے بنوائی! چالیس روپے تو کچھ زیادہ نہیں ہیں"

کرشن "چالیس روپے میں صرف زری کا کام بنا ہے۔ لہنگے کی سلائی الگ ہے"

تیسرا "پھر بھی کچھ زیادہ نہیں۔ کام کو دیکھتے ہوئے مناسب ہی ہے"

کرشن "ہم سے زیادہ لے بھی نہیں سکتے۔ آرڈر دیکر بنوایا ہے۔ مخمل ہماری۔ زری ہماری۔ لہنگے کی سلائی ہماری۔ صرف اُنہوں نے بنوا دیا ہے"

چوتھا "بنا بنایا لیتے۔ تو کچھ اور زیادہ دام لگ جاتے"

کرشن "بلاشبہ زیادہ لگتا۔ کیونکہ وہ اپنا منافع بھی تو لیتے۔ صرف زری کے کام کی بنوائی میں زیادہ منافعہ کی گنجایش نہیں ہے۔ دو چار روپے بچ بھی گئے تو کیا"

پہلا "ان کے ہاں کاریگر نوکر ہونگے؟"

کرشن "اور نہیں تو کیا؟ نوکر نہ ہوں تو کام کیسے چلے۔ اچھا بڑا کارخانہ ہے معمولی فرم نہیں ہے"

مذکورہ بالا واقعہ کے چار پانچ روز بعد کرشن سروپ کے ایک دوست جنہیں ہم نے تیسرا نمبر دیا ہے "گلاب چند اینڈ کمپنی" کے ہاں پہنچے۔ ان کا نام برج بہاری تھا۔ انہیں بھی کچھ زری کا کام بنوانا تھا۔ اسی لئے کرشن سروپ سے گلاب چند کمپنی کے بارے میں یہ علوم کرکے کہ وہ کرشن سروپ

کا کام مناسب اُجرت پر کر دیتی ہے۔ انہوں نے بھی اس کمپنی سے کچھ کام کرانے کا فیصلہ کیا۔

دوکان پر پہنچ کر برج بہاری نے پہلے انکے ہاں کا جدا جدا قسم کا کام دیکھا۔ اسکے بعد انہیں جو کچھ بنوانا تھا۔ اس کے متعلق گفتگو کی۔ ابھی وہ بات چیت کر ہی رہے تھے۔ کہ سوشیلا کی ماں رادھے کو ساتھ لئے آ پہنچی۔ اور سیدھے گلاب چند کے پاس آ کر اُس نے انکے ہاتھ میں ایک ٹوپی دے دی گلاب چند نے جلدی سے ٹوپی کو دیکھ کر بڑھیا سے کہا" اچھا اب اس وقت تم جاؤ کل کسی وقت ملنا۔"

بُڑھیا نے عاجزانہ انداز سے کہا" اس کی بنوائی دیدو۔ تو اچھا ہو۔"

گلاب چند ذرا ناخوش ہو کر بولے" بنوائی مل جائیگی۔ ابھی مجھے فرصت نہیں ہے۔ ابھی تین چار ہی دن تو ہوئے۔ روپے لے گئی تھی۔"

بُڑھیا" ہاں بیٹا۔ لہنگے کی بنوائی کے آٹھ روپے جو تم نے دئے تھے۔ وہ سب خرچ ہو گئے کچھ کا کھانے پینے کو آ گیا کچھ اِدھر اُدھر خرچ ہو گئے۔"

گلاب چند نے غصّہ ہو کر کہا" تم سے حساب کون پوچھتا ہے؟ فضول بک بک لگا رکھی ہے۔ جاؤ۔ اپنا کام دیکھو۔ جب فرصت ہو گی اس وقت تمہارا حساب دیدینگے۔ چلو۔ ہٹو"

بُڑھیا اپنا سا منہ لیکر آہستہ آہستہ وہاں سے چلدی۔

گلاب چند نے برج بہاری کو مخاطب کر کے کہا" ہاں۔ تو آپ آرڈر دے جائیے۔ آپ کا کام تیار ہو جائیگا۔ یہ یقین رکھئے کہ قیمت مناسب لی جائیگی۔ اور کام وقت پر دیا جائیگا۔"

مگر برج بہاری صاحب کسی اور ہی دُھن میں تھے۔ اُنھوں نے پوچھا" یہ بُڑھیا کون ہے؟"

گلاب چند" ہمارے ہاں کا کچھ کام بناتی ہے۔ صاحب۔ کاریگروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ایک ایک کے دو دو لیتے ہیں۔ پھر بھی سر گھڑی چھاتی پر سوار ہو کر لاؤ روپیہ لاؤ روپیہ کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ انکے پاس ہمارا کچھ نہ کچھ پیشگی ہی رہتا ہے۔ پیشگی نہ دیں۔ تو کام نہ کریں کیا کریں۔ ناچار دینا ہی پڑتا ہے۔"

برج بہاری کچھ سوچ کر بولے" اچھا میں پھر کسی وقت آؤنگا۔"

یہ کہکر وہ جلدی سے دکان کے باہر آئے۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ تھوڑی ہی دُور پر سے سوشیلا کی ماں رادھے کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ برج بہاری لپک کر اس کے

پاس پہنچے۔ پاس جاکر اُنھوں نے بُڑھیا سے کہا: "کیوں مائی جی تم کہاں رہتی ہو؟"

بُڑھیا نے پہلے تھوڑی دیر تک برج بہاری کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ پھر بولی: "یہیں چاول والی گلی میں رہتی ہوں"

برج بہاری: "تم زری کا کام کرتی ہو؟"

بُڑھیا: "ہاں بیٹا بناتی تو ہوں۔ کیا کریں۔ یہ پیٹ سب کچھ کراتا ہے۔ گھر میں کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ اسی سے پیٹ پالتی ہوں"

برج: "تمہارے اور کوئی نہیں ہے؟"

بُڑھیا: "ایک بیوہ لڑکی ہے۔ اور یہ لڑکا ہے۔ اور کوئی نہیں ہے"

برج: "مجھے بھی کچھ کام بنوانا ہے۔ بنا دو گی؟"

بُڑھیا: "ہاں۔ بنا کیوں نہ دینگے ہمارا تو گذارہ اسی سے چلتا ہے"

برج: "مگر مجھے اچھا کام بنوانا ہے۔ ایسا ویسا نہیں"

بُڑھیا: "اچھا ہی بنا دینگے ابھی تین چار دن ہوئے۔ گلاب چند کو ایک نیلی مخمل کے لہنگے پر زری کا کام بنا کر دیا ہے۔ اسے تم دیکھتے۔ تو معلوم ہو جاتا کہ ہم کیسا کام بناتے ہیں"

برج بہاری چونک کر بولے: "نیلی مخمل کا لہنگا؟"

بُڑھیا: "ہاں نیلی مخمل کا۔ اس پر بڑے بڑے بوٹے اور بیل بنائی گئی ہے"

برج: "کتنے دن ہوئے؟"

بُڑھیا: "بنا کر دئے ہوئے ابھی تین ہی چار دن ہوئے ہیں"

برج: "رائے صاحب والا تو نہیں؟"

بُڑھیا: "اب یہ تو میں جانتی نہیں۔ گلاب چند نے بنوایا تھا۔ چاہے کسی کا ہو"

برج: "اس کی بنوائی تمہیں کیا ملی تھی؟"

بُڑھیا: "آٹھ روپے"

برج بہاری ذرا متحیر ہو کر بولے: "آٹھ روپے! تو وہ نہ ہوگا۔ کوئی اور ہوگا۔ اُسکی اُجرت تو چالیس روپے تھی"

برج بہاری نے اپنے کام کے متعلق سمجھا کر کہا: "اس کی بنوائی کیا لوگی؟"

بڑھیا: "جو گلاب چند دیتے ہیں۔ وہی تم بھی دے دینا"

برج: "وہ کیا دیتے ہیں؟"

بڑھیا: "اتنے کام کے پانچ روپے دیتے ہیں"

برج بہاری بے حد متعجب ہو کر بولے: "پانچ روپے!"

بڑھیا: "ہاں پانچ روپے۔ میں تم سے جھوٹ نہ کہوں گی پانچ روپے دیتے ہیں کم نہیں دیتے"

برج: "مگر وہ تو اس کی بنوائی ———"

اتنا کہہ کر برج بہاری ذرا جھجکے۔ مگر ویسے ہی بات کا رُخ بدل کر بولے: "اچھا تم مکان دکھا دو میں تمہیں سب سامان بھجوا دونگا"

سوشیلا کی ماں نے برج بہاری کی تجویز منظور کر لی۔ اور اُن کو ساتھ لیکر اپنے گھر پہنچی۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر بولی: "یہیں بھجوا دینا"۔

برج بہاری نے جیب سے چار روپے نکال کر کہا: "گلاب چند سے جو کچھ تم نے کہا تھا۔ اس سے مجھے پتہ لگا کہ اس وقت تمہیں روپوں کی ضرورت ہے۔ اسی لئے اپنے کام کی بنوائی میں سے چار روپے پیشگی دیتا ہوں"۔

بُڑھیا روپے لیتے ہوئے کچھ جھجکی۔ مگر برج بہاری زبردستی اس کے ہاتھ میں روپے رکھکر چل کھڑے ہوئے۔

سوشیلا کی والدہ کے مکان سے لوٹ کر برج بہاری سیدھے کرشن سروپ کے پاس پہنچے۔ اور بولے: "تھوڑی دیر کے لئے آپ مجھے وہ لہنگا دیدیجئے۔ جو پرسوں بن کر آیا ہے"

کرشن سروپ نے مسکرا کر کہا: "کیوں؟ ویسا بنوانے کی مرضی ہے کیا؟"

برج: "ہاں کچھ ایسی ہی مرضی ہے"

کرشن سروپ نے لہنگا منگوا دیا۔

برج بہاری وہ لہنگا اور اپنے کام کے لئے ضروری سامان لے کر پھر سوشیلا کے مکان پر

پہنچے۔ جاتے ہی پہلے انہوں نے وہ لہنگا بُڑھیا کو دکھا کر پوچھا "یہی لہنگا تمہارا بنایا ہُوا ہے ؟"

بُڑھیا اور سوشیلا ایک آواز سے بولیں "جی ہاں۔ یہی لہنگا ہے۔"

یہ سُن کر برج بہاری کے دل پر چوٹ لگی۔ وہ سوچنے لگے "صرف اسکے بنوانے کی دلالی میں گلاب چند بتیس روپے کھا گیا۔ اور جنہوں نے لہو پسینہ ایک کر کے بنایا۔ اُنہیں صرف آٹھ ہی روپے دئیے!"

برج بہاری نے پوچھا "یہ لہنگا تم نے کتنے دن میں تیار کیا تھا؟"

بُڑھیا نے جواب دیا "پندرہ دن تک ہم دونوں ماں بیٹی لگی رہی تھیں۔ تب جا کر کہیں یہ تیار ہُوا تھا۔ رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک کام کیا تھا۔"

برج بہاری کے تہ دل سے ایک آہ نکلی۔ اُنہوں نے سوچا "اگر ان کو ان کی محنت کا نصف منافع بھی مل جایا کرے۔ تو ان کے افلاس و تنگدستی میں بہت کچھ کمی ہو سکتی ہے"

برج بہاری نے پوچھا "معلوم ہے۔ اس کی بنوائی گلاب چند نے کیا لی ہے؟"

بُڑھیا نے کہا "ہم کیا جانیں بیٹا؟"

برج "یہ ایک میرے واقف کے گھر کا لہنگا ہے۔ گلاب چند نے اُن سے اس کی بنوائی چالیس روپے لی ہے"

سوشیلا اور اس کی ماں دونوں صُم بکم برج بہاری کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ اس کے بعد سوشیلا ایک لمبی سانس لے کر بولی "چاہے کچھ ہی لے۔ ہمیں کیا؟ ہمیں جو دیتا ہے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں۔ اتنا بھی دیتا ہے۔ غنیمت ہے۔"

برج "تو تم اسکے لئے کام کیوں کرتی ہو؟ خود اِدھر اُدھر سے کام کیوں نہیں لے آتیں؟"

بُڑھیا "ہم نے پہلے یہی کر کے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے ہمیں کام نہیں دیا۔ لوگ کہنے لگے تمہیں ہم کیا جانیں؟ ہمارا مال ہی لے کر چلدو تو ہم کیا کریں؟ ہم نے یہ بھی کہا کہ تمہارے مکان پر بیٹھ کر بنا دیا کریں۔ مگر اس پر بھی کوئی راضی نہ ہُوا۔"

برج "گلاب چند تمہیں پیشگی بھی دیتا رہتا ہے؟"

بُڑھیا "کبھی جب بہت ہاتھ پاؤں جوڑتی ہوں۔ تو دو چار روپے دے دیتا ہے۔ اور

کبھی نہیں بھی دیتا"

برج:" اچھا میں اپنے کام کی بنوائی تمہیں پندرہ روپے دونگا۔ چار روپے دے چکا ہوں۔ پانچ روپے یہ اور لو۔ باقی چھ روپے اس وقت دونگا جب کام بن جائیگا۔ اب ایک کام یہ کرنا کہ گلاب چند کا کام اس قدر کم اجرت پر کبھی نہ کرنا۔ کم سے کم اس کا اڑھائی گنا دے تو کرنا"

پانچ روپے کے کام کے پندرہ روپے اور اس میں سے نو روپے پیشگی ملتے دیکھ کر ماں بیٹی کی آنکھوں میں شکر گذاری کے آنسو بھر آئے۔

بڑھیا بولی:" یہ تو بیٹا تم نے جو کہا سو ٹھیک ہے۔ مگر گلاب چند ایسا کیوں کریگا؟"

برج:" نہ کرے تو تم بھی اس کا کام نہ کرنا"

بڑھیا:" کام نہ کرینگے تو کھائینگے کیا؟

برج بہاری یہ سن کر فکر میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ دیر تک سوچ کر بولے:" اسکے لئے تم مت گھبرانا میں تمہیں کام دیا کرونگا"

یہ کہکر برج بہاری اُن سے رخصت ہوئے اور سیدھے کرشن سروپ کے پاس پہنچے۔ اُنکے روبرو سارا کچا چٹھا بیان کر کے بولے:" دیکھ لی آپ نے گلاب چند کی شرافت؟ آپ اُسے بڑا شریف آدمی سمجھتے تھے!"

کرشن سروپ بھی سن کر متحیر رہ گئے۔ کہنے لگے:" مجھے خواب میں بھی یہ امید نہ تھی کہ وہ اس طرح غریبوں کے گلے کاٹتا ہوگا"

برج:" یہ اتنا موٹا کیسے ہوا؟ اسی طرح غریبوں کے گلے کاٹ کاٹ کر! اسی کی بدولت یہ لوگ اتنے بڑے دھنا سیٹھ بنے بیٹھے ہیں۔ اور گاڑیوں پر چڑھے چڑھے پھرتے ہیں۔ یہ تو صرف ایک ہی مثال ہے۔ سبھی ایسا کرتے ہیں"

کرشن:" کیوں جی یہ اپنے سب کاریگروں کے گلے ایسے ہی کاٹتا ہوگا؟"

برج:" اور نہیں تو کیا؟ یہ تو صرف انہی عورتوں کی ایک مثال ہے۔ اس کے پاس تو بیس پچیس کاریگر ہونگے۔ اس روز آپ ان سرمایہ داروں کی طرفداری کر رہے تھے۔ دیکھے انکے کرتوت؟ یہ تو ایک چھوٹی سی مثال آپ کو ملی ہے۔ اسی سے آپ بڑی بڑی ملوں اور کارخانوں

کے حال کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ خیر یہ تو جو ہے۔ وہ ہے۔ اب میں نے گلاب چند کے ہوش و حواس درست کرنیکا تہیہ کیا ہے۔ آپ کو اس کام میں میری مدد کرنی پڑیگی۔"

کرشن :- "کہو"

برج :- "میرا ارادہ ایک دُکان کھولنے کا ہے۔ اس میں یہ قاعدہ رکھا جائے کہ جو کاریگر جتنے کا کام کرے۔ اس کا نصف حصّہ کاریگر کو دیا جائے اور نصف فرم لے۔ اسکے علاوہ سال بھر میں جو منافع ہو۔ اس میں سے بھی اُنہیں کچھُ دیا جائے۔"

کرشن :- "سکیم تو اچھی ہے۔"

برج :- "اچھی ہو یا بُری میں اسے ضرور عملی جامہ پہناؤ نگا۔ اور اس میں آپکو میری مدد کرنی پڑیگی۔"

کرشن :- "میں حاضر ہوں۔ جیسا کہو گے ویسا کرونگا۔ اس واقعہ کو سُن کر مجھے بھی ان سرمایہ داروں سے نفرت ہو گئی ہے۔"

مذکورہ بالا واقعہ کے ایک ماہ بعد "کرشن اینڈ کمپنی ایمبرائڈرز" نام کی ایک بڑی فرم قائم ہو گئی۔ اس فرم نے ایک اشتہار شائع کیا جس میں کاریگروں کے لئے کام کرنیکی شرائط چھپی ہوئی تھیں۔ وہ شرائط اس قدر سہولیت بخش تھیں کہ کرشن اینڈ کمپنی کو دھڑا دھڑ کاریگر ملنے لگے۔ رفتہ رفتہ اسکا پتہ گلاب چند اینڈ کمپنی کے کاریگروں کو لگا۔ گلاب چند سے اُنہیں جو اُجرت ملتی تھی۔ اس سے کرشن اینڈ کمپنی کی اُجرت کا موازنہ کیا۔ تو تگنے کا فرق پایا۔ اس حساب سے گلاب چند کے ہاں جو ایک روپیہ ملتا تھا۔ تو کرشن اینڈ کمپنی کے ہاں تین روپے ملنے کی اُمید تھی۔ بعض لوگ ایسے تھے۔ جو گلاب چند کا پیشگی روپیہ کھائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ جبتک وہ لوگ وہ روپیہ ادا نہ کر دیتے۔ اسوقت تک گلاب چند کے ہاں کا کام چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ایسوں میں بھی بہتوں نے قرض لیکر گلاب چند کا روپیہ ادا کر دیا۔ جنہیں قرض نہ ملا۔ اُنہوں نے اپنی مشکلات کرشن اینڈ کمپنی کے روبرو بیان کیں۔ کرشن اینڈ کمپنی نے فوراً اُنکا قرض چکا کر اُنہیں گلاب چند کے پنجے سے چھُڑا لیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ گلاب چند کے سب کاریگر کرشن اینڈ کمپنی کے ہاں آ گئے۔ گلاب چند نے بہت لالچ دیئے مگر کاریگروں کو اس سے اس قدر نفرت ہو گئی تھی کہ

EMBROIDERS ؎

انہوں نے ہرگز اسکا کام کرنا منظور نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ گلاب چند کا دیوالہ نکل گیا۔ ادھر کرشن اینڈ کمپنی کا کام دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اسکے کاریگر چاروں طرف اُسکے گُن گاتے پھرتے تھے۔ اس کا اثر عوام پر اچھا پڑا لوگوں کو کرشن اینڈ کمپنی پر اٹل اعتقاد ہو گیا +

ایک سال کے بعد کا ذکر ہے۔

"بیٹی سوشیلا! اب تو رادھے کے بیاہ کی تیاری کرنی چاہیئے"

ایک چھوٹے سے مگر صاف سُتھرے مکان کے ایک دالان میں ایک موٹے گدیلے پر بیٹھی ہوئی سوشیلا کارچوبی کا کام کر رہی ہے۔ پاس ہی ایک چارپائی پر سوشیلا کی ماں مالا لئے بیٹھی ہے۔ مالا پھیرتے پھیرتے یکایک بڑھیا نے سوشیلا سے کہا "بیٹی سوشیلا! اب تو رادھے کے بیاہ کی تیاری کرنی چاہیئے"

سوشیلا نے مُسکرا کر جواب دیا "ابھی سے؟ ابھی تو یہ بارہ ہی برس کا ہے"

بُڑھیا "اور کیا بُڑھاپے میں بیاہ ہوگا؟ میری یہ ابھلاکھ (آرزو) ہے کہ میں رادھے کی بہو کا مُنہ دیکھ کر مروں۔ میرے ایسے بھاگ کہاں جو ناتی پوتوں کا مُنہ دیکھوں؟"

سوشیلا ہنس کر بولی "کیوں۔ بھاگ ہونے کو کیا ہُوا؟

بُڑھیا "نا بیٹی! میرے ایسے بھاگ نہیں"

عین اُسی وقت رادھے کتابیں بغل میں دبائے سکول سے آگیا۔ اور کتابیں ایک طرف رکھکر بولا "جی جی[1]! بڑی بھوک لگی ہے۔ کھانے کو دو" +

[1] بڑی بہن

سوشیلا نے کام چھوڑ دیا اور رادھے کو کھانے کو دیا +

رادھے کھانا کھانے میں مشغول ہو کر بولا "جی جی! آج برجو بابو (برج بہاری) کہتے تھے۔ کہ تو جب بڑا ہو جائیگا تو تجھے ہم اپنی دوکان پر رکھ لینگے" + سوشیلا "پھر کیا۔ جلدی جلدی پڑھ لے"

رادھے "جی جی میں یہ جماعت پاس کر لونگا۔ تو پھر نئی نئی کتابیں لینی پڑیں گی"

سوشیلا "تو پھر کیا ہُوا۔ لے دینگے۔ اب ہمیں کیا کمی ہے؟ برجو بابو کی دوکان بنی رہے۔ اور ہمارے ہاتھ پاؤں چلتے رہیں۔ اب ہمیں کسی بات کی کمی نہیں ہے" +

یہ کہہ کر سوشیلا پھر اپنی جگہ پر آکر کام کرنے لگی +

(ترجمہ) کوشل

نامۂ گرامی

(ملک الشعراحضرت مولانا غلام قادر صاحب گرامی استاد حضور نظامِ دکن)

ہفتاد سالہ گرامی ہمایوں کے واسطے ایک غزل بھیجتا ہے۔ طبعِ خود پسندِ گرامی آرزو مند ہے کہ اس غزل کی نسبت حامد اپنی صحیح رائے لکھیں۔ پنجاب نے ہفتاد سالہ گرامی کے حواسِ خمسہ باطل کردئے۔

والسلام
خاکسار گرامی

غزل

یک اشکِ خوں بدجلہ و جیحوں برابرست — در وادئی بلا کم و افزوں برابرست

درکارگاہِ عقل بود رنگِ امتیاز — در بزمِ عشق لیلی و مجنوں برابرست

مُفت ست گر ز غمزۂ خونریز جاں بریم — یک خونِ بیگناہ بصد خوں برابرست

در نزع بر زبانِ زلیخا جز ایں نبود — یک آہ با ہزار شبیخوں، برابرست

اللّٰہی است دیگر و لاہی دگر بود — غافل کجا بحضرتِ ذوالنون برابرست

منصور راز نکتۂ وحدت خبر کنید — چوں اے پسر چگونہ بہ بیچوں برابرست

آنجا کہ شد گرامئ غمدیدہ اشک ریز — یک قطرہ با تلاطمِ جیحوں برابرست

سلیمیات

ذیل کے موضوع کے متعلق فی الحال ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں اگر مولانا وحید الدین صاحب سلیم اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ناظرین ہمایوں کو اپنے نقطۂ خیال سے آگاہ فرما دیں تو ہم اُن کے ممنون ہونگے ۔ مدیر

کچھ عرصہ قبل اُردو کی ترقی کے ذرائع پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر سلیم نے تجویز کی تھی۔ کہ اسموں سے فعل بنائے جائیں اور مشترک تلفظ والے حروف میں سے ایک کا انتخاب کرکے باقی ترک کر دئے جائیں۔ عرصے تک مختلف حلقوں میں اس پر بحث ہوتی رہی کہ یہ ناممکن العمل ہے مگر اب ان دونوں تحریکوں کے حامی روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں ۔

پہلی تجویز تو گویا منظور کر لی گئی کیونکہ مختلف مضمون نگار اس پر عمل بھی کرنے لگے ہیں خصوصاً حیدر آباد میں یہ تحریک بہت عام ہوتی جا رہی ہے۔ عثمانیہ کالج میں اب سیکلانا، موٹرانا، غیر مانوس الفاظ نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ ایک مقامی رسالے میں مجھے روڑانا (روڑا اٹکانا) منظرانا (سین کھینچنا) وغیرہ نئے الفاظ نظر پڑتے ہیں تو گفتگو میں سوالنا، صفتانا وغیرہ سننے میں آتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک علمی خبر درج کرنی نامناسب نہ ہوگی جو یہ ہے کہ اسم سے فعل بنانے کی تحریک اب سے تین سو برس پہلے فارسی زبان کے متعلق طرزی افشار نے بھی کی تھی۔ گزشتہ مہینے کے "ایران شہر" میں جو برلن سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا کلام درج کیا گیا ہے مثال کے طور پر یہاں کچھ اقتباسات دئے جاتے ہیں:۔

از بلدۂ قزوین بصفاہان سفریدم ——— بے خرجی و بے اسپ خراماں سفریدم

یاراں سفریدند بجمعیت و من ہم ——— یک قافلہ باجان پریشاں سفریدم

اس نے بہت سے سفر کئے ہیں جن میں سے عتبات خاص حیثیت رکھتا ہے ذیل کے شعر میں اسی کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ:۔

---

[1] جناب محمد حبیب اللہ صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ کا فارسی مطالعہ ہی اس دلچسپ تحقیق کو اردو میں لانے کا موجب ہوا ہے اور وہ اس تحریک کو طرزیات کا نام دینا پسند کرتے ہیں ۱۲

ترکیدم و تاتیدم و آنگہ عربیدم　　　　در دیدۂ کوتہ نظراں بوالعجبیدم

ترجمہ۔ میں ترکستان گیا، تاتار گیا پھر عرب پہنچا جسکی وجہ سے کوتاہ نظروں کی آنکھ میں بوالعجب بنا

زمانے کا ذکر کرتا ہے :۔

شعباں رمضاں کرب و بلادم متعجب　　　　بے آش جمادیدم و بے نان رجبیدم

حج کی آرزو ظاہر کرتا ہے :۔

طرزی ازرہ ہمت ہمرہاں حجازیدند　　　　تو زراہ مانیدی بسکہ اصفہانیدی

اپنے اسٹائل کا ذکر کرتا ہے :۔

ترا طرزیا صد ہزار آفریں　　　　کہ طرز غریبے جدیدیدۂ

طرزیدن من ز طرز تازہ　　　　از دولت شاہ دیں پناہ است

غزلیہ اشعار کا ایک نمونہ :۔

بامن دل خستہ اے دلدار جنگیدن چرا؟　　　　تو غزال گلشن حسنی پلنگیدن چرا؟

می نگاہی بامن وی التفاتی بار قیب　　　　بامن یکرنگ اے رعنا دورنگیدن چرا؟

بعض نئے الفاظ کا استعمال :۔

در مملکت حسن ترا پادشہیدند　　　　بر جبہۂ ما خط غلامی رقمیدند

فریاد کہ فریاد فقیراں نشنیدی　　　　ہر چند کہ برخاک درت زیر و بمیدند

ہر طائفہ طرزی! علم خویش نمودند　　　　دو نان درمیدند، کریماں کرمیدند

نثر۔ گرچہ عمرم بجہاں بیہودہ گردیدہ فرنگیدم و ترکیدم و تاتیدم و گرجیدم و روسیدم ولزگیدم و بے فائدہ گشتم ...... پس ازیں دست من و دامن آں طائفہ کز ہمت ایشاں بخردجم زصفاہاں و شیرازم و آں گاہ حجازیدہ و حجیدہ، زیارت کنم مقبرہ پاک شہدا را ....

مضمون کی طوالت کا خوف مزید انتخاب سے باز رکھتا ہے۔

خود طرزی افشار کے متعلق رسالہ ایران شہر لکھتا ہے :۔

"طرزی افشار یکے از شعرائے اواخر قرن دہم ہجری، ادیبے است آتش زبان و سخنورے است بلیغ البیان کہ معاصر شاہ عباس کبیر و در دربار سلطنت رتبہ و مقام عالی داشتہ است تولدش در یکے از دہات ارومی "طرزی" نام بود"

لیکن پروفیسر تسلیم صاحب کی دوسری تحریک کسی قدر ترمیم طلب ہے۔ میرے سامنے اس وقت وہ مضمون نہیں ہے ورنہ اصل عبارت نقل کرتا ـــــ بہرحال تجویز یہ تھی کہ (ث، س، ص) کی جگہ (س) باقی رہے، (ذ، ز، ض، ظ)، سب کے بجائے صرف (ز) کافی ہوگا، (ح، ہ) میں سے (ہ) لے لیا جائے وغیرہ اور باقی ترک کردئے جائیں مگر اس میں بڑی قباحت یہ ہے کہ ہم شکل الفاظ کی کثرت کم نہ ہوگی جو مبتدیوں کے لئے الجھن کا باعث ہوگی۔ چنانچہ اگر (ز) کا استعمال ہو تو اس کے ہم شکل (ر، ڑ، ژ) بھی موجود ہیں اور ان میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ اسی بنا پر اگر حرف کے انتخابات میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ جہاں تک ممکن ہو الفاظ کی ہمشکلی بھی جاتی رہے تو نامناسب نہ ہوگا تاکہ امکانی حد تک ہر حرف دوسرے سے ممتاز شکل رکھنے والا ہو اسی لئے:-

(ت اور ط) میں سے (ط) کا انتخاب ہونا چاہیئے کیونکہ (ت) کے ہمشکل (ب، ٹ، ث) بھی موجود ہیں۔

(ث، س، ص) میں سے (س) کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ہمشکل صرف (ش) ہے۔

(ح، ہ) میں سے (ہ) کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

(خ، ق) میں سے (ق) کو لینا چاہیئے[1]۔

(ذ، ز، ض، ظ) میں سے (ض) کا انتخاب بہترین ہے کیونکہ اس کا ہمشکل باقی ہی نہیں رہتا

میری ذاتی رائے میں (ا، ع) دونوں کا باقی رکھنا ضروری ہے۔

اب ہمشکل الفاظ:-

(ب پ ت ٹ ث) میں سے (ب پ ٹ) رہ جاتے ہیں۔

---

[1] دکن میں غالباً خ کی جگہ ق اور ق کی جگہ خ بولتے ہیں۔ مدیر۔

(ج چ ح خ) میں سے صرف (ج چ) مستعمل ہونگے۔

(د ڈ ذ) میں سے (ذ) حذف ہوجاتا ہے۔

(ر) کی جنس میں سے (ز) کم ہوجاتا ہے۔

(ض) کا ہم شکل سوائے اس کے کوئی نہیں رہتا کیونکہ (ص) کے عوض (س) منتخب کیا گیا ہے۔

(ط ظ) میں سے صرف (ط) باقی رہا۔

اس طرح ۳۵ حروف میں سے ۲۷ رہ جائینگے جو بڑی سہولت کا باعث ہوگا۔

ہمشکلوں کی بحث میں ایک نئی بات ظاہر ہوتی ہے وہ (د) اور (و) کا طرز تحریر ہے مطبوعہ خصوصاً باریک کتاب میں ان کا فرق اس قدر کم نمایاں رہتا ہے کہ ایک لفظ کو (دد) اور (دو) اور (ود) اور (وو) سب پڑھ سکتے ہیں زیر زبر کا فرق اسکے علاوہ ہے۔

اس سلسلہ اصلاحات میں اگر ساتھ ساتھ دال اور واؤ کی اصلاح بھی ہوجائے۔ تو اُردو پر بڑا احسان ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ (د) یا (و) کے لئے نئی شکل وضع کرنے کے بجائے ان میں ذرا اصلاح دیکر امتیاز پیدا کردینا بہتر ہوگا۔ چنانچہ اگر (و) کو آئندہ (و) لکھا جائے تو سر حرف کی سفیدی امتیاز کے لئے کافی ہوگی۔



اگر مجوزہ اصلاحوں کو فوراً رائج کردیا جائے تو بھی کوئی دقت پیش نہ آئیگی کیونکہ اُردو میں ایسے الفاظ بہت کم ہیں جو ہم تلفظ تو ہیں لیکن ہمشکل یا ہم معنی نہیں ہیں۔ اب تجویز ۲ کے عملدرآمد سے چند الفاظ میں ہم تلفظی کے ساتھ ہمشکلی بھی آجائیگی مثلاً ثواب، صواب۔ حال، ہال وغیرہ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ بات اب بھی اُردو میں پائی جاتی ہے مثلاً سِل (ایک بیماری بھی ہے اور ایک پتھر کا آلہ بھی ہے) سال (برس کو بھی کہتے ہیں اور ایک قسم کا درخت بھی ہوتا ہے) غرض جدید تحریک سے صرف یہی ہوگا کہ چند الفاظ کے ایک سے زائد معنی ہوجائینگے جو نامناسب تو کیوں بلکہ اور بلاغت کا باعث ہوگا۔ عربی انگریزی میں ایک ایک لفظ کے آٹھ آٹھ دس دس مختلف معنی ہوتے ہیں تو کیوں اُردو میں ایسا نہ ہو؟ عربی اور انگریزی میں جب یہ بات بلاغت سمجھی جاتی ہے تو کیوں وہی

بات اُردو میں قابلِ اعتراض سمجھی جائے؟

یہاں مثال کے طور پر ایک چھوٹی سی عبارت آئندہ ہونے والے طرز میں درج کرتا ہوں جس کے متعلق پیشینگوئی کی جاسکتی ہے کہ اب سے پچیس تیس سال بعد یہی مروجہ اُردو ہوگی:-

ایک حساب داں جج کی ضہانط عجیب غریب ظھی ایک مرطبہ اسکے پاس مقدما یا گیا۔ حال دریافطنے پر کہا گیا کہ دو شقس بیٹھے ہوئے ظھے۔ ایک کے پاس طین روٹیاں ظھیں دوسرے کے پاس پانچ۔ اطنے میں ایک طیسرا جو مسافر معلوم ہوطا ظھا آموجود ہوا۔ دونوں نے دعوط دی اور طینوں نے مل کر ناشطہ قطما یا۔ مسافر چلطے وقط آٹھ درہم دے گیا جسکے مطعلق جھگڑا شروع ہوا۔ پہلے نے طجویض کی کہ درہم آدھے آدھے بانٹ لئے جائیں لیکن دوسرے نے کہا کہ روٹیوں کا لحاض کرطے ہوئے پہلے کو طین درہم ملیں اور مجھ کو پانچ۔

جج نے پہلے آدمی سے کہا۔ دوسرے کی طجویض قبول کرطے ہوئے طین درہم لے لو ورنہ ایک ہی ملیگا۔ وہ اس طرح کہ کل ۸ روٹیاں ظھیں اور طین کھانے والے۔ روٹیوں کے ۲۴ ٹکڑے کرکے ہرایک آٹھ آٹھ کھائیگا۔ یہ معلوم نہیں کس نے ضیادہ کھایا اور کس نے کم۔ اس لئے فرضنا چاہیئے کہ ہرایک کھانے میں برابر ظھا۔ پہلے کے پاس طین روٹیاں ظھیں انکے نو ٹکڑے ہوئے دوسرے کی پانچ کو پندرہ میں ٹکڑایا گیا۔ اب ہرایک نے آٹھ کھائے حالانکہ پہلے کو نو دوسرے کو پندرہ کھانا چاہیئے ظھا یا دوسرے الفاض میں پہلے نے اصل سے ایک ٹکڑا اور دوسرے نے سات ٹکڑے کم کھائے۔ اب آٹھ درہم طقسیم طلب ہیں پہلے کو معاوضے میں ایک دوسرے کو سات دئے جانے چاہئیں۔ دونوں حضرات اسکو سن کر ٹھنڈے پڑے اور دوسرے شقس کی طجویض کے موافق طین اور پانچ درہم لیکر چلے گئے اور جھگڑا بالکل نہ رہا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کالج سے سُنا ہے کہ عنقریب ایک آرگن رسالے کی صورت میں نکلنے والا ہے اور لامحالہ اسکی ادارت میں پروفیسر سلیم کو بھی دخل ہوگا۔ انہیں بہت اچھا موقع حاصل ہے کہ اپنی ان مفید تجویزوں کو عملی صورت دینے کی کوشش کے سلسلے میں ہر نمبر کے دو ایک صفحے اصلاح شدہ رسم الخط میں لکھایا کریں۔ بعد میں اضافہ کرتے کرتے پورا رسالہ اسی طرز کا کردیا جاسکتا ہے۔ اور واقعی یہ کارنامہ اُردو کی سلامتی کے لئے بہت اہمیت رکھنے والا ہوگا۔ اسی وجہ سے میں نے اس تحریک کا نام سلیمیات تجویز کیا ہے۔ فقط۔

"کلدار"

خواب کی دُنیا کا ایک گیت

دولت کے ایوانوں سے دُور، عشرت کے کاشانوں سے دُور، دُنیا کے ہنگاموں سے دُور
پھُولوں کا ہے اک گھونسلا
جس میں بسیرا ہے مرا
جو لیلیٰ دل کے لئے کچھ کمتر از محمل نہیں

۲

بزمِ چمن خاموش ہے، خاموش ہے مدہوش ہے، اک کیف در آغوش ہے
اعجازِ نیرنگِ سکوں
یا حسنِ دلگیرِ فسوں
ہر چار سُو ہے آشکار اس بزم میں کیا دل نہیں؟

۳

اس بزم میں ہے گھونسلا ننھا سا، پھولوں سے سجا، مسکن مرا مامن مرا
جس میں دلِ بیتاب کو
اس قطرۂ سیماب کو
حاصل ہو سامانِ سکوں یہ درخورِ محفل نہیں

۴

لیکن سکوں اس کو کہاں؟ شاید کہ ہیں اس میں نہاں انداز محشر کے نشاں
یہ کس لئے سوتا نہیں؟
یہ کس لئے بیتاب ہے؟
سوتی پڑی تھی نیند بھی کچھ پھڑ پھڑائی اُڑ گئی
کیا یک بیک اس کو ہُوا؟ کِس نے اِسے چونکا دیا کِس نے اسے تڑپا دیا؟

اک طائرِ مستور کے
نغماتِ نامعلوم نے

۵

میں نے کہا بیتاب دل! اے گوہرِ نایاب دل! اے غیرتِ سیماب دل!
خاموش ہاں خاموش ہو
آ اور دیکھ نیرنگِ جہاں
جلوے شعاعِ مہر کے پتّوں کے محمل میں چھُپے ہیں لُطفِ خلوت لے رہے
بُعدِ مسافت سے تھکی، ندی بھی ہے ٹھہری ہوئی شاید کہ ہے سستا رہی
موجِ ہوا خاموش ہے، ساری فضا خاموش ہے
تو ہے کہ حسرت کوش ہے
کیسی ہے آخر یہ خلش؟ کیسی ہے آخر یہ تپش؟
دل میں ترے کانٹا ہے کیا؟
سینے میں تو رکھتا ہے کیا؟
ٹوٹی ہوئی اُمید کے جذباتِ غم انگیز نے؟
محرومیٔ جاوید کے فکرِ تحسّر ریز نے؟
کس نے تجھے چونکا دیا؟
کس نے تجھے تڑپا دیا؟
اک طائرِ مستور کے نغماتِ نامعلوم نے!

۶

اے بے قرارِ زندگی، اے دلفگارِ زندگی یہ سبزہ زارِ زندگی
جس میں ہے تیرا گھونسلا
اک خطۂ بے نام ہے اک گوشۂ آرام ہے
دولت کے ایوانوں سے دُور عشرت کے کاشانوں سے دُور، دنیا کے ہنگاموں سے دور

آ اور یہاں آباد ہو
آباد ہو دلشاد ہو
اس خطۂ بے نام کی ہے شان ہی کچھ اور سی
اس گوشۂ آرام کی ہے آن ہی کچھ اور سی
مدہوشیوں کا دَور ہے خاموشیوں کا دَور ہے، بے ہوشیوں کا دَور ہے
ہر چار سو چھایا ہُوا
شاید کہ ہے اس دیس میں سحر سکوں بکھرا ہُوا
مدھم سی پھیکی روشنی ہے ہر طرف پھیلی ہوئی
کوئی صدا اُٹھتی نہیں کوئی ندا اُٹھتی نہیں
بے خود سبھی کو کر دیا
اک طائرِ مستور کے نغماتِ نامعلوم نے

۷

اس خواب کی بستی میں اب
دُنیا کی آبادی سے دُور سامانِ بربادی سے دُور
میں نے بسیرا کر لیا
میں بے نیازِ عشق ہوں میں بے نیازِ حُسن ہوں
سوز و گدازِ عشق کے چرچے کبھی سنتا نہیں
ناز و نیازِ حُسن کے نغمے کبھی سنتا نہیں
مجھ پر کیا ہے کیا اثر؟
اک طائرِ مستور کے نغماتِ نامعلوم نے!

تصدق حسین ایم اے

فلسفۂ علم الحیات

حیوانات کے جسمانی ارتقاء اور ترکیب عضوی کو معلوم کرتے وقت ہر متعلم علم الحیات کو چاہیئے کہ محض واقعات کا مشاہدہ ہی نہ کرے بلکہ اُنکے مشاہدوں سے اصول اور نتائج مستنبط کرنیکی سعی بھی کرے جس علم میں ایسے متنبط اصول پر بحث کیجاتی ہے اُسکو فلسفۂ علم الحیات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ اصول چند مثالوں سے واضح ہوجاتے ہیں اور اُن میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجایش نہیں رہتی۔ کبھی کبھی وہی اصول ظاہراطور پر واقعات پر منطبق نہیں ہوتے۔ ایسے موقع پر صرف قیاس سے کام لیکر انکی صحت کے متعلق رائے قائم کیجاسکتی ہے۔ مختلف واقعات اور اُنکے مشاہدوں سے جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اُنہیں بیان کرتے وقت یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ واقعہ ایک اَور چیز ہے۔ نتیجہ اَور چیز۔ اِن دونوں میں فرق ہونیکی وجہ واقعہ کی قطعیت کی طرح نتیجہ کا قطعی ہونا کوئی امر لازمی نہیں ہے۔ آپ نے ایک واقعہ کو ایک نقطۂ نظر سے دیکھا دوسرے نے ایک اَور نقطۂ نظر سے اُسی کا مشاہدہ کیا تو ممکن ہے کہ رائے میں اختلاف ہو۔ اس لئے جب کوئی اصول پیش کئے جاتے ہیں تو ہمکو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا وہ اصول واقعات اور عقلی دلائل پر مبنی ہیں یا نہیں۔ فلسفۂ علم الحیات کا کام یہ ہے کہ واقعات کی جانچ پرتال کرکے دکھایا جائے کہ کن کن واقعات سے کون کون اصول وضع ہوئے ہیں اور کن اصول سے آسانی کے ساتھ حقیقت حال کا انکشاف ہوتا ہے۔ ہر حیوان کی جسمانی بناوٹ اُسکا ارتقاء۔ دوسرے حیوانات کے ساتھ میل جول۔ مقام پناہ و مسکن اور اسکے ماحول کی حالت کو تشفی بخش طریقہ پر بیان کرنا اس فلسفہ کا کام ہے مثلاً اصولِ تنازع للبقاء کو لیجئے۔

۲

تنازع للبقاء۔ ہر قسم کے نباتات اور حیوانات کی زندگی اور نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ خاص ماحول اور خاص مقامِ پناہ ہو۔ جہاں غذا۔ روشنی اور پانی کا کافی بندوبست ہو ایسے

ماحول کے حاصل کرنیکی غرض سے اِن میں باہمی تنازع ہُوا کرتا ہے۔ اسکو سمجھنے کے لئے باغ کے ایک حصّہ کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے اور دوسرے حصّوں کی طرح اُسکی نگہداشت نہ کرکے آزمانا چاہیئے کہ کیسے خودرو درخت گھاس اور پودے اُگ آتے ہیں اور دوسرے اصلی پودوں کو کس طرح مار ڈالتے ہیں۔ حتیٰ کہ باغ کے ابتدائی اصلی پودوں کا پتہ ہی نہیں چلتا اور انکی جگہ دوسرے پودے اور اشجار نمودار ہوجاتے ہیں۔ ڈارون نے اپنے تجربہ کے لئے ایک قطعۂ زمین کو اس طرح مختص کرکے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ بہ نسبت اس مقام کے جسکو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے ایسے محصور مقام میں بہت زیادہ پودے اُگ آتے ہیں۔ اگر اس خاص قطعۂ زمین میں بھی اسکی خاص نگہداشت نہ کیجائے تو قوی پودے برابر نازک پودوں کو ملیامیٹ کرنیکا باعث ہوتے رہتے ہیں۔ ڈارون نے جس قطعۂ زمین میں یہ تجربہ کیا ہے اس میں پچاس فیصدی ایسے پودے مرگئے تھے۔ جن کی حالت نگہداشت تک اچھی رہی ٭

پودے نہ صرف اپنے ہمجنسوں سے تنازع کرتے ہیں بلکہ اُنکو حیوانی دشمنوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے بہت سے ایسے بیج والے پودے ہیں کہ جن کی نسل اُنکے بیج سے قائم رہتی ہے انکو کیڑے کھا جاتے ہیں یا اور جانور۔ ڈارون نے ایک اور قطعۂ زمین کو جوت رکھا تھا کہ بیج والے پودوں کی فنا و بقا کا مشاہدہ کرے۔ تجربہ سے معلوم ہُوا کہ کیڑوں نے ۴/۵ حصہ کو ضائع کردیا۔ پودوں کے دشمن ادنیٰ کیڑے ہی نہیں ہوتے بلکہ دودھ دینے والے نبات خور بہت سے ایسے بڑے جانور ہیں جو انہیں کھا جاتے ہیں۔ چوپائے کا کسی مُلک کی نباتی حالت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ اُن مقامات میں جہاں محصور صحرا واقع ہیں۔ یہ دیکھا گیا کہ جب بکروں کو وہاں داخل کیا گیا تو وہ صحرا بتدریج برباد ہوگئے۔ آگے جو گھنا جنگل اور دلچسپ مرغزار تھا اب ویران لق و دق میدان ہو کر رہ گیا ہے۔ جہاں کہیں بیج دار پودے اُگ آئے وہاں بکرے جا پہنچے اور اُنکو ہضم کر گئے کھنگی یا کسی اور سبب سے جو پودے فنا ہوجاتے ہیں اُنکی جگہ پر نئے پودے نہیں اُگ سکتے۔ ڈارون نے یہ بھی تجربہ کیا ہے کہ جب کسی قطعۂ زمین کو محصور کرنے سے وہاں بہت زیادہ پودے اُگ آتے ہیں تو غیر محصور قطعۂ زمین پر کم عمر پودے بھی اچھی طرح پنپ نہیں سکتے۔ کیونکہ چوپائے اکثر انہیں کھا جاتے ہیں ٭

حیوانات کو بھی نباتات کی طرح بقا کے لئے تنازعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عموماً تمام جانور اور خصوصاً ادنےٰ طبقوں کے جانوروں کے انڈے اور جنین قبل اسکے کہ میدان تنازع میں قدم رکھیں برباد ہو جاتے ہیں۔ اکثر ادنےٰ جانوروں میں سالانہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں انڈے دینے والے جانور ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت ہی کم ایسے ہیں جو جوانی کو پہنچتے ہیں۔ اُن کی زیادہ تر تعداد کسی نہ کسی درجۂ ارتقاء پر پہنچ کر ضائع ہو جاتی ہے۔ اور چند موزون ماحول تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے اور چند دوسرے جانوروں کا لقمہ بن جانے کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ چھوٹے جانور جن میں اپنے ماحول کے مطابق اپنی ہیئت کو بنانیکی قابلیت ہوتی ہے دشمنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن وہ جانور جن میں ایسی قابلیت نہیں ہوتی بہت جلد ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک شکل ہے حیوانات میں تنازع للبقاء کی۔ اسکے علاوہ ایک اور قسم کا تنازع للبقاء ہوتا ہے۔ جو ہمجنس حیوانات میں نہیں بلکہ غیر جنس حیوانات میں بھی ہوتا ہے۔ جو تنازع ہمجنس حیوانات میں ہوتا ہے وہ بہت نمایاں اور شاندار ہوتا ہے کیونکہ انکے مقام پناہ غذا اور بود و باش میں کوئی فرق نہیں ہوتا اس لئے ہر ایک انکو حاصل کرنیکی غرض سے ایکدوسرے سے لڑتا ہے۔ جو تنازع غیر جنس حیوانات میں ہوتا ہے وہ ایسا نمایاں نہیں ہوتا۔ مثلاً گوشت خور اور نبات خور جانوروں میں سے اگر ایک میں قوت حملہ ہوتی ہے تو دوسرے میں قوت فرار اور دشمن سے بچنے کی طاقت ایک کو مقابلہ کرنیکے لئے سینگ ہوتے ہیں تو دوسرے کو مدافعت کے لئے مناسب اعضاء۔ اسی طرح ایک اور قانون اتحادِ للبقا بھی ہے۔

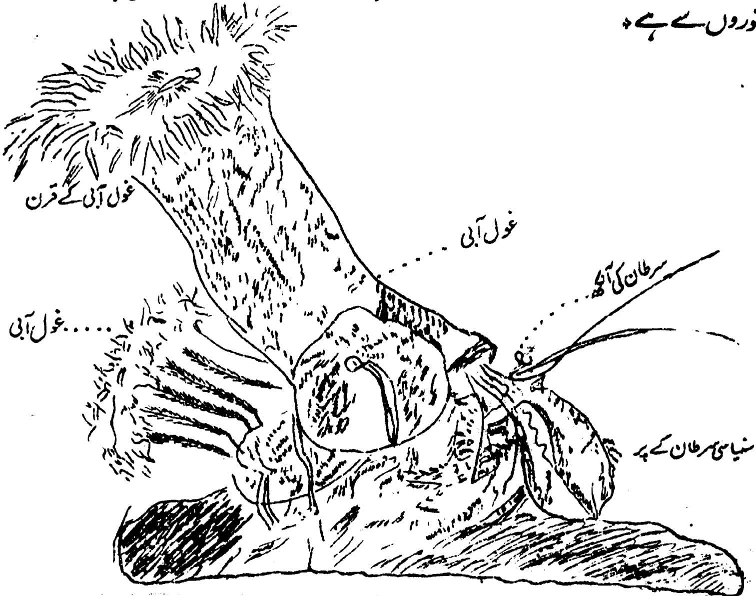
اگر انسان قدرت کے کرشموں کو سمجھنے کا ارادہ کرے تو دنیا میں بہت سی ایسی مثالیں ملینگی۔ کہ جن سے کچھ نہ کچھ اصول قدرت کی وضاحت ہوتی ہے۔ ہم ذیل میں چند مثالیں دیکر اتحاد للبقاء کے دلچسپ اصول کی توضیح کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ جس اصول کے زیر اثر دو مختلف اور متبائن جنس کے حیوان باہمی امداد سے ایک ہی جگہ زندگی بسر کرتے اور ایک ہی وقت غذا حاصل کرتے ہیں اسکو اتحاد للبقاء کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ اصول اُس اصول کے بالکل متضاد معلوم ہوتا ہے جس کے زیرِ اثر ہمجنس حیوانات اکھٹے ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

کند ہمجنس باہمجنس پرواز   کبوتر با کبوتر باز با باز

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں اصول قانونِ قدرت کے خلاف نہیں ہیں کیونکہ اصل قانونِ قدرت تو یہی ہے کہ جہاں کسی حیوان نے اس عالمِ فانی میں قدم رکھا مشکلات نے آن گھیرا اور آخرکار اُسکی حیات کے لمحوں پر موت کا قبضہ ہو جاتا ہے کُلّ نفسٍ ذائقۃ الموت۔

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے   زندگی موت کے آنکی خبر دیتی ہے

اس لئے ہر حیوان یہ کوشش کرتا ہے کہ دنیا میں جبتک ممکن ہو زندہ رہے اور اگر مر بھی جائے تو اپنے پیچھے اپنی نسل چھوڑ مرے تاکہ اگر اپنی بقا نہ سہی تو کم ازکم اپنی نسل ہی باقی رہے۔ اصول اتحاد للبقا ادنیٰ درجہ کے حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ ایک قسم کا کیکڑا جس کو انگریزی میں ہرمٹ کریب (HERMIT CRAB) یا سنیاسی کیکڑے کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ اپنی بقا کیلئے غول آبی یعنی شقایق النعمان بحری SEA-ANEMONE ADAMSIA-PALLIATA کو اپنے اوپر بٹھالیتا ہے یا یوں کہئے کہ غول آبی اس سرطان کی پشت پر سوار ہوا کرتا ہے۔ سرطان اور غول آبی مختلف النوع جانور ہیں سرطان حیوانات قشری (CRUSTACEA) سے یعنی چھلکے دار جانوروں سے ہے۔



اور غول آبی حیوانات جوفیئہ میں داخل ہے جن کے اوپر کوئی چھلکا نہیں ہوتا۔معمولی سرطان چل پھر سکتا ہے۔ لیکن اسکو پانی میں ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں مچھلی اسکو اپنا شکار نہ بنالے اس لئے اکثر کیکڑے پانی کے کنارے اپنے گھر بنا کر رہا کرتے ہیں۔ اور صرف تھوڑی ہی دیر کے لئے پانی میں تلاشِ غذا کے لئے جاکر واپس ہوجاتے ہیں لیکن یہ سرطان جسکا نام سنیاسی کیکڑا ہے بے روک ٹوک پانی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتا رہتا ہے اسکو کسی چیز کا خوف و خطر نہیں (شاید اسی بیباکی کی وجہ سے ماہرین علم الحیات نے اسکو سنیاسی کا موزوں خطاب دیا ہے) آخر وہ کونسے اسباب ہیں کہ جن سے یہ سنیاسی کیکڑا اس قدر بے خوف او نڈر رہے۔

اس کی پیٹھ پر چمکدار رنگ کا خوبصورت غول آبی سوار رہا کرتا ہے جسکے منہ کے اطراف شعاعِ آفتاب کی طرح پھیلے ہوئے زہریلے قرن ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر ایک مچھلی غول آبی کو دُور ہی سے سلام کرکے الگ ہوجاتی ہے اور کبھی جرأت نہیں کرتی کہ اُسکو اپنا شکار بنائے۔ اسکی پناہ میں سنیاسی کیکڑا نہایت آسانی سے زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن ہم کو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ صرف کیکڑے ہی کے مفاد کے لئے غول آبی اس کی پشت پر سوار ہوتا ہے بلکہ اس میں غول آبی کی بقاء حیات کا راز بھی مضمر ہے۔ غول آبی ایک ہی جگہ رہ کر اپنی غذا حاصل نہیں کرسکتا اور نہ اس میں کیکڑے کی طرح قوت حرکت موجود ہے۔ اس لئے دونوں جانور گو مختلف النوع ہیں لیکن باہمی اتحاد سے ایک دوسرے کے آرام و آسائش کا سبب بنتے ہیں۔ زندگی کی اس کیفیت کو انگریزی میں کمینسلزم (COMMENSALISM) کہتے ہیں جس کو ہم نے تعاون للبقا کے نام سے موسوم کیا ہے۔

"قانون تعاون للبقاء" نہ صرف حیواناتِ ادنیٰ ہی میں بلکہ اعلیٰ ترین حیوانات یعنی اشرف المخلوقات میں بھی پایا جاتا ہے۔ ایسی دو مثالیں صرف ناظرین کی دلچسپی بڑھانے کے لئے نہیں بلکہ اُس کی اہمیت کے انکشاف و ہمہ گیری کے اظہار کے لئے پیش کیجاتی ہیں حیدرآباد کے محلہ عثمان شاہی میں دو فقیرنیاں ایسی دیکھی گئیں جن میں سے ایک مادر زاد اندھی ہے اور دوسری مادر زاد گونگی اندھی گونگی کا ہاتھ تھامے ہوئے چلتی ہے۔ گونگی جہاں کوئی مکان یا دکان دیکھتی ہے کھڑی ہوجاتی ہے۔ اندھی صدائے دردیشانہ بلند کرتی ہے تو دونوں کو کچھ نہ کچھ بھیک ملجاتی ہے۔ قربان جائیں

اُس مقننِ حقیقی کے کہ کیسا بہترین قانون سکھایا۔ کیسا لاجواب اصول بتایا۔ دونوں مادرزاد معذور ہیں۔ باوجود اس تبائنِ حال کے دونوں نے ایک دوسرے کی استعانت اور امداد سے زندگی کو برقرار رکھنے کا طریقہ نکال ہی لیا۔

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے باغ عامہ (حیدرآباد) کے نزدیک ایک فقیر پاؤں کا معذور ہے اور دوسرا آنکھوں سے محروم۔ لنگڑا اندھے پر سوار ہوتا ہے۔ اندھا بالکل سوار کے کہے اور اشارے پر چلتا ہے۔ جہاں مانگنا مقصود ہو لنگڑا اشارے سے اندھے کو ٹھیرا دیتا ہے۔ دونوں مل کر بھیک مانگتے ہیں۔ جو کچھ کھانے کو ملتا ہے ایک جگہ بیٹھ کر آپس میں تقسیم کر کے کھا لیتے ہیں یا دونوں ہم نوالہ (COMMENSALS) ہوتے ہیں۔

سید احمد علی کرمانی

بی اے (عثمانیہ)

اقوالِ زرّیں

کوئی شخص دھکا کھائے اور دھکا دئے بغیر زندگی بسر نہیں کرتا۔ اُسے جمِ غفیر میں کہنیوں سے اپنا راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ وہ کبھی دوسروں کو دھکیلتا ہے۔ کبھی دوسرے اُسے دھکیلتے ہیں۔

تیری یہ زندگی اصلی ہے تیری زندگی حقیقی ہے اور یاد رکھ کہ قبر اُس کا ٹھکانا نہیں تیرا جسم مٹی ضرور ہے اور اسی لئے وہ مٹی میں مٹی ہو جائیگا لیکن تیری روح تو تیرا جسم نہیں۔

زندگی کیا ہے؟ طوفانی پانیوں کی ایک خلیج جہاں ہماری روح ایک طوفان زدہ کشتی کے مانند خوشی اور غم کی لہروں کے تھپیڑے کھاتی ہے اور جذبات کی بادِ مخالف کے بیچوں بیچ رواں ہے۔

(گلچیں)

سرگوشیاں

امارت کا تحفہ - جب میں ایسے لوگوں کے درمیان ہوتا ہوں جو میرے ملازم یا ماتحت ہیں یا جنہیں مجھ سے مادّی فوائد پہنچتے ہیں یا جنکی آسائیشوں کا انحصار درصل یا بظاہر مجھی پر ہے تو بعض اوقات اپنے رویے کو ملاحظہ کر کے میں شرمسار ہو جاتا ہوں + وہ پاس سے گذرتے ہیں تو مجھ میں اور اُن میں اک غیر معمولی تبدیلی جو ہمارے تعلقات کا معمول بن گئی ہے واقع ہوتی ہے۔ سلام آداب کی مصیبت تو خیر ہر بار سہنی پڑتی ہے۔ اُنکی مصنوعی مسکراہٹ اور میری فطرتی متانت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اگر کبھی میں اکیلے دُکیلے مسکرا رہا ہوتا ہوں تو انہیں جھانک کر فوراً اپنے تبسّم کو سمیٹ لیتا ہوں۔ وہ نوع انسان میں سے نہ ہوتے جنّوں یا جانوروں کی جنس سے ہوتے میں نے اُنہیں اپنے خداداد حق سے تسخیر کیا ہوتا تو اور بات تھی لیکن دقت یہ ہے کہ وہ بھی انسان میں بھی کالے گورے کا امتیاز بھی تو نہیں (بجز بیچارے خاکروب کے جو گویا ہر شریف و رذیل کا ازلی نوکر ہے) ہاں اک زر خرید تعلیم کا فرق ضرور ہے اور شاید اسی پر اُن میں سے بعض کی خاموش قسمت زیادہ دانت پیستی ہے +

میرا اُنکا یکجا ہونا طرفین کیلئے تکلیف کا باعث ہے پھر میں نہیں سمجھتا یہ کیسی بے معنی حکومت اور بیہودہ غلط فوقیت ہے۔ جو اپنا آرام نہیں پا سکتی اپنی تسلی نہیں کر سکتی۔ کبھی اُنکے بچّے باہم مل کر کھیل رہے ہوتے ہیں کہ میں جا نکلتا ہوں صرف پاس سے ہو کر گذرنے کو ہوتا ہوں کہ جناب حضور کہکر میرے پیچھے پیچھے آتے ہیں میں تیور بدل کر تیز چلنے لگتا ہوں غریب جھجک کر گردن جھکا لیتے ہیں +

میرا گذر میری آمد اُنکے لئے زندگی کا اک واقعہ ہوتا ہے۔ میں بھی سانس لینے والا وہ بھی میری بھی دو ٹانگیں اور تمام وہی اعضا جو اُنکے۔ میں بھی بیمار ہو جاتا ہوں اُن سے زیادہ دوائیں کھاتا ہوں اُنکے ہاں ڈاکٹر مفقود میرے ہاں ہر وقت موجود۔ گویا یہ بھی امیرانہ رُعب کی اک نشانی ہے۔ میں علیل ہو جاؤں تو صرف یہی نہیں کہ ان لوگوں کا فکرمند ہونا ضروری سمجھا جائے۔ اُنکا میرے حق میں دُعا کرنا بھی ضروری ہے۔ کبھی کبھی دل سے دُعا کرنے پر بھی شاید مجبور ہوتے ہوں کیونکہ اُنکی روزی میری زندگی کے ساتھ ایک حد تک متعلق ہے۔ مجبوری کا عنصر یہاں بھی ہے۔ قصّہ کوتاہ میری شکل نہ دیکھ کر وہ جانداروں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن مجھے دیکھ کر خوف سے کھانستے بھی کم ہیں +

کیسے ایسے لوگوں میں میں کیونکر خوش رہوں حالانکہ وہ میری خوشیوں کا خود ساختہ سامان ہیں۔ اگر اُن کا انحصار مجھی پر ہے تو اُن میں رہ کر مجھے بھی آزادی حاصل نہیں +

حقیقت یہ ہے کہ یہ سزا امارت کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے ہزاروں اور سزائیں بھی ہیں!

رشتے دار - ہر شخص اپنے رشتے داروں سے بیزار ہے اور دوسروں کے رشتہ داروں سے مانوس گویا جس سے ایک بیزار ہے اُس سے دوسرا مانوس ہے اور جس سے یہ مانوس ہے اُس سے وہ بیزار۔ حالانکہ نیکیاں ہمیشہ نیک ہیں اور بُرائیاں ہمیشہ بُری حالانکہ اگر کسی میں دوست داری اور محبت کا مادہ ہے ہمدردی کی صفت ہے تو اسکا دروازہ اپنوں پر بند نہ ہونا چاہیئے۔ ہاں ہر انسان دو رُخہ ہے تو اور بات ہے ہر نیکی بُرائی بھی ہے تو خیر۔ اور اگر نیکی فی الواقع اس قدر فریب کار ہے تو پھر بیچارے انسانِ ناہنجار کی کیا مجال ہے کہ یکسوئی کا دعویدار ہو۔

سچ یہ ہے کہ اپنے رشتے داروں سے اچھا برتاؤ کرنا صد درجہ دشوار ہے اور اُن سے اچھے سلوک کی تمنا رکھنا تو قطعی طور پر جہالت ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک عزیز کو دوسرے عزیز کی خوبیاں دکھائی نہیں دیتیں اصل یہ ہے کہ پردے اُٹھ جاتے ہیں اور اصلیت عیاں ہو جاتی ہے۔ انسان میں اتنے عیب ہیں کہ اگر خوبی کوئی شئے ہے تو وہ کم از کم انسانِ شیطان صفت میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ کبھی کسی انسان سے کوئی نیکی ہوئی جسے نیک خدا بھی نیکی کہہ سکا کبھی کسی نے کچھ کیا جس کا مدعا ظاہر یا چھپا ہوا مطلب نہ تھا؟ جس میں غرض کا نامعلوم سا شائبہ نہ تھا؟ (دُنیا کانی الحقیقت ایک آدھ نیک آدمی مجھے معاف فرمائے) کوئی مُحبِ وطن میدانِ جنگ میں کام آیا جو شہرت یا ناموری یا جوش یا خودستائی یا خود پرستی کا پہلے سے شکار نہ ہو گیا ہو؟ کوئی دلگیر اپنے دلبر کا دلدادہ ہوا جس نے صورت یا صحبت یا کسی ایسی ہی وجہ کی قربانگاہ پر اپنے تئیں بھینٹ نہ چڑھا دیا ہو؟ ـــ (نہیں معلوم میں آج اتنے جوش میں کیوں آرہا ہوں لیکن پھر بھی میں کہونگا کہ) ہر شخص کی نیت کا بھید اُسی کو معلوم ہے جسکے سامنے بھید چھپائے نہیں چھپتا گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے اور جو اس لنکا کو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ لنکا ڈھانے کے قابل ہے۔

ہم دوست کو دیکھکر مُسکرا دیتے ہیں ہمارا عزیز جانتا ہے کہ ہماری مسکراہٹ کی گہرائی کہاں تک ہے! ہم دوست کے ساتھ وہ روزمرہ کی باتیں کرتے ہیں جو بغیر ہمارے کہے ہمارے عزیز کے دل میں ہیں۔ ہمارا دوست چند دن کا وقفہ ڈال کر آتا ہے تو ہمارا چہرہ دیکھ کر ہی بلا وجہ بشاش ہو جاتا ہے عزیز جس موڑ سے نکلتا ہے اُسے عین سامنے ہمارے ہی منحوس چہرے کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ہماری صحت کی خرابیاں ہماری ہمت کی پستیاں ہماری نیت کی خرابیاں سب ہمارے عزیزوں پر عیاں ہیں اور اکثر ہمارے دوستوں سے نہاں۔ دوست تو یہ سُن کر کہ ہمارے سر میں کل درد تھا چند رسمی لفظوں میں اُسکی دوا تجویز کر دیتا ہے لیکن ہمارے عزیزوں سے پوچھئے جنہوں نے ہاری باری سر پر صندل لگایا تلوے سہلائے سونف کھلائی سوڈا پلایا۔ دوست کو مزا ہے کہ گاہے گاہے آکر السلام علیکم کہدیتا ہے بیچارے عزیزوں کا اللہ ہی والی ہے جنہیں کبھی خدا حافظ کہنے کا موقع نہیں ملتا۔ دوست تو آکر ہمیں سجا سجایا دیکھ لیتا ہے لیکن عزیز تو ہر روز منہ دھونے سے پہلے ہمارا منہ دیکھتے ہیں پھر اُنہیں ہم میں کیسا حسن نظر آئے۔ گویا ہم دوستوں کے لئے اک خوش لباس خوش وضع خوش گفتار ہیوی ہیں اور عزیزوں کے لئے اک ترش رُو متکبر بیزار خداوند ـــ خدا کرے کوئی کسی کا عزیز نہ ہو اور سبھی ایک دوسرے کے دوست ہوں!

"باغبان"

محفل ادب

توسیع زبان اور قیود زبان ۔ اخباروں اور رسالوں کی ایڈیٹری معمولی بات ہوگئی ہے اور اُس سے زیادہ معمولی مصورِ فطرت اور علامہ بننا۔ ایسی ارزانیٔ کمال کے زمانے میں اپنی ڈفلی اپنے راگ کے سوا مرکزیت و جمہوریت کا وجود کیا رہ سکتا ہے۔ گزشتہ دور میں جب کہ مرکزیت کی حدود پوری طرح اپنی اپنی جگہ قائم تھیں، ایسی مثالیں تو بکثرت ملیں گی کہ ایک لفظ کو خود دلّی اور لکھنؤ والوں نے انفراداً یا ایک نے دوسرے کے خلاف مذکر یا مونث استعمال کیا ہے، مثلاً طرز، بلبل، سانس، فکر وغیرہ مگر ایسی مثال اُس زمانے میں کہیں نہ ملیگی کہ غلط اور نامقبول الفاظ مثل، پرواہ، نہ ہی، سنسنی خیز، مورخہ ۶ تاریخ کو، باوجود ٹوکنے اور منع کرنیکے یہ کہکر استعمال کئے جاتے ہوں کہ زبان کی توسیع اسی طرح ہُوا کرتی ہے اور ہم اسی اصول کو مدنظر رکھ کر ان الفاظ کا استعمال ضروری سمجھتے ہیں ۔

عہدِ مرکزیت میں صحتِ زبان کی پابندی اس سختی سے کی جاتی کہ کسی کو ایک زبان سے دوسری زبان میں خود رائی سے ترجمہ کرنیکی جرأت نہ ہوتی تھی اور اس میں وہ مسلم الثبوت اساتذہ ٹوک دئے جاتے تھے جن کی تقلید آج کی جارہی ہے۔ تڑکا ہوجانا اُردو کا مشہور محاورہ ہے۔ اُستاد ذوق نے بمجبوریٔ قافیہ اس کو بایں الفاظ موزوں کردیا تھا ع

صبا وہ دھول جمائے کہ بس سحر ہوجائے

بر سرِ مشاعرہ ٹوک دیئے گئے کہ آپکو محاورہ کے ترجمہ کرنیکا حق حاصل نہیں۔ سوچئے اور غور کیجئے کہ بادی النظر میں یہ اعتراض دقیق نظر نہیں آتا۔ اور تڑکے کی جگہ سحر سماعت پر گراں نہیں ہے لیکن اس کا جواز عموماً پسند کرلیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ آنکھ سے دیکھنے کی جگہ چشم سے دیکھنا اور ناک سنکنے کو بینی یا انف جھاڑنا کہنے میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ محاورے کی تجدید بدعت نہیں مگر اسکی ترویج بغیر مقبولیتِ عام ممکن نہیں اور یہیں سے محاورات کی صحت و عدم صحت کا توازن سمجھ میں آسکتا ہے ۔

اُسی زمانے کے دورِ آخر کا ایک یہ حال تھا کہ خلد آشیاں نواب رام پور کے منتخب دربار میں

مُلک کے مشاہیر شعرا جمع تھے جن میں اہل لکھنؤ کی تعداد زیادہ تھی اور والئ ملک پر اُن کا اثر بھی کافی تھا، اُن بتیس دانتوں میں ایک داغ کی زبان تھی جن کے متعلق آج بھی ناواقفوں سے یہ سُننے میں آجاتا ہے کہ رام پور کی صحبت میں داغ نے لکھنؤ کی زبان کا اتباع شروع کر دیا تھا۔ لیکن واقفانِ حقیقت جانتے ہیں کہ اُن کے اس مطلع پر ؎

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھِلی ‌ ‌ ‌ ‌ چمپا کھلی۔ گُلاب کھلا۔ موتیا کھِلی

اہل اودھ نے موتیا کی تانیث کو غلط کہدیا اور ہر طرح داغ کو سمجھانے کی کوشش کی اور ابوالفضل کی طرح خدمتِ زبان کو بسر حد انفراد پہنچانے کا ادعا پیش کرتے رہے مگر داغ عرفی کی طرح یہی کہتے رہے کہ ہم نے آنکھ کھولی تو دِلّی کی بڑی بوڑھیوں کو یہی (مُونث) بولتے سُنا ہے۔ چنانچہ پوری تحقیقات کی گئی اور بالآخر علیٰ بدین العجائز ہی پر ایمان لانا پڑا +

۱۹۰۰ء کا یہ چشم دید واقعہ ہے کہ حیدر آباد میں ایک نو وارد دہلوی خواجہ تاش نے اپنی غزل بنظرِ اصلاح مرزا داغ کو سنائی۔ اس میں ایک محاورہ جان چھڑکنا (قربان ہونا) بندھا ہُوا تھا، سُن کر متحیر ہُوئے اور پوچھا کہ یہ کہاں کا محاورہ ہے اور اسکے کیا معنی ہیں، اُنھوں نے اس کو بمعنی مذکور دہلی کا محاورہ بتایا۔ کہا گیا کہ ہمارے زمانے کا یہ محاورہ نہیں ہے۔ حال کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ داغ کا یہ خیال بالکل صحیح تھا، آج سے تیس چالیس برس پہلے غالباً کوئی صاحب کسی دہلوی شاعر کے کلام میں یہ محاورہ نہیں دکھا سکتے۔ اسی طرح لکھنؤ میں لفظ کی تانیث کا ایجاد ہے جس کا استعمالِ تانیث اللفظیں چند سال سے دیکھا جاتا ہے۔ ناواقفیت سے کسی لفظ کا غلط استعمال کر دینا النسانی سہو میں داخل ہے مگر دانستہ کسی غلط لفظ کا استعمال کرنا اور اُسکو صحیح سمجھنا جہل مرکب کا مرادف ہے۔ پیوستہ ششماہی کو چند روز لکھنؤ میں قیام کا اتفاق ہُوا اور محترمی حضرت ریاض خیر آبادی کے فیضانِ صحبت سے مستفید ہوتا رہا۔ ایک مجمع میں اتفاق سے بعض الفاظ کی تحقیقات جاری تھی منجملہ دوسرے الفاظ کے ایک لفظ "کیسے" بھی تھا جس کا استعمال عوام اور قصباتی "کیوں کر کی" جگہ کرتے ہیں مثلاً "آپ یہاں کیسے آئے"، بعض نوجوانانِ لکھنؤ جن کو ادب شاعری میں کافی مشاقی حاصل ہو چکی ہے وہ بھی عوام قصباتیو کی طرح متذکرہ معنی کا استعمال صحیح سمجھے ہُوئے تھے، لیکن جب اُنہیں سمجھایا گیا اور مخصوص حضرت ریاض نے تصدیق فرمائی تو اُن کو بہت اچنبا ہُوا اور بالآخر ماننا پڑا کہ یہ مستند زبان نہیں ہے۔ لیکن جہاں

مستمع صحیح نہ ہوں اور توسیع زبان کا حجاب اکبر سامنے موجود ہو۔ دشوار ہے کہ وہاں یہ مسئلہ بآسانی طے ہو سکے ؛

حقیقت یہ ہے کہ لکھے پڑھے مضمون نگار اور شاعر کم و بیش ہر زمانے میں پائے گئے اور پائے جاتے رہینگے۔ اور اسی طرح اصطلاحات و محاورات بھی ہر عہد میں نئے پُرانے ہوتے رہینگے۔ مگر یہ نہ کبھی ہوا نہ ہو سکتا ہے کہ دو ایک اہل قلم اور وہ بھی غیر معروف و نامقبول اپنے ایجاد کردہ الفاظ کو مستند کہہ سکینگے۔ اُردو نثر نگاروں کے متقدمین میں سرور، میر امن، انشا، لطف وغیرہم کے بعد مرزا غالب اور اُن سے متصل سر سید اور اُنکے معاصر ذکا، اللہ آزاد اور پھر حالی و شبلی و نذیر احمد وغیرہم جتنے اہل قلم گزر گئے ہیں اُن سب نے کم و بیش دو چار الفاظ ایسے ضرور لکھ دئیے ہیں جن پر اُنگلیاں اُٹھی ہیں اور وہ متفق علیہ تمام اہل قلم میں عمومیت نہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اُن الفاظ کو عام سند قبول حاصل نہیں۔ مثلاً نظم میں مرزا غالب نے دو کا قافیہ وہ باندھ دیا۔ سر سید نے کر کریا چلی پن وغیرہ الفاظ لکھ دئیے۔ حالی نے پیاز اور بیاض کو ہم قافیہ کر دیا۔ نذیر احمد نے لوٹنا واپس آنا لکھ دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض کہ اس قسم کے منفرد یا قلیل الاستعمال الفاظ سند میں پیش کرنیکے لائق نہیں ہوتے ۔

(سہیل)

دوستی۔ جب ایک شخص کسی دوسرے کی خاص قدردانی اور لحاظ کرتا ہے اور بڑے ولولے اور دلی جوش سے چاہتا ہے کہ میری کوشش سے اُسکی ترقی روز بروز زیادہ ہو۔ اور یہی بات دوسری جانب سے بھی ہوتی رہے تو اس کا نام دوستی ہے۔ خدا تو ہمکو یہ حکم دیتا ہے کہ ہم سب کے ساتھ محبت رکھیں۔ لیکن اگر ہم خاص خاص آدمیوں کی قدر و منزلت زیادہ کریں۔ تو یہ اس بات کے خلاف نہیں ہے۔ ہماری طبیعتیں ایسی بنائی گئی ہیں۔ کہ انکو سچے دوستوں کی ہمدردی اور مدد کی بڑی ضرورت ہے۔ اور اس سے جو فائدے اور خوشی پیدا ہوتی ہے اس سے ہر شخص اچھی طرح واقف ہے ایک نامی گرامی حکیم کا قول ہے۔ کہ "دوستوں کے بغیر دنیا محض ایک ویرانے جنگل کے مانند ہو جاتی" کسی کا یہ بھی قول ہے کہ "وفادار دوست ایک بڑی پشت پناہ ہوتا ہے جسکو ایسا دوست ہاتھ آگیا۔ اُس کو قارون کا خزانہ مل گیا" کسی شاعر نے اس بارے میں کہا ہے کہ :۔

پھول بڑے خوبصورت ہوتے ہیں. محبت بھی پھولوں کے مانند ہے دوستی ایک سایہ دار درخت کی طرح ہے جسکے تلے لوگ آرام کے ساتھ پناہ لیتے ہیں دوستی اور محبت اور آزادی کی خوشیاں جو بارش کی طرح نازل ہوتی ہیں کیا ہی عمدہ ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ دوست کے ہونے سے انسان کی خوشی تو بڑھ جاتی ہے اور مصیبت گھٹ جاتی ہے چونکہ دوستی کی خوشی طرفین کو حاصل ہوتی ہے اور چونکہ دوست مصیبت میں شریک ہوجاتا ہے وہ گھٹ جاتی ہے۔ سچا دوست اپنی صلاح مشورے اور مدد سے اپنے دوست کو بڑے فائدے پہنچاتا ہے دوستوں کے صلاح مشورے کی تو یہ کیفیت ہے کہ ضرورت اور تکلیف کے وقت جس قدر فائدہ آدمی کو وفادار دوست کی صلاح سے ہوتا ہے اس سے بڑھ کر کہیں نہیں ہوسکتا۔ ایسے دوست کی رائے اوروں کی نسبت ضرور بڑی بے تعصب ہوگی۔ کیونکہ اس معاملہ میں اس کی کچھ غرض نہیں ہے بہت سے کام ہیں کہ آدمی خود نہیں کرسکتا۔ مثلاً وہ خود ایک وقت میں ایک ہی جگہ رہ سکتا ہے لیکن جہاں اسکے دوست ہیں وہاں وہ آپ موجود نہیں تو نہ سہی۔ اپنے عوض کے وسیلے سے کام کرسکتا ہے۔ کسی شخص کو زیب نہیں دیتا۔ کہ اپنی خوبیوں یا لیاقتوں کی تعریف آپ کرے۔ مگر یہ کام دوست کو بڑا زیب دیتا ہے۔ آخر یہ کہ وہ ایک روز مر جائیگا اور اس کی بہت سی امیدیں اس وقت تک بر نہ آچکیں گی مگر اسکے دوست اس کی موت کے بعد فکر کر کے اسکی آرزوؤں کا لحاظ رکھیں گے۔

(تجلی)

اندھی جوانی

(ایک گیت)

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگور
گھٹائیں کالی کالی
خوب برسنے والی
متوالی

پُرشور
گھٹائیں
چھائی ہیں گھنگور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگور

گلشن کی گلپوش ادائیں آہوں کی خاموش فضائیں
کوئل کی مدہوش صدائیں
بن میں بول رہے ہیں مور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگور

جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات
جوانی ہائے جوانی
سرشوری نادانی
مستانی
بدذات
جوانی
لے آئی برسات
جوانی لے آئی برسات
بیٹھا ہوں راوی کے کنارے کرتا ہوں پریوں کے نظارے
اُف یہ نگاہیں اُف یہ اشارے
چھائی نگہ پر کالی رات
جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات

محبت آہوں کا طوفان محبت آہوں کا طوفان
محبت پیاری پیاری
میٹھی سی بیماری
بے چاری
انجان
محبت
آہوں کا طوفان
محبت آہوں کا طوفان
اک کشتی ملاح سے خالی میں نے اُٹھا طوفان میں ڈالی
اس کشتی کا اللہ والی
پار لگائے گا رحمان
محبت آہوں کا طوفان محبت آہوں کا طوفان

(نیرنگ خیال) ابوالاثر حفیظ
جالندھری

فہرستِ مضامین

(نیاز ۱) ۱۷

جلد ۹ — بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء — نمبر ۹

تصاویر:- (۱) ٹامس الوا ایڈیسن (۲) اکبر مست ہاتھی پر۔

جہاں نُما

امریکہ کے کثیرالاشاعت اخبارات۔ نیویارک کے بڑے بڑے اخبارات کی صحیح تعدادِ اشاعت حسبِ ذیل ہے جس کو ایک مشہور مغربی نامہ نگار نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مجتمع کیا ہے اور حسبِ قانون امریکہ رجسٹرار کے دفتر سے حاصل کیا ہے :-

امریکن (ڈیلی)	۲۵۱۳۶۸	ڈیلی نیوز (سنڈے)	۱۱۲۲۰۶۵
امریکن (سنڈے)	۱۰۳۶۱۱۴	ایوننگ پوسٹ (ڈیلی)	۲۹۴۲۰
گرافک	۹۶۹۶۸	سن (ڈیلی)	۲۵۴۱۸۹
ہیرالڈ ٹریبیون (ڈیلی)	۲۸۱۶۷۲	ٹیلیگرام (ڈیلی)	۱۹۹۵۶۸
ایوننگ جرنل (ڈیلی)	۶۳۵۸۰۵	ٹائمز (ڈیلی)	۳۵۰۴۰۸
مرر (ڈیلی)	۲۴۹۱۴۴	ٹائمز (سنڈے)	۵۷۲۸۱۵
مورننگ ٹیلیگراف (ڈیلی)	۴۵۴۲۸	ایوننگ ورلڈ (ڈیلی)	۳۱۱۴۵۰
” ” (سنڈے)	۵۴۶۳۲	ورلڈ (ڈیلی)	۳۰۹۳۸۶
ڈیلی نیوز (ڈیلی)	۹۲۰۹۵۶	ورلڈ (سنڈے)	۵۶۲۳۸۶

”امریکن اور“ ایوننگ جرنل“ ولیم آر۔ ہرسٹ کی ملکیت ہیں جو ”اخبارات کے بادشاہ“ کے نام سے موسوم ہیں امریکہ کے ہر شہر سے اسکے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ یہ معلوم ہُوا ہے کہ کم از کم بیس ملین آدمی اسکے اخبارات پڑھتے ہیں اس کا اسٹاف ۰۰۰۰۰ ۱۵ ملازمین پر مشتمل ہے اسکا چیف اڈیٹر مسٹر آرتھر برس بین جو ایک انگریز ہے صرف لیڈنگ آرٹیکل لکھنے کے معاوضہ میں دس ہزار ڈالر ماہوار لیتا ہے۔ مسٹر ہرسٹ ایک تجارتی آدمی ہیں اور کسی سیاسی پارٹی سے اُن کا تعلق نہیں اُن کا مقصد تو صرف ایک ہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح روپیہ اُنکی جیب میں آئے، وہ ہر دو مخالف جماعتوں کی سرگرمیوں کی پوری تفصیلات شائع کرتے ہیں اس طرح بلاواسطہ اپنے خریداروں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں۔

انکے اخبارات میں دلچسپی کا کافی مواد ہوتا ہے۔ صاف چھپائی۔ مضامین کی خاص ترتیب انواع و

اقسام کے مضامین۔ سیاسی جماعتوں کے حالات پرائیویٹ مجالس کے تذکروں اور دنیا بھر کی برقی خبروں سے یہ اخبارات لبریز ہوتے ہیں امریکہ میں اکثر اخبارات لمیٹڈ کمپنیوں کے زیر اہتمام شائع ہوتے ہیں

ایک ہندوستان ہے یا ورنیکلر زبانوں کے اخبارات کی اشاعت کہ دو ہزار سے زائد نہیں ہونے پاتی۔ البتہ بنگالی زبان کے بعض اخبارات کی اشاعت دس۔ دس اور بارہ۔ بارہ ہزار ہے اردو اخبارات میں کوئی اخبار تین ہزار سے زائد اشاعت نہیں رکھتا۔

سُنا جاتا ہے کہ دورانِ جنگ بلقان طرابلس میں زمیندار لاہور اور ہمدرد دہلی کی اشاعت بیس بیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں کے سرمایہ دار مالکانِ اخبار اگر کسی اڈیٹر کو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اڈیٹر پر ایک گرانقدر احسان کیا ہے لیکن باوجود اس قلیل تنخواہ کے اڈیٹروں اور ملازمین کو کبھی وقت پر تنخواہ نہیں ملتی اکثر ایک ماہ کی تنخواہیں دو۔ دو ماہ کے بعد بمشکل ادا کی جاتی ہیں یہ واقعات ہیں جنکو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ایڈیٹروں اور ملازمین اخبارات سے اس قدر کام لیا جاتا ہے کہ وہ بچارے خون اور پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن سرمایہ دار مالکوں کے مظالم کبھی کم نہیں ہوتے اور انکے اخباروں میں سرمایہ داری کے خلاف مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن وہ خود انتہا درجہ کے سرمائیہ دار ہوتے ہیں۔

روزہ دافع امراض ہے۔ لندن ویجیٹیرین سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر برٹ رانڈ پی۔ ایلن سن۔ اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ جسمانی امراض سے نجات حاصل کرنے کے لئے روزہ نہایت مفید ہے۔ نیشنل ویجی ٹے ری ان یونین کے زیر اہتمام ویسٹ منسٹر کے سنٹرل ہال میں ڈاکٹر موصوف نے ایک لکچر کے دوران میں کہا کہ بعض شدید امراض کم سے کم تین روز اور زیادہ سے زیادہ چھ روز تک روزہ رکھنے سے جاتے رہتے ہیں اور بعض پرانی بیماریوں کا کامیاب ترین علاج طویل روزہ ہے۔

۴۹ دن کا روزہ۔ سنٹرل نیوز راوی ہے کہ روزہ رکھنے والوں میں برلن کی ایک خوبصورت لڑکی مس لونی نامی دنیا میں سب پر سبقت لے گئی ہے وہ آجکل کولون میں ہے اسکو روزہ رکھتے ہوئے ۴۹ روز بغیر خوراک کے ہو چکے ہیں۔ اس کا وزن ۲۲ پونڈ کم ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک برابر روزہ رکھ رہی ہے سینکڑوں آدمی روزانہ اسکو دیکھنے جاتے ہیں۔

حیوانات اور نباتات کی زندگیوں کا مقابلہ۔ انگلینڈ میں سبزی خوروں کی انجمن نے حال میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ نباتات کی عمر حیوانات سے کئی سو سال زیادہ ہوتی ہے ؛

بعض درختوں کی عمر ۱۰۰ سال سے لیکر چار اور پانچ ہزار سال تک ہوتی ہے۔ چند درختوں کی عمر ذیل میں درج کی جاتی ہے :۔

سرو یا شمشاد	۳۵۰ سال	دیودار	۸۰۰ سال
عشق پیچا	۴۵۰ سال	شاہ بلوط	۱۰۰۰ سال تا ۱۵۰۰ سال
چسٹ نٹ	۶۰۰ سال	سدا بہار	۲۵۰۰ سال

بوباب (BOABAB) ۵۰۰۰ سال

طویل عمر والے جانوروں میں عموماً زیادہ سے زیادہ ایک سو سال کی عمر کے جانور پائے گئے ہیں۔ ہاتھی۔ مگرمچھ اور کچھوا وغیرہ بعض جانور ساٹھ سال سے ۱۵۰ سال تک کی عمر کے پائے گئے ہیں۔ پرندوں میں کوّے اور طوطے پچاس سال سے سَو سال تک کی عمر کے ہوتے ہیں

طویل ترین عمر کا انسان۔ شروپ شائیر کے ایک مزدور ٹامس پار نامی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ طویل عمر کا انسان گزرا ہے مرتے وقت اسکی عمر ۱۵۲ سال تھی ۱۲۰ سال کی عمر میں اس نے دوسری شادی کی تھی ؛

ترکی میں اس وقت دنیا کا سب سے بوڑھا آدمی موجود ہے اس کی عمر اس وقت ۱۵۰ سال کی ہے اس نے آخری شادی ۱۴۲ سال کی عمر میں کی ہے ؛

بچوں کی شرح پیدائش۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال دنیا بھر میں ۴۰۰۰۰۰۰ بچے پیدا ہوتے ہیں ایک ریاضی دان کے حساب کے مطابق گویا ایک منٹ میں بارہ بچے پیدا ہوتے ہیں ؛

امریکہ کی قومی دولت۔ فیڈرل ٹریڈ کمیشن کی ایک رپورٹ بنام کانگریس مظہر ہے کہ یہ تخمینہ

کیا گیا ہے کہ ۱۹۲۲ء میں امریکہ کی قومی دولت کی میزان ۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ۳۵۳ ڈالر تھی اور ۱۹۲۳ء میں قومی آمدنی کی تعداد ۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ۷۰ ڈالر تھی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۲ء تک قومی دولت میں ۷۲ فیصدی کے حساب سے اضافہ ہوتا رہا ہے ؛

وہ لوگ جو کبھی ہنستے نہیں۔ سیلون کی ویدا قوم ایک عجیب و غریب قوم ہے جو دو قابل شہرت خصوصیات کی مالک ہے۔ اول اس قوم کا کوئی فرد ہنسنا نہیں جانتا۔ دوم ان میں سے آجتک کوئی شخص جھوٹ نہیں بولا۔ اور نہ جھوٹ بولنا جانتا ہے ؛

پھولوں کے ذریعے سے شادی۔ الپائن کے دور دراز کے مواضع اور دیہات میں بالخصوص برنیز اور برلینڈ میں ابتک یہ دستور چلا آتا اور یہ خوبصورت رسم پائی جاتی ہے کہ شادی پھولوں کے انتخاب کے ذریعے سے طے پاتی ہے اگر ایک کنواری لڑکی نایاب پھولوں کا گلدستہ ایک مرد سے قبول کرے تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اس مرد کو بطور عاشق کے منظور کرلیا ہے وہاں کے لوگ ان نایاب پھولوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگی تک کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں ؛

ایک دوسرا طریقہ گلارس کی چھاؤنی میں رائج ہے کہ نوجوان مرد پھولوں کی ایک پلیٹ میں گلاب کا ایک پھول رکھ کر جس لڑکی سے وہ شادی کرنا چاہتا ہے اس لڑکی کے کمرے کے دریچہ میں وہ پلیٹ اسکی عدم موجودگی میں جاکر رکھ دیتا ہے اور اسکے جواب کے لئے چند دن انتظار کرتا ہے اگر لڑکی وہ گلاب کا پھول" اُٹھالیتی ہے تو نوجوان مذکور دلیرانہ طور پر لڑکی کے گھر میں داخل ہوکر اسکے والدین سے شادی کی تاریخ مقرر کرالیتا ہے لیکن اگر لڑکی گلاب کے پھول کو نہ اٹھائے اور اسکو مُرجھانے کے لئے چھوڑ دے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ شادی کی درخواست مسترد کردی گئی بجز اسکے ایک لفظ بھی آپس میں تبادلہ خیالات کے لئے نہیں بولا جاتا ؛

برقی تجلّیات۔ "ایک آسمانی رنگ کی چکا چوند کردینے والی روشنی فوراً فضا میں پھیل جائیگی جس سے سارا شہر روشنی سے جگمگا اُٹھیگا۔ رات دن میں بدل جائیگی شہر کی ہر گلی اور کوچہ

برقی نور سے منور ہو جائیگا ایسا معلوم ہوگا گو یا آفتاب عالمتاب اپنی پوری قوت سے ضیاریزی کر رہا ہے یہ ایک سائنسدان کی پیشینگوئی ہے۔ رات کو تاریکی کی تکالیف سے کبھی سامنا نہ ہوگا راستہ چلنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئیگی۔ تاریکی ڈھونڈھے کو بھی نہ ملیگی کیونکہ ظلمت کی جگہ روشنی لے لیگی ایک زبردست برقی روشنی تمام شہر کو بقعۂ نور بنا دیگی جس کی شعاعیں دور دراز تک جائینگی۔ گلیوں اور بازاروں کے لمپوں کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ ہر چیز اس قدر روشن ہوگی جیسے دن کے وقت ہوتی ہے۔ یہ برقی انوار کے چشمے لوہے کے بلند میناروں اور سر بفلک برجوں میں بند رہینگے جن کا تعلق بجلی گھروں سے وابستہ ہوگا۔ بڑے بڑے مضبوط تاروں میں سے بجلی گذر کر جایا کریگی۔ لمپ جلانے والوں کے لئے جو عملہ رکھا جاتا ہے انکی بجائے ایک مرکزی سوچ بورڈ ہوگا جس کی نگرانی کے لئے صرف چند کارکنوں کی ضرورت ہوگی پولیس کے کام میں وسیع طور پر آسانیاں پیدا ہو جائینگی اور چور اور ڈاکو جو ظلمت اور تاریکی میں ارتکاب جرم کرتے ہیں وہ مستقبل میں ایسا نہ کر سکینگے۔ انواع و اقسام کا کام جلد اور آسانی سے ہو سکیگا۔

یہ انقلاب کب ہوگا۔ اسکے متعلق صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا آیا موجودہ نسل اس سے فائدہ اٹھائیگی۔ یا آنے والی نسل اس سے بہرہ اندوز ہوگی۔ لیکن یہ ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ انقلاب ضرور ہو کر رہیگا۔ لندن اور دنیا کے بعض بڑے بڑے شہر درحقیقت "آدھی رات کے آفتاب کے شہر" کے نام سے موسوم ہونگے۔

اسلام اور عیسائیت مسلامک ورلڈ راوی ہے۔ اسلام اور عیسائیت آجکل حیات اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں حاملان و مبلغان انجیل اپنی بہترین مساعی میں مصروف ہیں۔ کہ انسانی آبادی کی کثیر تعداد کو عیسائیت میں مدغم کر دیں وہ کثیر تعداد میں واعظین انجیل کو بھرتی کر رہے ہیں انھوں نے اپنی مساعی کو دوچند کر دیا ہے اور اسلام سے مقابلہ کرنے کے لئے تُل گئے ہیں۔

ریورینڈ سی۔ ایف سانیویل نے چرچ مشنری ریویو میں عیسائیوں سے ایک

زبردست اپیل کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں معتد بہ امداد دیں۔

وہ لکھتے ہیں" اسلامی دنیا کو جیسے اب انجیل کی تعلیم مؤثر کر رہی ہے اس سے پیشتر کبھی اس طرح اس کی ترویج نہیں ہوئی تھی اسلامی آبادی کی کل تعداد ۲۳۴۰۰۰۰۰۰ ہے گویا دنیا میں ¼ یا ⅕ حصہ سے کم نہیں (عالم اسلامی کی تعداد چالیس کروڑ ہے نہ کہ مندرجہ بالا۔ مترجم) ہر طریقہ سے عیسائیت کی تبلیغ کیلئے ان ممالک میں پہنچنا چاہیئے ابی سینیا کی خبریں مظہر ہیں کہ سات ہزار اشخاص اسلام سے عیسائیت میں داخل ہوئے یہی حالت ایران میں ہے۔ جاوا میں ۳۷۰۰۰ اور سماٹرا میں ۸۰۰۰ نے مذہب تبدیل کیا پادریوں نے عیسائیوں کو اکسایا ہے کہ دوبارہ وسیع پیمانے پر افریقہ اور ہندوستان اپنی سرگرمیوں کو تیزی اور عجلت سے شروع کر دو۔ نائیجیریا اور بالخصوص جنوبی نائیجیریا میں ہر سال ہزارہا آدمی عیسائیت کا بپتسمہ لے رہے ہیں گذشتہ سال سی۔ ایم۔ ایس کی واحد کوششوں سے افریقہ کے اس حصۂ ملک میں ۱۲۷۰۰ آدمیوں نے مذہبِ عیسوی قبول کیا۔ ہندوستان میں بھی قریب قریب یہی حالت ہے۔ تلگو مشن (جنوبی مدارس) نے اپنی زبردست کوششوں سے گذشتہ پانچ برسوں میں دوگنی تعداد کر لی ہے۔ صرف اسی ایک چرچ کی معرفت ۶۸۰۰۰ کے قریب اشخاص عیسائی ہوئے اگر تمام چرچ مشنوں کی کوششوں کی تعداد کا اندازہ کیا جائے تو کل میزان ۲۲۰۰۰۰ تک پہنچتی ہے"۔

کنواروں پر ٹیکس اٹلی میں حال ہی میں ایک سرکاری اعلان شائع ہوا ہے جسکے رُو سے ہر کنوارے اور کنواری کو جس کی عمر ۲۴ اور ۴۰ سال کے درمیان ہوگی سالانہ ٹیکس دینا ہوگا جو سات پونڈ دس شلنگ کے برابر ہوگا۔ لیکن چالیس سے زاید عمر والے اگر شادی نہ کرینگے تو انہیں دو پونڈ ۱۰ شلنگ دینا پڑیگا۔

غلام احمد خاں

حدیثِ شوق

جو کچھ کہا ہے میں نے وہ ناگفتنی سہی
جو کچھ کیا ہے میں نے وہ ناکردنی سہی

ہے کس کا عفو میری خطاؤں کا پردہ دار
ہاں! میں گناہگار سہی کُشتنی سہی

اے دوست ہم سے ترکِ تعلق نہ چاہیئے
الفت اگر نہیں نہ سہی دُشمنی سہی

دل کا جدا معاملہ ہے خوش نہ ہوں عدو
مجھ میں اور اُس میں جنگ ٹھنی ہے ٹھنی سہی

سوزِ کلیم، شمع سے پروانہ کو ملا
یہ نور اگر نہیں نہ سہی روشنی سہی

حامد یہ کیا خیال ہے، سودا ہے کیا تجھے؟
کیوں اُس کو فکر ہو تری جاں پر بنی سہی

تپشِ ناتمام

جلتا ہوں میں کہ رازِ دل افشا نہ ہو سکا
وہ دل ہے ننگِ سینہ جو رُسوا نہ ہو سکا

میرے لئے وبال ہیں خودداریاں مری
اے حُسنِ دوست! مجھ سے تقاضا نہ ہو سکا

سات آسماں کو چیر کے پہنچی نگاہِ شوق
تجھ سے ہزار پردہ میں پردا نہ ہو سکا

ہنگامِ نزع دیکھ کے تجھ کو ترا مریض
اچھا تو ہو گیا، مگر اچھا نہ ہو سکا

بیگانہ اک جہاں سے ہُوا آشنا ترا
چھوڑا سبھی کو تجھ سے نہ بیگانہ ہو سکا

اے حُسنِ بے نیاز! تری مشقِ ناز کو
میرے سوا کسی پہ بھی دعوے نہ ہو سکا

تُو نے ہزار بار سُنی داستاں مری
پھر بھی نہ ختم مجھ سے یہ افسانہ ہو سکا

جو میرے ساتھ سوزِ نہاں سے جلا کرے
میرا شریکِ غم کوئی ایسا نہ ہو سکا

حامد غزل سرا تو ہزاروں ہیں بزم میں
تو نادر ہے، یہاں کوئی تجھ سا نہ ہو سکا

حامد علی خاں

ٹامس الوا ایڈیسن

ایڈیسن جسے ہم بجا طور پر دنیا کا سب سے بڑا موجد کہہ سکتے ہیں عہدِ طفولیت ہی سے نئے نئے تجربوں کا دلدادہ واقع ہوا ہے۔ بچپن میں ایک دفعہ وہ ایک ٹوکری میں بطخ کے انڈوں پر بیٹھا ہوا دیکھا گیا۔ اُسکے پاس اسکی ایک کمسن بہن کھڑی ہوئی تماشا دیکھ رہی تھی کیونکہ ایڈیسن نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ ان انڈوں کو جانوروں کی طرح سہ کر ان میں سے بچے نکالیگا۔ یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا اور گھر میں ایک مُدت تک ہنسی مذاق کا ذریعہ بنا رہا لیکن فطرت نے ایڈیسن کی اُفتادِ طبیعت میں اختراع و ایجاد کا جو مادہ ودیعت کیا تھا اور جسکے طفیل بنی نوع انسان کی حیاتِ عمرانی کی تاریخ میں بعض نئے ابواب کا اضافہ ہوا ہے کسی طرح دب نہ سکا۔

یہ بات اکثر لوگوں کو باعثِ تعجب معلوم ہوتی ہے کہ ایڈیسن نے کسی سکول میں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔ بچپن میں وہ اپنے قصبہ کے مدرسہ میں داخل ہوا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایک دن وہ روتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اُستاد نے میرا سبق سُن کر کہا ہے کہ تمہارے سر میں دماغ نہیں۔ اس پر اسکی ماں بہت برافروختہ ہوئی اور اس نے یہ کہہ کر ایڈیسن کو سکول سے علیحدہ کر لیا کہ یہ بیہودہ سکول اور اسکا کندۂ ناتراش معلم اس قابل ہی نہیں کہ میرا بچہ وہاں تعلیم پائے۔ ایڈیسن کی ماں اپنی شادی سے پہلے خود ایک سکول میں معلمہ رہ چکی تھی چنانچہ اس نے ایڈیسن کو تعلیم دینے کا فرض اپنے ذمہ لیا، اور ایک عرصہ تک نہایت باقاعدگی سے اسکی معلمی کے فرائض انجام دیتی رہی مدرسہ کے حوصلہ شکن اور ناسازگار ماحول سے آزادی ایڈیسن کیلئے باعثِ رحمت ثابت ہوئی لیکن سب سے بڑا فائدہ اسے یہ ہُوا، کہ اسکی ماں کے الفاظ نے اسکے دماغ پر اعتماد علی النفس کا ایک کبھی نہ مٹنے والا نقش ثبت کر دیا۔ اور اسکے دل میں یہ لگن لگا دی کہ وہ اپنے آپکو اپنی ماں کے محبت بھرے الفاظ کے شایانِ شان ثابت کرے ؞

ایڈیسن غریب ماں باپ کا بیٹا تھا۔ سب سے پہلے اُسے ریلگاڑیوں پر اخبار بیچنے کا کام ملا۔ ریل میں بھی ہر وقت کیمیائی آلات اسکے پاس موجود رہتے تھے اور وہ مختلف تجربوں میں منہمک رہتا تھا ایک دفعہ ایک تجربہ کے دوران میں گاڑی کے اندر آگ لگ گئی جو فرو تو ہو گئی، لیکن ایڈیسن صاحب کو غضب آلودہ گارڈ کے حکم سے جو پہلے ہی انکی جدت طرازیوں سے تنگ آ چکا تھا بیک بینی و دوگوش ریل گاڑی سے نکلنا پڑا اور اسکے ساتھ ہی انکے آلات بھی پلیٹ فارم پر پٹخ دیئے گئے۔ اس زمانے میں ایڈیسن کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی ؞

اپنے کاروبار کی تباہی پر ایڈیسن کو افسوس ہُوا لیکن اسکے بعد اس نے گھر پر اپنے تجربوں اور مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ پہلے تو اسکا باپ جسے ریل گاڑی کا واقعہ یاد تھا ڈرا کہ کہیں اس لڑکے کے تجربے گھر ہی کے لئے برقِ فنا ثابت نہ ہوں

لیکن آخر ایڈیسن نے اسے اچھی طرح سے اطمینان دلا دیا کہ اب اسکے پاس کوئی آتشگیر مادہ موجود نہیں ہے اور نہ وہ اس سے کام لینا چاہتا ہے
اسی زمانے میں ایڈیسن کو ٹیلیگرافی سے دلچسپی ہوئی اور تارگھر کے ایک ملازم نے جسکی خردسال بیٹی کی جان حسنِ اتفاق سے ایڈیسن نے بچائی تھی اسے تار کا کام سکھانیکا وعدہ کیا۔ ایڈیسن نے بہت جلد یہ کام سیکھ لیا۔ اور تارگھر میں رات کے کام پر ملازم ہو گیا لیکن چونکہ دن بھر تمام وقت تجربوں میں گزرتا تھا۔ اسلئے رات کو کام کرنیکی بجائے یہ اونگھنے لگتا تھا۔ جب اس کے بالادست افسر کو اسکی اس غفلت شعاری کا علم ہوا اس نے اسے حکم دیا کہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد وہ اسے تار میں کوئی اشارہ کیا کرے جس سے معلوم ہو کہ وہ بیدار ہے۔ ایڈیسن نے جلد ہی ایک ایسا آلہ ایجاد کر لیا جو ہر آدھ گھنٹے کے بعد اسے جگا دیتا تھا اور اسکے بعد اس آلہ میں اس نے یہ صنعت پیدا کی کہ وہ خود بخود ہر آدھ گھنٹے کے بعد اسکے افسر کو اسکے حسب ایما اشارہ کر دیتا اور ایڈیسن با طمینان سویا رہتا اس زمانہ میں ایڈیسن کی عمر سولہ سال کے قریب تھی ؛

اکیس سال کی عمر میں ایڈیسن نیویارک گیا۔ اور وہاں ایک کارخانے میں اس نے حسن اتفاق سے ایک بگڑی ہوئی مشین درست کر دی اس سے قبل بڑے بڑے تجربہ کار اشخاص اسکی درستی سے عاجز آچکے تھے۔ اسی بات پر ایڈیسن کو کارخانے میں ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ آمدنی کے اضافے کے ساتھ اس نے تجربوں پر بھی زیادہ روپیہ صرف کرنا شروع کیا۔ آخر اس نے اپنے کارخانے والوں کے لئے ایک نئی اصلاح شدہ مشین ایجاد کی جس پر اسے کارخانے سے آٹھ ہزار پاؤنڈ کا انعام ملا۔ اب ایڈیسن اور بھی زیادہ اپنے تجربوں میں منہمک ہو گیا۔ اس نے پہلی ایجاد ٹیلیگراف ہی کے سلسلہ میں کی۔ اس زمانے میں ایک تار پر ایک وقت میں صرف ایک ہی پیغام روانہ ہو سکتا تھا لیکن ایڈیسن نے یہ اصلاح پیدا کی کہ ایک تار پر ایک ہی وقت میں دو مختلف پیغام مختلف سمتوں میں روانہ ہونے لگے۔ یہ ایک اعجاز تھا چنانچہ اسی زمانے سے ایڈیسن کو جادوگر کا لقب مل گیا لیکن ایڈیسن نے اپنی ایجاد میں ایک اور اصلاح کر کے دوبارہ دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔ جسکے ذریعہ سے ایک ہی تار پر بیک وقت دو دو پیغام مختلف سمتوں میں روانہ ہونے لگے۔ یعنی ایک تار پر ایک وقت میں چار مختلف پیغام پہنچنے لگے ؛

ایڈیسن کی ایجادات اور انکے متعلق ضروری حالات کے بیان کیلئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے اور اس مختصر مضمون میں کسی طرح اسکی گنجائش نہیں نکل سکتی ہر نئی ایجاد کیلئے اسے ہزاروں نئے تجربوں اور بیش قرار مصارف کا سامنا ہوتا رہا۔ یہاں مختصر طور پر ہم اسکی بعض ایجادات کا تذکرہ کرتے ہیں ؛

۱۸۷۸ئہ میں جب اسکی عمر تیس سال کی تھی اس نے برقی لیمپ ایجاد کیا۔ نمایش کیلئے اس نے بیسیوں برقی قمقمے مختلف درختوں پر لگا دیئے اور رات کے وقت انہیں ہزاروں آدمیوں کی متحیر نگاہوں کے سامنے روشن کیا۔ لوگوں کو یہ تماشا دیکھنے کا اسقدر شوق تھا کہ انہیں پہنچانے کے لئے سپیشل ٹرینیں چلائی گئیں ؛

ایڈیسن کو زیادہ اہم ایجادات سے جب کبھی فرصت ملی اس نے مختلف موقعوں پر ٹائپ رائٹر مشین برقی ریلگاڑی کو گھمانیکا تختہ، ٹرالی گاڑی کو چلانیکی مشین۔ فلزات کو گلانے کا چولھا، ریلوے سگنل کرنیکا ایک خاص طریقہ اور اسی قسم کی دوسری مفید چیزیں ایجاد کیں، اسی طرح کوڈک فلم کی اصلاح اور بائسکوپ کے متعلق ایڈیسن نے جو کام انجام دیا ہے وہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ۱۸۸۹ء میں ایڈیسن کا معمل عارضی طور پر متحرک تصاویر اور انکے متعلقات کیلئے وقف ہوگیا۔ ایڈیسن کی ایجادات اتنی مختلف النوع اور اتنی کثیر التعداد ہیں کہ یہاں صرف انکا نام لینا بھی مشکل ہے، تاہم یہاں اسکی ایک خاص ایجاد کا تذکرہ نہایت ضروری ہے۔ جو بنی نوع انسان کے ہر طبقہ کی دلچسپی کا باعث بنی ہے یہ فونوگراف کی ایجاد ہے، جس سے خود ایڈیسن نے اپنی تمام دوسری ایجادات کے مقابلہ میں زیادہ دلچسپی ظاہر کی ہے، ایڈیسن نے انسانی آواز کے موضوع پر سب سے زیادہ تجربے اور سب سے زیادہ وقت اور سب سے زیادہ غور و فکر صرف کی ہے۔

۷۶ سال کی عمر میں ایڈیسن اپنا مقام پیدائش دیکھنے کے لئے گیا، موٹر کاروں کا مشہور امریکن کروڑپتی تاجر ہنری فورڈ بھی اسکی معیت میں تھا۔ ایڈیسن بھی اب کروڑپتی تھا، لیکن اس نے وہ چھوٹا سا مکان جہاں وہ ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوا تھا، نہایت دلچسپی سے دیکھا۔ اسے وہاں کی چیزیں دیکھ کر اپنے بچپن کا زمانہ یاد آگیا۔ اس نے اپنے جسم میں ایک نئی روح دوڑتی ہوئی محسوس کی اور وہ اس مختصر سفر کے بعد تجربہ خانے میں اپنے مرغوب مشاغل جاری رکھنے کے لئے دوبارہ تازہ دم ہوکر واپس گیا۔

(حامد علی خاں)

اکبر مست ہاتھی پر

شہنشاہ اکبر کو فن شہسواری میں کمال حاصل تھا اور مست ہاتھیوں اور منہ زور گھوڑوں کو قابو میں لانے کا مشغلہ اسے خاص طور پر محبوب تھا۔ ہمایوں کے اس پرچہ میں اکبر کی جو تصویر شائع ہو رہی ہے وہ قدیم ہندوستانی فن مصوری کا ایک نہایت گراں قدر نمونہ ہے اس پرچہ میں فن مصوری کے متعلق میاں عطا الرحمٰن صاحب کا مضمون اور اس تصویر کے موضوع خاص کے متعلق مولانا مہر محمد خاں صاحب کا مضمون "اکبر اور ہاتھیوں کی جنگ" اس سلسلہ میں خاص دلچسپی سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔

(حامد علی خاں)

خسرو کی یادیں

کھڑی ہے موت اے جانِ تمنّا سامنے میرے
نویدِ زندگانی بن کے آجا سامنے میرے

مجھے کرنی پڑی ہے لالہ کاری تیری تربت پر
قیامت ہے کہ ہو یہ حشر برپا سامنے میرے

بحسرت بجھ رہی ہے شمع آخر تیرے بالیں پر
کفِ افسوس ملتا ہے مسیحا سامنے میرے

قرارِ جانِ مضطر۔ آہ۔ جس کی زندگانی تھی
وہی ہے مضطرب اور ناشکیبا سامنے میرے



تجھے مجھ سے نہاں کرتا ہے پردہ زندگانی کا
نہیں غم مجھکو ہے کبتک یہ پردا سامنے میرے

وہ محفل جس میں تو تھا مدتیں گزریں ہوئی برہم
مگر ابتک ہے رنگ اُس انجمن کا سامنے میرے

مجھے بھولی نہیں وہ داستانِ اوّلیں ابتک
نثار اُس پر ہوں جو لے نام تیرا سامنے میرے

کِیا کرتا ہوں باتیں تجھ سے میں اب بھی تصوّر میں
نہ ہو جب کوئی، تو ہوتا ہے گویا سامنے میرے

حامد علی خاں

اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر

اسلام کے مادّی اثرات یورپ پر

تجارت۔ اب ہم اُن مادّی اثرات کا ذکر کرتے ہیں جو اسلام نے یورپ پر کئے۔ تجارت سے مُسلمانوں کو شروع سے اُنس تھا۔ پیغمبر اسلام خود تاجر تھے اور مُسلمانوں نے ابتدا سے تجارت اور حرفت کو گویا اپنے دین کا جزو اعلےٰ سمجھ رکھا تھا۔ اندلس کے مُسلمان سارے یورپ سے تجارت کرتے تھے۔ ہسپانیہ کے بندرگاہ مُلک مُلک کے جہازوں سے بھرے رہتے تھے۔ غرناطہ کا شہر یورپ کے سوداگروں کا مسکن تھا اور اہل جنوا اور اہل فلارنس نے وہاں اپنی تجارتی شاخیں کھول رکھی تھیں۔ عبدالرحمٰن الناصر کی آمدنی یورپ کی ساری حکومتوں کی مجموعی آمدنیوں سے بڑھ کر تھی جس سے مُسلمانوں کی وسیع تجارت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مغرب کے عربوں کے تجارتی رستے پیرینیز پر سے اور بحرِ متوسط میں سے ہو کر گذرتے تھے[۱]۔ انکے تجارتی جہازوں کی تعداد ایک ہزار تھی۔ مشرق کے مُسلمان بھی اہل یورپ سے تجارتی تعلقات رکھتے تھے۔ مسیو لی بان بیان کرتے ہیں کہ یہ تجارت بحرِ خزر سے شروع ہو کر استرخان اور بلغار (سمبرسک) کے راستے سے ہوتی تھی۔ اُن کا مال خلیج فن لینڈ تک پہنچتا تھا۔ شلس وگ جزائر اولینڈ اور بازن ہوم میں آجتک عربی سکے پائے جاتے ہیں۔ سویڈن ڈنمارک اور پرشیا کے بندروں تک یہ تجارت ہوتی تھی۔ عربی سکے پولینڈ کے بہت سے شہروں میں بالخصوص وارسا میں پائے گئے ہیں۔ اُن کوفی کتبوں سے جو روس میں پائے گئے ہیں۔ ثابت ہوتا ہے کہ عرب خزروں اور بلغاریوں میں جا بسے تھے۔ سٹاک ہالم کے عجائب خانہ کے بعض قیمتی زیورات اور دیگر نادر اشیاء بلاشبہ مشرقی الاصل ہیں اور ضرور اسی راستے سے یہ چیزیں وہاں آئی ہونگی۔ یہ وسیع تجارت ساتویں صدی سے گیارھویں صدی تک برابر چار صدیاں جاری رہی۔ اخیر سکہ کی تاریخ ۱۰۴۰ء کے مطابق ہے یہ سکے خلفائے عباسیہ کے ہیں۔ اندلس کے سکے ان میں کم ہیں۔ غالباً خانہ جنگیوں کی گرم بازاری اور صلیبیوں کی ناروا داری نے یہ سرسبز تجارت بالکل بند کر دی۔ اسکے بعد وینس کے ذریعے سے تجارت

---

[۱] ڈریپر جلد ۲ صفحہ ۴۴

ہونے لگی جس نے دیگر خود مختار اطالوی بندرگاہوں کی طرح سلاطینِ اسلام کے ساتھ معاہدے کر لئے اور یہ اُنکی تجارتی قوت اور عام خوشحالی کا باعث ہوئے ٭

صنعت و حرفت۔ اس تجارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مُسلمانوں نے صنعت و حرفت کو کس قدر ترقی دی تھی ٭ بصرہ کا شیشہ اور صابون مرسیا کا کپڑا طلیطلہ کے چاقو کوفہ اشبیلیہ اور غرناطہ کا ریشم ان سب کی مہذب اور غیر مہذب غرضٗ دُنیا کے سب معلوم شدہ حصوں میں مانگ تھی۔ صرف اشبیلیہ میں چھ ہزار ریشم کا کام کرنے والے صناع تھے اور ادریسی کہتا ہے کہ ژین (Jaen) کی چھوٹی سی ریاست میں چھ سَو سے زیادہ قصبوں اور گاؤں میں ریشم کا کام ہوتا تھا (سنہ ۱۱۵۰ء) کپڑا رنگنے کا فن صقلیہ سے یورپ میں آیا جہاں عربوں کا تمدن ایک عرصہ تک رہا۔ ریشمی کپڑا جزیرہ میں بُنا جانے لگا اور اس وقت بھی نوزم برگ میں ایک ریشمی چادر شاہانِ صقلیہ کے اوڑھنے کی موجود ہے جس پر کوفی حرفوں میں پانسو بیس ہجری (مطابق سنہ ۱۱۳۳ء) کا ایک کتبہ ہے ٭ چمڑے کے رنگنے کمانے اور اُس پر آرائشیں کرنے کا فن سپین سے فاس میں آیا اور وہاں سے انگلستان والوں نے سیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے مراقشی Morroco اور قرطبی Cordwain کہتے ہیں۔ نیل سے رنگنا بھی عربوں کی ایجاد ہے ٭

معدنیات پر کام کیا جاتا تھا اور پارے گندھک تانبے اور لوہے کے استخراج کرنے میں انہیں پوری مہارت حاصل تھی ٭ انھوں نے صنعت و حرفت اور تجارت کے متعلق متعدد کتابیں لکھیں۔ انگریزی لفظ (Carat) کیرٹ عربی قیراط سے ماخوذ ہے۔ یہ عربوں کے وزنوں میں سب سے چھوٹا وزن تھا ٭ انگلستان کے سب سے مشہور بیت العلوم آکسفورڈ کے عجائب خانے میں اس وقت ایک سکّہ موجود ہے جس کے دیکھنے سے عربوں کی صنعتی فوقیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسکے ایک طرف تو یورپی حروف میں اوفارکس (Offa-rex) یعنی شاہ اوفا لکھتا ہے (آٹھویں صدی میں یہ انگلستان کی ریاست مرشیا کا بادشاہ تھا) اور دوسری طرف عربی میں بغداد کے دو سکہ گردن بابا اور رادنی کا نام عربی حروف میں لکھا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز یادگار ہے ٭

زراعت۔ زراعت کے فن کو جس قدر ترقی عربوں نے دی آجتک کسی قوم نے نہیں دی۔ وہ پہلے لوگ ہیں جنہوں نے زراعت کے فن کو ایک علم کے رتبے پر پہنچایا ٭ دیگاکی وادیوں میں انھوں نے اپنی وسیع معلومات کو قدرت کے حضور پیش کر کے اس سے خراجِ تحسین حاصل کیا اور کاشتکاری میں

وہ وہ ہنر دکھائے جو آجتک سپین اور یورپ کو نہیں بھولے۔ انہوں نے اندلس کی زرخیز زمین میں نیشکر چانول کپاس کیلئے وغیرہ مختلف اجناس کی کاشت جاری کی۔ آجکل ہسپانیہ کے صرف جنوبی حصّہ میں باقاعدہ فلاحت ہوتی ہے جو عربوں کی یادگار ہے۔ ہسپانیہ اور صقلیہ دونوں ملکوں میں انہوں نے ایسی اجناس کی کاشت کی جن سے یورپ محض بے بہرہ تھا۔ اس وقت جو ذرایع آبپاشی ان ملکوں میں موجود ہیں وہ زیادہ تر انہیں کے زمانے کے ہیں۔ ان میں وہ نہریں بھی تھیں جن کا پانی نل کے ذریعہ سے ایک نہر سے دوسری نہر میں پہنچ جاتا تھا۔ اور جو اس سے پہلے کہیں دیکھی نہ گئی تھیں۔ انہوں نے فنِ زراعت کے متعلق مفید قوانین کا ایک سلسلہ بنایا اور علمِ توازنِ مایعات Hydrostatics کے ذریعے سے اس فن کو بہت ترقی دی۔ علاقۂ ویلنشیا Valencia کے باغات کے پھل سارے یورپ میں بکتے تھے۔ اشبیلیہ کے شہر کے آس پاس زیتون نکالنے کی ایک لاکھ چکیاں تھیں۔

باغ آرائی۔ باغ آرائی کے فن کو جس طرح اندلس کے مُسلمانوں نے سمجھا اور جیسے وہ اُسے عمل میں لائے یورپ کے موجودہ زمانۂ عشرت میں بھی عیش پسندوں کو وہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ اُنکے باغ گویا جنت الفردوس کا نمونہ تھے جن میں سینکڑوں فوارے اور آبشار درختوں کی جھکی ہوئی ٹہنیوں اور پھولوں کی کف نما پنکھڑیوں پر روز و شب اپنی شبنم افشانیوں سے قدرت کی حسن آفرینیوں کا آئینہ پیش نظر رکھتے تھے۔ یورپ کے متمول لوگوں نے اپنے باغوں کو ان نمونوں کے مطابق بنانا شروع کیا۔ یہ صحرائی لوگ چمن آرائی کے اس قدر مشتاق و دلدادہ ہو گئے تھے کہ اُنکے باغوں کی کیاریاں نہ محض ہلکے اور گہرے رنگوں بلکہ بھینی اور تیز خوشبوؤں کی تدریجی جلوہ گاہ تھیں۔ دقیقہ رس باغبانوں نے کہیں پھولوں کو اُنکی رنگت کے مطابق جمع کیا تھا اور کہیں اُنکی نکہت کے مطابق۔

زندگی کی آسائشیں۔ زندگی کی بہت سی وہ آسائشیں جن سے آجکل اہل مغرب متمتع ہوتے ہیں عربوں ہی کی بتائی ہوئی ہیں[1]۔ بغداد و قرطبہ کے فراخ اور وسیع بازار اُنکے سنگِ مرمر کے ہزاروں محل وہ زَوْرَقیں (یعنی کشتیاں) جو شوقینوں کے لئے دجلہ پر چلتی تھیں، میز اور کُرسیاں بلکہ کانٹے اور چمچے اور نیپکن (Napkin رومال) جو آج کل مسلمانی سے بہت دُور سمجھے جاتے

---

[1] امیر علی اور ڈریپر جلد دوم صہ ۳۵

ہیں انہیں کی ایجاد کردہ اشیاء آسائش ہیں۔ رات کو سوتے وقت کپڑے بدلنا (جنہیں قماش النوم کہتے تھے) اکثر غسل کرنا آجکل بھی یورپ میں عام لوگ غسل کرنے سے اس طرح دور بھاگتے ہیں جیسے ہمارے ہاں کے ننھے بچے یا شریر لڑکے) عمدہ لباس پہننا۔ اپنے کمروں کی مختلف طریقوں میں آرائش کرنا یہ سب انہیں کے دئے ہوئے سبق ہیں۔ سید امیر علی لکھتے ہیں کہ وہ متعدد کھیل کھیلتے تھے جن میں چوگان ٹینس (لعب الکرہ) کرکٹ۔ جرید Spear-throwing بھی تھیں۔ شطرنج کا کھیل جو ہندی الاصل ہے یورپ نے انہیں سے سیکھا۔ گھڑ دوڑ کا انہیں بہت شوق تھا۔ اُموی خلیفہ ہشام کے چار ہزار گھوڑے گھڑ دوڑ میں دوڑتے تھے۔ شہزادیاں بھی گھڑ دوڑ کے لئے گھوڑے پالتی تھیں۔

غرض تمام وہ آسائشیں جنہیں آج ہم صرف یورپ اور اہل یورپ کا حصہ سمجھے ہوئے ہیں اور اکثر وہ باتیں (مثلاً میز کرسی پر کھانا کانٹے چمچے استعمال کرنا) جو ہم آج کل انہیں کی طرف منسوب کرتے ہیں دراصل عربوں کی سکھائی پڑھائی ہوئی ہیں۔ اُنکے بڑے شہر بھی آج کل کے مغربی شہروں کے ہم پلہ تھے۔ اپنے عروج کے زمانے میں بغداد کی آبادی بیس لاکھ تھی۔ اُس کا پھیلاؤ ایک طرف بیس میل اور ایک طرف چھ میل سے کم نہ تھا۔

قرطبہ۔ قرطبہ کی آبادی دس لاکھ سے متجاوز تھی[1] (آج وہاں ۵۶۰۰۰ باشندے ہیں) اس شہر میں تین ہزار آٹھ سو (۳۸۰۰) مسجدیں، ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰) محل اور عالیشان مکان دو لاکھ (۲۰۰۰۰۰) متوسط لوگوں اور غریبوں کے گھر سات سو حمام سینکڑوں سرائیں اور مسافر خانوں کے علاوہ آٹھ ہزار (۸۰۰۰) دکانیں تھیں۔ اس کی شہرت جرمنی کے پرلے سرے تک پہنچ گئی تھی سکسن نن Hroswitha اسے "آرائش عالم" کا دلکش لقب دیتی ہے۔ مغربی سیاح بیان کرتے ہیں کہ رات کو انسان دس میل تک اُسکے چراغوں کی روشنی میں چل سکتا تھا۔ اسکے سات سو برس بعد لندن کے کوچوں میں ایک لمپ بھی نہ تھا۔ سڑکیں پکی اور خوب کٹی ہوئی تھیں۔ پیرس کے بازاروں میں سینکڑوں برس بعد اتنی کیچڑ ہوتی تھی کہ چلنے والے ٹخنوں تک اُس میں دھنس جاتے تھے۔ عوام کے لئے سینکڑوں کھانے کے کمرے (Restaurants اور ہزاروں حمام (کہتے ہیں کہ بغداد میں ایک لاکھ حمام تھے) قسم قسم کی دکانیں اور نمائش گاہیں گویا حال کے یورپی شہروں کا نمونہ تھیں۔ گھروں میں گرمی میں زمین دوز راستوں سے

---

[1] ڈریپر جلد ۲ ص ۳۱ اور امیر علی

ٹھنڈی اور خوشبودار ہوائیں آتیں۔ کمروں کی آرائش کے لئے ہاتھی دانت کی میزیں اور مرصع کار تپائیاں۔ ایرانی قالین اور بلور کے کام کئے ہوئے پھولدان اور بیسیوں ایسی چیزیں تھیں۔

عربی طرز تعمیر کا اثر۔ عربوں کی طرز تعمیر کا اثر یورپ کی طرز تعمیر پر جس قدر ہوا وہ انتہا درجہ حیرت انگیز ہے[۱] عربوں سے پہلے سب قومیں گول محراب کا استعمال کرتی تھیں انہیں نے پہلے پہل نکیلی محرابیں بنانی شروع کیں۔ اُنکی مساجد کے گنبدوں اور میناروں سے زیادہ اُنکے محلوں کی محرابوں اور ستونوں نے یورپ کی طرز تعمیر پر اثر کیا۔ موسیو دیاردو کہتے ہیں کہ وہ طرز تعمیر جسے لوگ گاتھک GOTHIC کہتے ہیں دراصل سپین سے یورپ میں آئی جیسے ہم ہسپانی طرز تحریر اور ہسپانی طرز عبادت کو گاتھک کہتے ہیں۔ ایسے ہی ہم اُنکی طرز تعمیر کو بھی گاتھک کہنے لگے۔ اول اول مشرقی عیسائیوں نے شام و بغداد کے عربوں سے وہ پھولدار اور پیچدار طرز تعمیر سیکھی جو مسلمانوں میں مروج تھی اور جو اُس بُت پرستی اور صورت پرستی کی نفرت کی وجہ سے عربوں نے "قائم کی جو اسلام نے اُنکے دلوں میں پیدا کر دی تھی۔ جرمن معماروں نے اُن سے سیکھ کر یورپ میں اس کا رواج دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن طرز تعمیر اور سپینی طرز تعمیر آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ بتدریج یہ دونوں طرزیں آپس میں بالکل مل گئیں اور یورپ میں ایک نئی طرز پیدا ہوئی جسے نشاۃ ثانیہ کی طرز تعمیر کہا جاتا ہے۔ موسیو دیاردو کا قول ہے کہ قرطبہ کی MAZQUITA مسجد کی محرابوں کی نقل میں نے نارچ NORWICH کے گرجا کی محرابوں میں پائی ہے اور اسی طرح الحمرا کے ستونوں کو گویا دیژوں DIGON کے گرجا نوتردام میں دیکھا ہے۔ اس مشابہت کی یہ دو تین مثالیں ہی نہ تھیں بلکہ یہ بڑے بڑے گرجوں سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے مکانوں میں پائی جاتی تھی۔ عربوں کی طرز تعمیر کا اثر یورپ پر عارضی نہیں ہوا بلکہ اُسکے اثرات مستقل طور پر آجتک یورپ کی تعمیرات پر اُنکی حسن آفرینیوں کی شکل میں موجود ہیں۔ آپ میں سے جو اصحاب پیرس کی سیر کر آئے ہیں انہیں یہ سُن کر بہت دلچسپی ہوگی کہ پیرس کا سب سے مشہور گرجا NOTREDAME نوتردام جو دنیا کے سب سے مشہور و ممتاز گرجاؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عرب معماروں ہی کا بنایا ہوا ہے۔ عرب معماروں کو بسا اوقات دارالخلافوں کی آرائش کیلئے مدعو کیا جاتا تھا۔ فلزات اور بیش بہا پتھروں کے کام میں انہوں نے کمال حاصل کیا۔ پتھروں کی بجائے رنگین اینٹوں کا استعمال انہیں نے شروع کیا اور اطالیہ والوں نے یہ فن اُن سے سیکھا۔ پیرس کے

---

[۱] مورخوں کی تاریخ صفحہ ۲۸ - ۸۲

عجائب خانہ لُودر LOUVRE میں بلور کا ایک پیالہ موجود ہے جس پر نہایت عمدہ نقش و نگار ہیں یہ پیالہ عربی ہے +

نسخی گلکاریاں اور کتبے عربی تعمیرات کی خصوصیت ہیں اور عربی حروف نہایت خوبصورتی سے نسخی گلکاریوں میں گھُل مل جاتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ اور نشاۃ الثانیہ کے معماروں نے اکثر عربی کے لفظوں اور فقروں کو محض آرائش سمجھ کر نقل کر دیا ہے + ایک قدیم سیاح کا بیان ہے کہ کلیسائے سینٹ پیٹر کے اس دروازہ پر جہاں پوپ یوژین چہارم کی مورت ہے، حضرت عیسیٰ کے سر کے گرد عربی حرفوں کا ہالہ ہے۔ موسیو لی بان کہتے ہیں کیا عجب ہے کہ یہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہو +

اسلام کے دماغی یا عقلی اثرات یورپ پر

اخیر میں ہم اس موضوع کے سب سے اہم اور سب سے دلچسپ حصے کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ یعنی اسلام کے دماغی اور عقلی اثرات یورپ کی تہذیب پر کیا کیا ہوئے؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کے فلسفہ نے کس طرح اہل یورپ کے پرانے دقیانوسی مذہب پر حملہ کر کے اسکے پرخچے اڑائے۔ دوسرے علمی شعبوں میں بھی صرف یہی لوگ تہذیب و تمدن کے شمع بردار تھے + سائنس۔ جسے کفر کا مظہر سمجھ کر حال کے بعض مسلمان اُس سے اجتناب کرنا اپنا دینی فرض تصور کئے بیٹھے ہیں عربوں ہی کی بدولت یورپ نے سیکھا اور عربوں ہی کے ظلِ عاطفت میں انہوں نے اس علم کو شعبہ ہائے زندگی میں عملی طور پر برتنا شروع کیا +

کیمیا ء علم کیمیا (CHEMISTRY) میں ابو موسیٰ جعفر کوفی (آٹھویں صدی) قرونِ وسطیٰ کا سب سے بڑا کیمیادان گذرا ہے۔ وہ ابن سینا رازی اور خالد جیسے شہرہ آفاق حکما کا استاد تھا۔ روجر بیکن اُسکو MAGISTER MAGISTRORUM سرداروں کا سردار کہتا ہے۔ علم کیمیا میں یورپ والوں نے اُسے PRIESTLEY پریسٹلے اور LAVOISIER لاووآزیئے کا ہم پایہ مانا ہے + اُس نے شورے کا تیزاب دریافت کیا NITRIC ACID اور اُسے اور نمک کے تیزاب HYDROCHLORIC ACID کو ملا کر دیکھا کہ یہ مرکب" ماء الملوک"

---

[1] ڈریپر جلد اص ۴۰۹ - ۱۰

سونے تک کو گلا دیتا ہے۔ اس سے پہلے سرکہ سے زیادہ کوئی سریع الاثر AQUAREGIA تیزاب معلوم نہ تھا۔ اُس نے گیسوں (غازوں) کی اصلی ماہیت کو پالیا کہ وہ خاص عملوں سے اجسام سے جُدا ہوتی ہیں اور اس بات کا تجربہ کیا کہ جب کسی دھات کو ایک بند برتن میں گرم کریں تو وہ وزن میں زیادہ ہو جاتی ہے CALCINED اُس نے بہت سے کیمیائی عملیات کو دریافت کیا مثلاً تقطیر DISTILLATION یا عرق کھینچنا، تصعید SUBLIMATION یا بخار اُڑا کر منجمد کرنا، تسبیع FUSION یا پگھلانا ترویق FILTERATION چھاننا، تیزابوں کی دریافت سے گویا اُس نے علم کیمیا کو ایجاد کیا ۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام اکتشافات بغیر مسلسل توجہ اور دن رات کی جدوجہد کے انجام کو نہ پہنچے ہونگے ۔ اور اُسے ان تجربوں میں جو وہ مختلف اشیاء کو آنچ دینے اور انہیں گھلانے ملانے میں کرتا رہا بارہا ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا ۔

رازی RHAZES نے جو بغداد کے شاہی شفاخانہ کا سب سے بڑا طبیب تھا گندھک SULPHUR اور خالص الکحل ABSOLUTE ALCHOHOL کے تیار کرنیکا طریقہ اور انکے خواص بتائے ۔

عرب کیمیا دانوں نے ترازو کے مسئلے کو سمجھا اور اجسام کے اوزانِ مخصوص SPECIFIC GRAVITIES کی میزانیں تیار کیں۔ کیمیا کی جو تعریف انھوں نے کی ہے وہ قابلِ غور ہے علم کیمیا ترازو اوزان اور آتش زدگی COMBUSTION کا علم ہے ۔

عربوں نے بھی اَور قوموں کی طرح شروع شروع میں علم کیمیا کا زیادہ تر اسی لئے مطالعہ کیا کہ وہ معمولی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر سکیں۔ لیکن انھوں نے بہت جلد کیمیا کو بطور ایک باقاعدہ علم کے ترقی دینی شروع کی ۔ یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اگرچہ زمانۂ حال میں برسوں اس بات پر پھبتی اُڑائی گئی ہے لیکن آجکل کیمیا دانوں کا پھر ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جن کا خیال ہے کہ دھاتوں کے اصلی اجزا ایک ہی ہوتے ہیں اور اس لئے تحویلِ فلزات کا پرانا مسئلہ محض غلط نہیں ہے ۔

حیرت انگیز اکتشافات ۔ اسی عنوان کے تحت میں اُن حیرت انگیز اکتشافات کا ذکر کرنا بھی

ضروری ہے جنھوں نے مہذب دُنیا کی کایا پلٹ دی اور تاریخ تمدن میں ایک نئے دَور کی بنا ڈالی ۔

عام تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کپاس (قطب نما)، بارود اور کاغذ کی ایجادات ہی سے یورپ کے موجودہ ترقی یافتہ دور کی ابتدا ہوئی۔ لیکن صرف غیر متعصب اور انصاف پسند مورخین ہی نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ یہ عربوں کی ایجادیں تھیں اور یورپ نے قرونِ وسطیٰ کے اخیر میں اپنے عرب اُستادوں سے ان کا درس حاصل کیا ۔

کاغذ:۔ مورخوں کی تاریخ دنیا HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD میں موسیو سدی یو SEDILLOT لکھتے ہیں کہ ۶۵۰ء میں ریشم کا کاغذ سمرقند اور بخارا میں بنتا تھا۔ ۷۰۶ء میں یوسف عمران نے مکہ معظمہ میں بجائے ریشم کے روئی کا استعمال کرنا شروع کیا۔ یہ وہ "دمشقی کاغذ" ہے جس کا یونانی مورخین ذکر کرتے ہیں سپین میں جہاں سن اور کتان بکثرت پائے جاتے تھے بیسیوں کاغذ کے کارخانے قائم ہوگئے۔ تیرھویں صدی میں عربی کاغذ قشطیلیہ CASTILE میں استعمال ہونے لگا جہاں سے فرانس، اطالیہ، انگلستان اور جرمنی نے اسے تیار کرنا سیکھا لیکن پھر بھی عربی کاغذ کی عمدگی اور چمک اور رنگینی کا مقابلہ کہیں نہ ہوسکا ۔

قطب نما۔ موسیو سدی یو کہتے ہیں کہ یہ کہا جاتا ہے کہ عربوں نے کاغذ کا بنانا اور قطب نما کا استعمال کرنا چینیوں سے سیکھا اسی طرح یہ کہا جاتا ہے کہ چینی چھاپہ کا فن جانتے تھے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر عربوں نے اُن سے یہ فن کیوں نہ سیکھا۔ قطب نما کا استعمال چینیوں نے کبھی نہیں کیا وہ کبھی نامعلوم سمندروں میں نہ گئے اور عربوں نے تو عملی طور پر اُس سے کام لیا۔ بحرِ متوسط میں وہ بلا خوف و خطر بحری سفر کرتے بلکہ وہ قطب نما کو اپنے صحرائی سفروں میں بھی استعمال کرتے تھے اور اس سے قبلے کی سمت کو بھی جانچتے تھے ۔ اور ریسی کہتا ہے کہ عربوں میں اس کا استعمال بارھویں صدی میں عام تھا۔ یورپ نے اسے پہلے پہل تیرھویں صدی میں برتا ۔

بارود۔ بارود بھی عربوں کا ایجاد شدہ سامانِ حرب ہے۔ ۶۹۰ء میں مکے کے محاصرے میں ایک قسم کا بم استعمال کیا جارہا تھا اور تیرھویں صدی عیسوی میں مصر میں پسے ہوئے شورے POWDERE NITRE کے ذریعے سے گولوں کو دور پھینکا جاتا تھا۔ جس سے گرج کی سی آواز

ؕ مورخوں کی تاریخ جلد ۸ - ۲۷۴ و ۲۷۵ ۔

نکلتی تھی۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ شاہِ تونس TUNIS اور امیر اشبیلیہ کے درمیان جو لڑائی گیارھویں صدی میں ہوئی اُس میں بارود استعمال کی گئی اور فیراس FERRARS ہمیں صاف صاف بتاتا ہے کہ گولوں کو بارود کے ذریعے سے چلایا جاتا تھا۔

ہسپانیوں نے عربوں سے اس کا استعمال سیکھ کر دوسری مغربی اقوام کو سکھایا۔ الفانس یازدہم نے ۱۳۴۲ء میں جب الجسر پر حملہ کیا اُس وقت محاصرے میں دو انگریز کونٹ ڈاربی اور سالزبری COUNTDERBY & SALISBURY موجود تھے وہ اس ایجاد کو اپنے ملک میں لے گئے اور اس کے چار سال بعد انگریزوں نے کریسی CRECY کی لڑائی میں توپ کا استعمال کیا۔

ڈاکٹر برنارڈ (آکسن) کا قول ہے کہ گھڑیوں میں لنگر کا استعمال پہلے عربوں ہی نے کیا۔ مسجدِ دمشق کی گھڑی مشہور ہے۔

طب۔ عرب[1] پہلے لوگ تھے جنھوں نے طب کے ترقی دینے میں کیمیا کو عملی طور پر استعمال کیا۔ وہی لوگ تھے جنھوں نے یورپ اور ایشیا میں مفرد و مرکب ادویات کی قرابادینیں شائع کیں۔ DISPENSATORIES, PHARMACOPOEIAS جن میں معدنی نسخہ جات بھی تھے۔ انہوں نے اپنی سلطنت میں جابجا ہسپتال قائم کئے جہاں غربا کا مفت معالجہ کیا جاتا تھا۔ انکو دارالشفا یا مارستان کہتے تھے (مخففِ بیمارستان)۔

روجر بیکن اور ریمانڈ لی RAYMONDLULLY کیمیا کی طرح طب میں بھی اُنکے شاگرد تھے البرٹ بزرگ نے ALBERT MAGNUS جو اُس زمانے میں یورپ میں ہر فن کا اُستاد اور جربرٹ کی طرح جادوگر مشہور تھا عربوں ہی سے ارسطو کے مسائل سیکھے۔ چھ سو برس تک ابن رشد اور ابنِ سینا علمِ طب کے مستند مصنف مانے جاتے تھے۔

لُووین LOUVAIN اور مُوں پیلیئے MUNTPELIER کے دارالعلوموں میں اُنکی تصنیفات پر اٹھارھویں صدی تک شرحیں لکھی جاتی تھیں۔

طب میں عربوں کے اصلی شاگرد یہودی تھے اور یہودی ہی قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے اعلیٰ و اسفل طبقوں کے طبیب تھے۔ اگرچہ انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اُنکے بغیر بادشاہوں

[1] ڈریپر جلد دوم ۔ ص ۴۰ ۔

تک کا گزارا نہ تھا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یورپ کے پہلے طبی کالج کی عربوں ہی نے بنا ڈالی اور وہ طبی کالج صقلیہ کے شہر سلرنو میں تھا۔ نارمنوں نے جب گیارھویں صدی میں عربوں کو اس جزیرہ سے نکال دیا تو انھوں نے عربوں کے جملہ نظاماتِ ملکی و تعلیمی کو بدستور قائم رکھا۔ بارھویں صدی میں راجر فارمن نے اپنے احکام عربی یونانی اور لاطینی تینوں زبانوں میں جاری کئے۔ سکّوں پر بھی عبارت نصف عربی میں اور نصف یونانی و لاطینی میں ہوا کرتی تھی بعض پر صلیب ہوتی بعض پر ہلال اور بعضوں پر دونوں نشان تھے۔ اسی طرح سلرنو کا یہ طبی کالج بھی مدتوں یورپ والوں کا طبی مدرسہ بنا رہا اور یورپ بھر کے طبیب اسی مدرسہ کے مسلّماتِ طب کے مطابق عمل کرتے رہے۔

مول پیلیئے MONTPELIER کی یونیورسٹی جس کی بنا ۱۲ سنہ ء میں ارغینوں ARAGONESE نے ڈالی اُس کا شعبۂ طبیہ عربوں ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ اُس زمانے کی سب سے مشہور اور سب سے اعلےٰ یونیورسٹی تھی۔

عرب اطبا دوائیں لیکر مختلف جگھوں میں دورہ کرتے تھے۔ وہ تبدیلِ آب و ہوا کے فوائد سے خوب آگاہ تھے۔ ابنِ زہر AVENZOAR شبیلوی نے ثابت کیا کہ انسان کی طبیعت جو افعالِ جسمانی پر حکمران ہے عموماً بطور خود بلا دوا کے امراض کو دفع کرسکتی ہے۔ آجکل اس بات کو یورپ کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر تسلیم کرتے ہیں۔

عرب ادویۂ مرکبہ کے موجد تھے۔ بیہوشی کی دوا دینا، ریشمی ٹانکوں کا استعمال کرنا جاری خون کو ٹھنڈے پانی سے بند کرنا یہ سب انہیں کی ایجادیں ہیں۔ موسیو لی بان کہتے ہیں کہ عرب اطبا ہمارے ڈاکٹروں سے زیادہ مریض کُش نہ تھے۔

جرّاحی۔ فنِ جرّاحی میں البتاسس ALBUCASIS نے آلاتِ جرّاحی ایجاد کئے، چودھویں صدی تک سب یورپی جرّاحوں کی تصنیفات کا دار و مدار اُس پر تھا۔ ۱۸۶۱ء میں اُسکی عملی ہدایات پھر طبع کی گئیں۔

ہیئت۔ علمِ ہیئت میں یعقوب بن اسحاق البومعشر ALBUMAZAR اور البتانی ALBATEGNIUS کی تصنیفات یورپ میں مشہور تھیں اور موخر الذکر ہیئت دان

کی علم ہیئت کی میزانیں" لاطینی میں ترجمہ ہو کر صدیوں یورپ کے علم ہیئت کی بنیاد سمجھی گئیں۔ الفانسو دہم (جو عاقل کے لقب سے مشہور ہو گیا) اُس نے بھی اپنے انکشافات عربی کتابوں سے اخذ کئے اور وہ مشہور یہودی ابن ہزارا جسکو اعظم اور عاقل اور قابل تعریف کے القاب دئے گئے تھے البنانی کی تصنیفات سے علم ہیئت پڑھ کر یورپ میں عالم مشہور ہو گیا۔

عربوں نے ہیئت میں اُصطرلاب اور لبنہ QUADRANT کی ایجادیں کیں اور یورپ کی سب سے پہلی رصد گاہ کے بانی وہی تھے۔ یہ رصد گاہ جسے یورپ میں جرالڈ GIRALDA کہتے تھے اشبیلیہ کے شہر میں بنائی گئی تھی۔ عربوں کے مُلک سے نکل جانے کے بعد جاہل ہسپانیوں نے اُسے گھنٹہ گھر میں تبدیل کر دیا۔

یورپ کو پہلے پہل ہیئت کی تعلیم محمد فرغانی سے حاصل ہوئی۔

ابن ہیثم۔ اُس وقت کا سب سے مشہور سائنسدان حسن ابن ہیثم ALHAZEN تھا جو علاوہ ہیئت دان ہونے کے علم مناظر و مرایا OPTICS اور طبعی جغرافیہ میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ مناظر و مرایا پر اُسکی تصنیفات لاطینی اور پھر اور یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ اُس نے یونانیوں کے نظریہ بصارت THEORY OF VISION کو غلط قرار دیکر بتایا کہ روشنی اشیاء مرئی سے آنکھ میں آتی ہے نہ کہ آنکھ سے اُنکی طرف جاتی ہے۔ اُس نے دونوں آنکھوں سے ایک شئے کا یکساں نظر آنا کرۂ ہوا کو شعاع نور کا بہ شکل قوس قطع کرنا سمجھایا اور یہ ظاہر کیا کہ چاند اور سورج اور تارے طلوع سے پیشتر اور غروب ہونے کے بعد بھی ہمیں نظر آتے ہیں جو کہ ایک تعجب انگیز انکشاف ہے اُس نے ثوابت کے ٹمٹمانے کا راز، انعکاس و انعطاف ضیاء کے مسئلے جھٹ پٹے کی کیفیت اور ہوا کا وزنی ہونا بتایا۔ تیرنے والے اجسام کا پانی میں تھوڑا سا ڈوب جانا، اجسام کا کرۂ ہوائی کے مختلف حالات میں مختلف الوزن ہونا گرتی ہوئی اشیاء کے اوقات و سرعت رفتار۔ غرض ان سب باتوں پر ایک نئی روشنی ڈالی۔

علم جرثقیل۔ وہ علم جرثقیل MECHANICS کا ماہر بھی تھا۔ اُس نے اجسام کی کثافت DENSITY کی میزانیں تیار کیں اور وہ کشش ثقل کے مسئلے کو صاف طور پر سمجھ گیا۔

لے ڈریپر جلد ۲ - صفحہ ۴۲ -

ڈاکٹر ڈریپر کہتے ہیں کہ اگرچہ سات صدیاں ابنِ ہیثم کو ہم سے جدا کرتی ہیں لیکن ہمارے زمانے کے سائنسدان اُسے اپنا معاصر خیال کر سکتے ہیں۔ بالخصوص اس لئے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے یورپ میں حیوانات کی تدریجی ترقی یعنی مسئلہ ارتقاء کو مانا اور اُسکی بڑے زور سے تائید کی + سیّاروں کے افلاک یعنی دائرہ حرکت کا بیضادی ہونا اور زمین کا آفتاب کے گرد حرکت کرنا ان دونوں مسئلوں کو عربوں نے کیپلر اور کاپرنکس سے پہلے معلوم کر لیا تھا + مامون الرشید کے حکم سے مہندسوں نے کرۂ ارض کے ایک درجے کی پیمایش کی اور محیط کرہ کو ۲۴ ہزار میل مشخص کیا +

علم نباتات وحیوانات - علمِ نباتات BOTANY وحیوانات ZOOLOGY میں ابو عثمان رازی اور دیگر حکما نے نئی نئی معلومات کا اضافہ کیا +

علم طبقات الارض - علمِ طبقات الارض GEOLOGY کی طرف بھی عربوں نے توجہ کی بُوعلی سینا کی کتاب الاحجار میں پہاڑوں کی ساخت اور اصلیت کی نسبت ایک باب ہے جو حال کی تحقیق سے کچھ دُور نہیں۔ وہ پہاڑوں کے بننے کے دو سبب بتاتا ہے ایک تو ارضی جنبشیں اور دوسرے پانی کا عمل +

جغرافیہ - جغرافیہ میں اہل یورپ نے صدیوں ادریسی کی تصنیفات پر اکتفا کی اور سترھویں صدی میں جب ابراہیم ہنکل میں ABRAHAMHINCKELMANN جغرافیہ کی اغلاط و اسقام کو درست کر رہا تھا تو اُس نے کہا کہ عربوں نے ہم کو اس علم میں ایسی مدد دی ہے جس کا شکریہ ہم سے ادا نہیں ہو سکتا + ابن یونس اس زمانے کے کسوف وخسوف اور دیگر طبعی حادثات کی بابت ہمیں مفید باتیں بتاتا ہے۔ سُورج پر دھبّوں کا ہونا ابن رشد کی دریافت ہے +

عرب سیاحوں (ابن بطوطہ ابوالحسن البیرونی وغیرہ) عرب تاجروں عرب ملاحوں اور عرب طالبانِ علوم نے اپنے مختلف فرائض کی انجام دہی میں جغرافیہ کے علم کو اپنے اسفار کی معلوماتِ مختلفہ سے بہت ترقی دی + عرب لوگ تاجر تو ہمیشہ سے تھے ہی اسلام کے تمدن کے زمانے میں وہ بحری سفروں کے مشتاق بھی ہو گئے۔ انہوں نے تجارت کے بحری راستے قائم کر لئے اور قطب نما کے ذریعے سے وہ بعض غیر معلوم ملکوں میں جا پہنچے + کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسی طرح جزیرۂ ایزورز (AZORES) کو دریافت کیا اور بعضوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ وہ امریکہ تک پہنچ چکے تھے + یونانیوں کے مقابل میں عرب جغرافیوں کی صحت قابل غور ہے۔ ادریسی کے جغرافیہ

میں متعدد نقشے بھی تھے۔ ایک نقشہ میں نیل کا منبع اُن بڑی خطِ استوا والی جھیلوں میں دکھایا گیا ہے جنہیں اہلِ یورپ نے قریب ہی کے زمانہ میں دریافت کیا ہے، واسکوڈی گاما اور کولمبس کی دریافتوں میں عرب ہی اُنکے ہادی تھے *

PEDRUDECOVILHO پیڈرو ڈی کوول[1] ہونے شاہ جون ثانی کو قاہرہ سے کہلا بھیجا کہ میں نے عرب ملاحوں سے سُنا ہے کہ افریقہ کے بر اعظم کی ایک جنوبی راس ہے اور اُس راستے سے اس تاریک خطۂ زمین کے گرد گھوم کر جا سکتے ہیں۔ اُس نے ساتھ ہی افریقہ کا ایک عربی نقشہ بھی بھیجا۔ یہ نقشہ واسکوڈی گاما۔ پرتگیز سیاح کے مشہور سفر ہند میں اُس کا رہبر تھا۔ وہ ۹ جولائی ۱۴۹۷ء کو پرتگال سے روانہ ہُوا۔ بیس نومبر کو وہ راسِ امید CAPE OFCOODHOPE سے گذرا یکم مارچ ۱۴۹۸ء کو اُس نے افق پر چند جہاز دیکھے۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ وہ عرب ہیں اور واسکوڈی گاما کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہُوئی کہ اُنکے پاس آلاتِ جہازرانی مثل قطب نما البنہ بحری نقشے وغیرہ ہیں جو پرتگیزی عجائبات سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اس افریقی راستے کی دریافت دنیا کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت اور دلچسپی رکھتی ہے۔ اسکے بعد ہندوستان سے براہ راست بحری تجارت ہونے لگی اور یہ تجارت عرصہ تک جاری رہی *

کولمبس ہمیں بتاتا ہے کہ جب جنوا کی مشرقی تجارت ترکوں اور تاتاریوں کے حملوں کی وجہ سے بند ہو گئی تو ابن رشد کی تصنیفات کے مطالعہ سے اُسے یہ خیال آیا کہ ہندوستان کا ایک مغربی بحری راستہ دریافت کرنا ممکن ہے۔ کولمبس نے اپنے خیال کو ایک عملی جامہ پہنایا اور چند مہینوں کے بعد ایک نئی دُنیا دریافت کر لی *

تاریخ۔ مُسلمانوں کو ہمیشہ سے علمِ تاریخ کا بہت شوق رہا ہے۔ یہ شوق عربوں ہی نے مہذب لوگوں کے دلوں میں ڈالا۔ جس وقت انہوں نے اسلام کی بدولت میدانِ تمدن میں قدم رکھا اُنکے دلوں میں اپنے واقعات کو قلمبند کرنیکی امنگ پیدا ہُوئی اور اس امنگ نے رفتہ رفتہ انہیں ایک باقاعدہ اور باترتیب علم کی بنیاد قائم کرنے کی ترغیب دی *

عربوں نے دُنیا میں پہلے پہل فلسفۂ تاریخ اور فنِ تنقید کی ضرورت کو سمجھا اور انہوں نے تاریخ کی نظریات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ ساری ادبی دُنیا ابنِ خلدون کے بے نظیر مقدمہ سے بخوبی واقف

---

[1] ڈریپر جلد دوم ص ۱۵۴

ہے علم تاریخ کے اصولوں کو جس خوبی اور وضاحت سے اس مورخ نے بیان کیا ہے۔ یقیناً اس سے پہلے دنیا کے کسی مورخ نے نہیں کیا اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ اصولِ تاریخ کے سمجھنے اور واضح کرنے میں موجودہ مورخین یورپ سے اس کا رتبہ کچھ کم نہیں ہے ؛

ابن حیان (جس نے سپین کی دو تاریخیں لکھیں ایک دس اور دوسری چالیس جلدوں پر مشتمل ہے) مسعودی طبری اور ابن الاثیر۔ غرض ان سب مورخین نے ضخیم اور بیش بہا کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں !

یہ بات ظاہر ہے کہ ایسی تصنیفات وہی قوم پیدا کر سکتی ہے جو بہت ترقی کر چکی ہو ؛

اعداد و شمار۔ اعداد و شمار کی طرف عربوں نے خاص توجہ کی ؛ مشتاقان علم دنیا میں ادھر سے ادھر نئی نئی معلومات کی ٹوہ میں پھرتے رہتے تھے اور ہم یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں ۔ کہ باوجود ریل وغیرہ کے نہ ہونے کے عرب حکما و علما علم و ہنر کی جستجو میں اقصائے عالم میں یوں ہی برسوں سرگرم سفر رہتے تھے جیسے آجکل یورپ اور امریکہ کے عالم اور سائنسدان !

حکایات و امثال۔ انکی حکایات و امثال سے اندلس اور یورپ نے بہت سی امثال اخذ کیں ڈون کوِاک سٹ DONQUIXOTE کی بہت سی شہرہ آفاق مثلیں اور فقرات عربی الاصل ہیں ؛

کتبِ رجال BIOGRAPHIES کا خیال اول اول انہیں سوجھا۔ آج یہ بات کس قدر مغربی معلوم ہوتی ہے کہ جب ایک مشہور عالم یا سیاست دان مر جاتا ہے تو اسی وقت اس کی سوانح عمری دنیائے ادب میں رونما ہو جاتی ہے اور شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ یہ بھی عربوں کی بتائی ہوئی راہ ہے !

دائرۃ المعارف۔ این سائی کلوپیڈیا ENCYCLOPAEDIA کا خیال بھی کچھ نیا نہیں۔ محمد بن عبداللہ کی مشہور تصنیف "دائرۃ المعارف" بعینہ اسی قسم کی کتاب تھی !

لغات۔ ہر علم کی لغاتیں جدا جدا موجود تھیں۔ اور طلبا کو اپنے مطالعہ میں اس طرح جہالت کا منہ نہ تکنا پڑتا تھا جیسے آج کل مشتاقانِ اردو کا حال ہو رہا ہے !

ریاضی۔ ریاضی میں عربوں کی مہارت مشہور ہے۔ انہوں نے الجبرا ہندوؤں سے سیکھا اور

اہلِ یورپ کو سکھایا۔ اصولِ جبر و مقابلہ میں اقلیدس سے کام لینا انہیں کی ایجاد ہے۔ علمِ مثلث کرّوی کو انہوں نے ہی ایک جدا علم بنا دیا۔ البغدادی نے مساحت پر جو کتاب لکھی ہے وہ اس قدر اعلےٰ پایہ کی ہے کہ اُس کو اقلیدس کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ یہ اُسی کی گم شدہ تصنیف ہے۔

اُس زمانے میں عربوں کو ریاضی و ہندسہ سے ایسی ہی الفت تھی جیسی آجکل کے مسلمانوں کو اُس سے نفرت ہے۔ عربوں کا اور قوموں کے مقابل میں اعلےٰ ریاضی دان ہونا ایسا ہی ضرب المثل تھا جیسا آج کل کے مسلمان طلباء کا ہندو طلباء کے مقابل میں ناقص ریاضی دان ہونا مشہور ہے۔

موسیقی۔ یہ بات اکثر لوگوں کے لئے باعث تعجب ہوگی کہ موسیقی کے فن میں بھی جس سے مغربی لوگوں کے خیال کے مطابق اہلِ مشرق کو مطلق مس نہیں مغربی مورخین نے یورپ کی موسیقی پر عربی اثرات کا اندازہ کیا ہے[۵۷]۔

اٹھارھویں صدی میں فرانسیسی مصنف رُوسو ROUSSEAU نے یہ تجویز پیش کی کہ موسیقی کو ہندسوں میں لکھا جائے۔ اس سے صدیوں پہلے عربوں نے ہندسوں ہی کے ذریعے سے اپنی موسیقی کو قلمبند کیا۔

ویاردو کہتا ہے کہ روس اور ہسپانیہ کی عام موسیقی میں بہت مشرقیت پائی جاتی ہے میں نے ماسکو میں کریملن KREMLIN کے میناروں کے نیچے انہیں راگنیوں کو سنا جو میں اُس سے پیشتر الحمرا کے باغوں میں سُن چکا تھا۔ دونوں جگہوں میں اُن لوگوں کی زبان سے میں نے عربی موسیقی کی زندہ آوازِ بازگشت سُنی۔

(باقی) (البشیر احمد)

---

۵۷ مورخوں کی تاریخ ص ۸۲-۲-۸۳ -

رباعیاتِ گرامی

درکشمکش اند چار عنصر پیہم
آتش با باد و خاک با آب بہم
دیوانگیٔ بلاکشانِ اُمید
ہنگامۂ زندگیٔ ما زد برہم

سر در سرِ ذوقِ انتظارے کردیم
از خویش برآمدیم و کارے کردیم
ہر تارِ نفس کہ بود سر رشتۂ عمر
در سلسلۂ لیل و نہارے کردیم

جامِ صہبائی[1]

تاریک ہیں زندگی کی راہیں ساقی!
ظلمات فزا ہیں میری آہیں ساقی!
ہو جلوۂ آفتابِ پیمانۂ مے
ہوں نور سے لبریز نگاہیں ساقی!

یا غرقِ شرابِ شادمانی ہوں میں
یا وقفِ بلائے آسمانی ہوں میں
سرشارِ طرب ہوں یا رہینِ غمِ دہر
انجام مرا فنا ہے فانی ہوں میں

کچھ اوج ہے اور نہ پستی پستی
یعنی ہے عدم عدم، نہ ہستی ہستی
خمخانۂ حُسنِ جاوداں ہے دُنیا
اور گرمیٔ زیست کیف و مستی ہستی

دامانِ سحر کی گلفشانی فانی
شبہائے بلائے آسمانی فانی
یہ لمحۂ عشرت ہے غنیمت ساقی!
بھر جام کہ زندگی ہے فانی، فانی!

---

[1] حضرت اثر صہبائی نے سو کے قریب رباعیات لکھی ہیں جو عنقریب "جامِ صہبائی" کے نام سے شائع کیجائینگی صہبائی کی رباعیات ایک خاص رنگ میں لکھی جا رہی ہیں وہ ان رباعیات میں خیام کے تخیل اور حافظ کے مستانہ طرزِ نگارش کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں امید ہے کہ ناظرینِ ہمایوں ان رباعیات کو دلچسپی سے پڑھینگے ؎

اکبر اور ہاتھیوں کی جنگ

شہنشاہ اکبر ہاتھیوں کا بہت شوقین تھا انکی طبیعت اور ڈھنگ سے خوب واقف اور بپھرے ہوئے ہاتھیوں پر چڑھنے اور انکو قابو میں لانیکا والہ وشیدا تھا۔ اسے ہاتھی پر چڑھنے کے لئے سیڑھی کی حاجت نہ تھی بلکہ سونڈ یا کان پکڑتا، اسکی ٹانگ پر پیر رکھتا اور اچھل کر گردن پر سوار ہو جاتا تھا۔ وہ بہت آسانی سے ایک ہاتھی سے دوسرے پر پھلانگ سکتا اور اسکی ننگی پیٹھ پر سواری کر سکتا تھا۔ اکبر کا یہ بہت مرغوب داؤں تھا کہ کسی درخت پر چڑھ جاتا۔ اور وہاں سے کود کر پاس سے گذرتے ہوئے ہاتھی کی پیٹھ پر آبیٹھتا۔ ہاتھی گھبرا کر اسے گرانے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ کچھ یوں میخ کی طرح جم جاتا کہ اس حیوان کی سب کوششیں ناکام رہتی تھیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ ایک بہت بڑا ہاتھی مست ہو کر سیدھا شہر میں جا گھسا جس سے سارے شہر میں ایک ہلڑ مچ گیا۔ اس بات سے مطلع ہو کر اکبر فوراً موقع پر پہنچا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ سامنے کی ہر چیز کو اٹھاتا اور پٹکتا جھومتا جھامتا بڑے بڑے قدم مارتا ہوا آ رہا ہے اکبر ایک بالاخانہ پر چڑھ گیا۔ جونہی کہ وہ پاس سے گذرا اکبر پھاند کر اسکی پیٹھ پر جا بیٹھا۔ اور پھر اس کو اتنے چکر دئے اور دوسرے مختلف طریقوں سے پریشان کیا کہ ہاتھی جھلا کر اس کو گرانے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام ہو کر اس قدر تھک گیا کہ اکبر خاموشی سے اسے فیلخانہ میں لے گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ وہ ابھی ۱۴ سال ہی کی عمر کا تھا۔ اکبر عموماً اس قسم کے خطرناک مشغلوں میں مشغول رہتا تھا جس سے اسکے اتالیق بیرم خاں کو اس کی سلامتی کی طرف سے ہر وقت خوف رہتا تھا۔ مگر وہ اس قدر جسور اور مشہور لڑکا تھا کہ وہ ان کھیلوں سے باز نہ رکھا جا سکتا تھا۔

لکھنا ہاتھی اپنی تیزی و تندی میں مشہور تھا۔ ایک دن اکبر نے اس پر سوار ہو کر ایک دوسرے ہاتھی سے جو اسی قسم کا تھا اسے لڑا دیا۔ وہ لکھنا کی گردن پر بیٹھا یہ خوفناک کھیل دیکھ رہا تھا۔ کہ اتنے میں لکھنا نے دوسرے ہاتھی کو بھگا کر اس کا سختی سے تعاقب کیا۔ دوڑتے دوڑتے لکھنا کے اگلے پیر ایک گندے نالے میں پڑ گئے۔ پیر نکالنے کی جد وجہد میں ہاتھی کی پیٹھ پر کا سامانِ نشست پشت سے اتر گیا

جس کے ساتھ ہی اکبر بھی نیچے کو چلا مگر اتفاق سے اس کا ایک پاؤں کہیں اٹک گیا۔ اس نظارہ سے خدام و ملازمین پر حیرت طاری تھی۔ مگر اکبر مطلق پریشان نہ ہوا۔ اس نے اپنا پاؤں چھڑایا اور پھر کود کر گڑھے سے نکلنے کی جدوجہد کرتے ہوئے حیوان کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھی کی مستی رفوچکر ہو گئی۔ اور اطمینان سے اُسے فیلخانہ میں لے گئے۔ بیرم خان خانان نے اشرفیاں اسکے سر پر سے نچھاور کیں۔ اور غربا و مساکین کو شکر گزاری کے طور پر کھانا کھلایا کہ اکبر ایسی نازک اور خطرناک حالت سے بال بال بچ نکلا۔

ایک دفعہ شاہی فیلخانہ کا ایک ہاتھی بہت بگڑ گیا جس کی شہنشاہ کو اطلاع دی گئی۔ اکبر اسے میدان چوگان میں لے گیا۔ اور اُس پر سوار ہو کر اسے چند تیز تیز چکر دیکر اُٹھایا بٹھایا۔ آخر اسکی سب سرکشی رفع ہو گئی۔ اور ہوش درست ہو گئے۔ اکبر نے اس سے لوگوں کو سلام کرایا اور پھر اس سے ہاتھیوں کے کرتب کرائے۔ اسکے بعد ایک دوسرا مست ہاتھی طلب کیا گیا۔ اور پہلے ہاتھی کو اس سے لڑا دیا۔ اکبر کے خدام بہت مضطرب تھے مگر مداخلت کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ جب ان دونوں ہاتھیوں میں ٹکریں ہونے لگیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دو پہاڑ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ اتکہ خان نے اپنا جسم کالا کیا اور سر ننگا کر کے (جو کہ مجرموں کی علامت ہوتی تھی جو کسی بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے تھے) نہایت الحاح و عاجزی سے عرض کیا کہ بادشاہ ہاتھی پر سے اُتر آئیے۔ مگر اکبر نے نہ صرف یہ کہ اس صلاح کو نہ سنا بلکہ دھمکی دی کہ اگر کوئی پھر ایسی صلاح دیگا تو وہ لڑتے ہوئے ہاتھیوں کے درمیان کود پڑیگا۔ زمین کو ہلا دینے والی چند ٹکروں کے بعد دوسرا ہاتھی بھاگ نکلا۔ پہلے ہاتھی نے سرگرمی سے اس کا تعاقب شروع کیا۔ دوسرے ہاتھی نے بھاگتے ہوئے دریائے جمنا کا رخ کیا۔ جب لوگوں کو یہ یقین ہوا کہ ہاتھی تو کشتیوں کے پل کی طرف جا رہے ہیں۔ تو وہ اکبر کی سلامتی کے خیال سے تھرتھرانے لگے۔ جلد ہی دوسرے ہاتھی نے کشتیوں میں قدم رکھدیا اور اسکے پیچھے پہلے ہاتھی نے بھی۔ کشتیوں کی ہاتھیوں کے سامنے کیا بساط تھی اتنے بوجھ سے لگیں دبنے اور جھومنے ڈبکیاں کھانے اور اچھلنے۔ جو لوگ یہ نظارہ دیکھ رہے تھے ہر گھڑی ان کو یہ خیال آتا تھا کہ ہاتھی دریا میں اب ڈوبے کہ اب ڈوبے۔ مگر خوش قسمتی سے کشتیاں اُلٹیں نہیں۔ ہاتھی صحیح و سالم پار اُتر گئے۔ مگر اب وہ اتنے تھک گئے تھے کہ آسانی سے آنکس کے اشاروں پر چلنے لگے۔ شہنشاہ جہانگیر اپنے توزک میں اس حادثہ کے ذکر میں اکبر کی زبانی

بیان کرتا ہے کہ اس موقع پر خود اسکی حالت مستوں کی سی تھی اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس ہنگامہ میں اسکی جان کی خیر نہیں مگر اب چونکہ وہ اس میں آچکا تھا اسلئے اس خطرناک موقع پر اسکی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ واپس ہو جائے اور بزدلی کا داغ لے

انہی ہاتھیوں کی لڑائیوں میں ایک دفعہ راجہ بیربل جو بہت موٹا تھا واقع ہُوا تھا ایک مست ہاتھی اسکے پیچھے جھپٹا اکبر نے جو اسوقت گھوڑے پر سوار تھا۔ بیربل کو جان جوکھوں میں دیکھا گھوڑا دوڑا کر ہاتھی اور اسکے درمیان آگیا جس سے ہاتھی کی توجہ اس طرف سے ہٹ گئی اور بیربل اس قابل ہُوا کہ کسی امن کی جگہ پہنچ جائے، ہاتھی اکبر کو دیکھتے ہی دیوانگی بھول کر دوڑتا ہُوا رک گیا۔ یہ بات بھی حسب معمول اکبری اقبال کا کرشمہ بتائی جاتی ہے۔ اگرچہ اغلب یہ ہے کہ ہاتھی نے اپنے آقا کو پہچان لیا اور وہ اسے دیکھ کر آگے بڑھنے سے باز رہا ؛

اکبر طبعی طور پر بہت سخی اور معاف کرنیوالا انسان تھا۔ مگر وہ اپنے دربار کے امرا اور متعلقین کو ہاتھیوں کے متعلق دھوکا دینے کو کبھی معاف نہ کرتا تھا۔ اسکا محبوب ترین جنرل خان زمان اور اسکے علاوہ اور بھی متعدد امراء محض اسی جرم کی پاداش میں کلیتہً برباد ہو گئے جبکہ انکے متعلق معلوم ہُوا کہ انہوں نے تمام اعلیٰ درجہ کے ہاتھی دربار میں پیش نہیں کئے جو نئے مفتوحہ علاقوں سے ہاتھ آئے تھے، ایسی حالت میں شاہی تاوان یہ ہوتا تھا کہ اس قسم کی غلطی کرنیوالے امرأ کے فیلخانوں کے تمام ہاتھی حضور شہنشاہ میں پیش کر دئے جائیں۔ عموماً اس سے بادشاہ کا غصہ دُور ہو جاتا تھا۔

ہاتھیوں اور ہاتھیوں کی جنگ کا شوق آخر تک اکبر کو رہا۔ البتہ آخر عمر میں وہ محل کے جھروکے میں بیٹھ کر ہاتھیوں کی لڑائی دیکھا کرتا تھا۔ یہ ہاتھیوں ہی کی لڑائی کا ایک واقعہ ہے کہ جہانگیر (شہزادہ سلیم) اور اسکے بڑے بیٹے خسرو میں عمر بھر کے لئے غلط فہمی اور جھگڑا پیدا ہو گیا۔ خسرو شاہی ہاتھی اور شہزادہ سلیم کے ہاتھی میں لڑائی کے ابتدائی انتظامات کر رہا تھا۔ خسرو کے ہاتھی کا پتلا حال تھا کیونکہ جہانگیر کے غضبناک ہاتھی نے اسکے مہاوت کو مار ڈالا تھا۔ خسرو نے معمر شہنشاہ (اکبر) کے سامنے اس سانحہ کو عجیب عجیب رنگ آمیزیوں سے بیان کیا۔ اور اس بات کا بھی اشارہ کیا کہ مہاوت کی موت جہانگیر کے ایما سے واقع ہوئی ہے لیکن آخری بات کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو زیادہ اطمینان نہ ہُوا۔ اگرچہ باپ بیٹے میں جہانگیر کے دوسرے فرزند خرم کی مصالحانہ تدبیروں سے کسی قدر صلح ہو گئی مگر تاہم انہوں نے ایکدوسرے کو کبھی معاف نہیں کیا۔ خسرو نے اپنے ولیعہد نامزد کئے جانیکے لئے بہت سازش کی مگر سلیم کی تمام نامناسب حرکتوں کے باوجود اکبر نے اپنے بستر مرگ پر اسی کی جانشینی کا اعلان کیا۔ جب جہانگیر اکبر کی جگہ تخت نشین ہو گیا اور خسرو نے پھر علم بغاوت بلند کیا۔ تو وہ گرفتار کر کے گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا گیا اور وہ وہیں مر گیا؛

(ماخوذ) مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

جستجوئے لامکاں

نہیں اے ساحلِ اُمید کیوں آتا نظر مجھکو
لئے جاتا ہے سیلابِ تمنا تو کدھر مجھ کو

نہیں اے دل جو وہ سروِ خراماں آج گلشن میں
پیامِ یاس دیتا ہے چمن میں ہر شجر مجھ کو

شبِ ہجراں ہے یا اِک بحرِ تاریکی کا طوفاں ہے
سحر ہر ایک ہوتی ہے قیامت کی سحر مجھکو

ستم سے گردشِ دَوراں نے مجھکو پیس ڈالا تھا
کیا چشمِ کرم نے آج منظورِ نظر مجھ کو

مری دیوانہ خوئی مضطرب ہے تنگیٔ جا سے
دکھائی دے رہے ہیں اک قفس یہ بحر و بر مجھ کو

نہیں کیوں طورِ دل یکدم تجلی زار ہو جاتا
جلایا ہے بسانِ شمع کیسا عمر بھر مجھ کو

نہ ہاروں گی کبھی میں جستجو کی تلخکامی سے
کہ پیغامِ عمل دیتے ہیں خورشید و قمر مجھ کو

غمِ ہستی سے وقفِ سوز ہے ہر استخواں یارب
بنایا جلانے والوں نے چراغِ رہگذر مجھ کو

پھرا کب تک رہیگا گوشۂ چشمِ کرم مجھ سے
نہیں مایوس کرتے نالہ ہائے بے اثر مجھکو

(ر ح - ب)

موجودہ فنِ مصوّری پر ایک نظر

آرٹ کیا ہے؟ محض آرٹسٹ یا صنّاع کے کسی ایک جذبہ یا جذبات کا اظہار۔ فنِ شعر، موسیقی، مصوری، بُت تراشی، معماری، فوٹوگرافی وغیرہ مختلف ذرائع ہیں جن سے صنّاع اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ آرٹ کا کوئی نمونہ صرف اس وقت کامیاب کہلا سکتا ہے جب وہ ناظرین یا سامعین کے دل میں بھی وہی جذبہ پیدا کر دے جو صنّاع کے دل میں تھا۔ اور گو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی فن کے بلند ترین پہلو اور باریک ترین محاسن وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس فن سے واقف ہو۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ آرٹ کے کسی نمونہ کا لطف اُٹھانے کے لئے ناظرین یا سامعین بھی صنّاع ہی ہوں۔ مغنّی کا یہ کہنا کہ آپکو میرے گانے میں اس لئے لطف نہیں آتا کہ آپ علم موسیقی سے واقف نہیں ہیں یا شاعر کا یہ کہنا کہ آپ خود شاعر نہیں اس لئے میرے اشعار نہیں سمجھ سکتے بے معنی نہیں تو کیا ہے۔ سُریلا گلا ہو تو رستہ چلتا ہُوا دہقان بھی سُننے کو کھڑا ہو جاتا ہے اور اچھا شعر ہو تو رندِ بادہ خوار سے لیکر زاہدِ صد سالہ تک وجد میں آ جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں آرٹ وہی ہے جس سے ہر ایک اوسط درجے کا مذاق سلیم رکھنے والا اگر کلّی نہیں تو جزوی طور پر حظ حاصل کر سکے اور محض یہی نہ ہو کہ صنّاع کو ایک مجسم معمہ جان کر اگر کوئی تعریف بھی کرے تو صرف اس لئے کہ لوگ اسے اس فن سے بے بہرہ نہ سمجھیں۔

فی الحال ہمیں بحث موجودہ ہندوستانی فنِ مصوری سے ہے جسکے کم و بیش عمدہ یا ناکارہ نمونے ملک کے اخبارات اور رسائل میں وقتاً فوقتاً نظر سے گذرتے رہتے ہیں۔ اور بعض مواقع پر جنکے ساتھ اس قدر مبالغہ آمیز تعریفوں کے پُل باندھ دئے جاتے ہیں کہ اس کاغذی انجینئری کو دیکھ کر انسان حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ گویا ان تحریروں کے لکھنے والے صاحبان کے سوا دنیا بھر میں اور کوئی شخص تصویر کے محاسن و معائب کو دیکھ یا سمجھ ہی نہیں سکتا۔

اگر انصاف سے موازنہ کیا جائے اور نقادانِ فن نادانی کے الزام سے ہراساں ہو کر اصلیت بیان کرنے سے جی نہ چرائیں تو قدیم ہندوستانی اور مغل آرٹ کے مقابلہ میں جنکے نمونے یورپ اور

امریکہ میں اتنی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں موجودہ یا ماڈرن ہندوستانی آرٹ کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا حالانکہ وہ لوگ اپنے رنگ مہینوں کی محنت سے خود تیار کرتے تھے اور آجکل ہر قسم کے تیار شدہ رنگ بازار میں مل جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کی نسبت قدماء کا علم بہت ہی محدود تھا یعنی ڈرائنگ علم تناسب اعضاء۔ اور پرسپکٹو (یعنی فاصلے اور نقطۂ نگاہ کے اختلاف سے جو فرق اشیاء کی صورت اور قد وقامت میں پیدا ہو جاتا ہے) ان میں یورپ والوں کی تکمیل سے سبق حاصل کر کے پہلے کی بہ نسبت بہت ترقی ہو جانی چاہیئے تھی۔ قدیم ہندوستانی آرٹ میں یہ کمال تھا کہ صرف چند خطوں میں بغیر کسی قسم کی رنگ آمیزی یا لائٹ شیڈ کے وہ تصویر میں خط وخال ہی نہیں بلکہ جذبات تک کا اظہار کر دیتے تھے۔ اور یہ اظہار اس قدر زوردار ہوتا تھا کہ اگر ایک سمجھدار بچّے یا آرٹ سے نابلد محض آدمی کے سامنے ان تصاویر میں سے کسی ایک کا خاکہ رکھدیا جائے تو وہ فوراً بتادے کہ مصوّر نے اس میں غصہ پیار حیرت امید وبیم یاس خوشی یا اور کونسا جذبہ دکھانے کی کوشش کی ہے +

اسکے مقابلے میں جدید ہندوستانی آرٹ کو لیجئے۔ عنوان سے تو کیا بعض اوقات خود مصوّر کے گھنٹہ بھر کے لکچر کے بعد بھی آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ تصویر کا مقصد کیا ہے۔ عام طور پر آپکو آڑی ترچھی لکیریں خلافِ عقل ہیئت بالکل ٹیڑھے اور نامتناسب اعضاء نوکدار اور بے طرح خمیدہ انگلیاں بقول راقم کے ایک معزز کرمفرما کے آنکھیں ایسی جیسے بٹنوں کے لئے کاج ہوتے ہیں۔ اور چہرے جذبات تو کیا معمولی علامات زندگی تک سے معرا نظر آئینگے۔ ڈرائنگ کی غلطی تناسب کے نقص اور خلافِ واقعہ یا غیر قدرتی باتوں کیلئے جو کسی تصویر میں ناقابلیت کی وجہ سے یا سہواً رہ گئی ہوں مصوّر یہ کہہ کر دیکھنے والوں کو مرعوب کرنیکی کوشش کرتے ہیں کہ اس میں تخیّل ہے ترنم ہے موسیقی ہے آپ آرٹ نہیں جانتے اس لئے نہیں سمجھ سکتے وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجبوراً مروت سے یا آرٹ سے انجان کہلانے کے خوف سے تعریف کر دینا ہی مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے آرٹ کی یہ حالت ایسے وقت میں ہے جب بعض یورپین مصوّر اپنی تصاویر میں گھوڑوں کتوں اور بے جان اشیاء مثلاً در و دیوار تک سے جذبات کا اظہار کرانے میں کامیاب ہو رہے ہیں +

ان الفاظ کے لکھنے سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے تمام صناع اور انکی تمام تصاویر ایسی ہی ہیں یا ان میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ جدید ہندوستانی طرزِ مصوری کے موجد ٹیگور

کے کام میں عموماً ڈرائنگ اور تناسب اعضا وغیرہ نہایت مکمل اور درست ہوتا ہے۔ اسکی تصویریں دیکھنے سے ہندوستانی آرٹ کی عظمت اور مصوّر کی خطوں ہی خطوں میں طاقتِ اظہار کا اندازہ ہوسکتا ہے، پیکر تصویر کے کاغذی پیرہن میں روح جیسی لطیف شئے کا عکس دکھا دینا کمال نہیں تو کیا ہے۔ خصوصاً رنگوں کی آمیزش اور انکا بظاہر مختلف ہونیکے باوجود ایکدوسرے میں گھل مل کر فنا ہوجانا ہمارے آرٹ کا حصّہ ہے جس میں پنجاب والے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم زیادہ تعداد ہمارے جدید مصوّروں کی ایسی ہے جو انسانی اعضا کی بناوٹ اور تناسب یعنی اناٹومی سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ مصوّر بننے سے قبل انہوں نے یہ ضروری علم حاصل نہیں کیا اور اب ان نقائص کو جو اصل میں انکی ناقابلیت کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں انڈین آرٹ کی خصوصیات بنا کر اسے بدنام کر رہے ہیں۔ انسانی اعضاء تو علیحدہ رہے یورپین مصوّر پھولوں پودوں اور درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ مختلف اقسام کے پودوں میں جن مختلف طریقوں سے چھوٹی ٹہنیاں بڑی شاخوں میں سے نکلتی ہیں انہیں تصویر میں کماحقہ ادا کرسکیں گویا وہ مصوّری کے لئے علم نباتات کا حاصل کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں ہمارے مصوّر جس زمانے یا قوم کے افراد کی تصاویر بناتے ہیں انکے عادات و اطوار طریق زندگی۔ بلکہ لباس تک کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ جس طرح عموماً ہمارے تھیئٹروں میں ایکٹروں کیلئے ایک خاص قطع کا لباس مقرر کر لیا گیا ہے اور خواہ ڈرامے کا محل وقوع چین ہو یا امریکہ۔ مصر قدیم کا واقعہ ہو یا الف لیلہ کا قصّہ یا شیکسپیر کا ڈراما۔ رومۃ الکبریٰ کا زمانہ ہو یا جارج پنجم کا۔ بادشاہ امرا فوج کے افسر ہیرو ہیروئن مذاقیہ اور اور قسم کے کیرکٹر اپنے اپنے پارٹ کے مطابق ہمیشہ وہی لباس پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یعنی جو لباس ایک دن خاقان پہنے ہوئے ہے وہی دوسرے دن کنگ لیر کے بدن پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح بعض مصوّروں نے اپنی تصاویر میں دکھانیکے لئے ایک خاص قسم کا لباس اختراع کر لیا ہے جیسا دنیا کے کسی ملک میں نہ کبھی پہنا گیا نہ آجکل پہنا جاتا ہے۔ انکی تصاویر فقط لباس سے پہچانی جاسکتی ہیں۔ مختلف اقوام کے خط و خال مختلف ہیں۔ تاتاری النسل آریائی افریقی اور عربی اقوام کے چہروں اور بدن کی ساخت میں بیّن فرق ہے۔ فراعنہ مصر کے وقت کی تصاویر اپنا ایک خاص رنگ لئے ہوئے ہیں۔ قدیم یونانی اپنے دیوتاؤں کے بت تیار کرتے وقت پیشانی اور ناک کی ہڈی کو ایک سیدھ میں بناتے تھے اور اس سے انکی دماغی قابلیت کو انسانی عقل سے برتر

ظاہر کرنا مقصود تھا۔ اب اگر کسی قدیم یونانی دیوتا کے چہرے کے ساتھ بدن پر ہندوستانی یا ایرانی یا اختراعی لباس دکھایا جائے یا لیلیٰ کی تصویر دیکھنے سے یہ معلوم ہو کہ کسی جاپانی ماہ وش کو عربی لبادہ پہنا کر کھڑا کر دیا ہے اور بہادر ارجن پر ہلاکو خاں کے بیٹے کا شبہ گذرے تو ان باتوں کو مذاق سلیم کہانتک گوارا کر سکتا ہے خواہ تصویر بذاتِ خود رنگ وغیرہ کے لحاظ سے کتنی بھی دلفریب کیوں نہ ہو۔ یورپ کے مصوّر ایک تصویر تیار کرنیکے لئے بعض اوقات دور و دراز ممالک کا سفر اختیار کرتے ہیں تاکہ وہاں کے حالات کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کر سکیں۔ اور لائبریریوں سے پرانی کتب لیکر جس زمانے کی تصویر بنانا مقصود ہوتا ہے۔ اس وقت کے لباس اور طرز معاشرت کی باریکیوں کے مطالعہ میں مہینوں کی کاوش صرف کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک نامور یورپین مصور میسونیر کا واقعہ مشہور ہے کہ اس نے نپولین اعظم کی ہزیمت خوردہ فوج کی ماسکو سے واپسی کی ایک تصویر بنائی تھی جو اب دنیا کی بہترین تصاویر میں شمار ہوتی ہے۔ اسکی تیاری کے دوران میں صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ برف پر سے ایک بہت بڑی فوج کے گذرنے سے کیا صورت پیدا ہوتی ہے اس نے ایک برف سے ڈھپے ہوئے خطۂ زمین پر کئی دن تک گھوڑے دوڑائے اور ہلکی اور بھاری گاڑیاں چلوائیں اور اسکے بعد تصویر کا وہ بظاہر غیر اہم حصہ بنا یعنی زمین بنائی جس پر فوج جا رہی تھی +

رہا امورِ واقع سے قطع نظر کر کے صناع کا تخیّل کی فضا میں بلند پروازی کی کوشش کرنا اس ضمن میں دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح مبالغہ اور اختراع جائز تو ہے لیکن ایک حد تک۔ اور یہ لازمی ہے کہ خیالی تصاویر کے عنوان بھی خیالی ہی ہوں۔ کشمیر کی پہاڑیوں کا عکس ڈل کی بجائے عدن کے سمندر میں دکھا کر عنوان "نیرنگیٔ خیال" رکھ دیں تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن ایک لمبے تڑنگے حبشی کو پنجابی دہقان کی پگڑی پہنا کر سکندر اعظم کہ دینا صناعی نہیں کچھ اور ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں آرٹ کی قدر نہیں۔ یہ سچ ہے۔ مگر ہمارے آرٹسٹ قدر کرانیکی کوشش بھی تو کریں۔ اگر وہ ایسی ہی تصاویر بناتے رہے جنکو بنانے والے ہی سمجھ سکیں یا صرف ایسے لوگوں کو پسند آئیں جو انکی اصطلاح میں آرٹ جاننے والے یعنی انکے مداح ہیں تو "ہنوز دلی دور است"۔ ہندوستانی ڈرامانویس تو اس لئے عمدہ ڈراما نہیں لکھتے کہ لوگوں کا مذاق ابھی صحیح نہیں ہوا۔ لہذا کافی آمدنی نہیں ہوتی لیکن ہمارے مصور بالکل انوکھے اصول پر چلتے ہیں یعنی نہ تو وہ مذاقِ صحیح کی پروا کرتے ہیں نہ آمدنی کی

فقط کوئی مانے یا نہ مانے اپنی رٹ ہانکے چلے جاتے ہیں کہ ہم بے نظیر ہیں ۔

بعض اوقات اگر کسی ہندوستانی مصور سے یہ کہا جاتا ہے کہ آنکھیں یا ہاتھ یا بدن کا کوئی اور حصہ قدرت کے خلاف ہے اسے اس طرح بنانا چاہیئے کہ درست معلوم ہو تو جواب ملتا ہے کہ اس طرح بنانے سے یورپین آرٹ ہو جائیگا انڈین آرٹ نہیں رہیگا۔ گویا یورپ والوں نے موجودہ تمدن اور سائنس کے ساتھ چہرے کے نقشے اور اعضا کے تناسب کا بھی ٹھیکہ لے لیا ہے یعنی ہم تصویر بھی بنائیں تو ٹیڑھی اور بیڈھنگی ورنہ اس میں ہندوستانیت نہیں رہیگی۔ کیا ہندوستان میں حسین نہیں ہیں ؟ یا ایشیائی شاعری نے ہمارا مذاق اس قدر بگاڑ دیا ہے کہ ہمارا معیار حسن بے طرح خمیدہ انگلیوں کاج ایسی آنکھوں اور بالکل بے جوڑ اعضا ہی پر ختم ہے ؟ اور سب سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ اس کج نگاری کو کبھی تو ہندوستانی مصوری کی امتیازی خصوصیت اور کبھی موجودہ یورپ کے IMPRESSIONIST OR CUBIST آرٹ کا تتبع بتایا جاتا ہے۔ جو اول تو یورپین ہونے ہی کی وجہ سے انڈین آرٹ والوں کے مذہب میں حرام ہونا چاہیئے تھا۔ دوسرے اسکے مداحوں کے اعتقادات عجیب ہیں۔ مثلاً یہ کہ قدرت اصل میں بالکل بدوضع واقع ہوئی ہے اور صناع کا یہ کام ہے کہ دست قدرت کی خامیوں کو دور کرے اور اسے خوبصورت بنا کر دکھائے اس لئے اگر تصویر میں انسان کی دو کی بجائے تین آنکھیں بنادی جائیں تو کوئی حرج نہیں اور دیکھنے والوں کو یہ پتہ چلنا ضروری نہیں کہ تصویر انسان کی ہے جانور کی درخت کی یا کسی ایسی چیز کی جس کا وجود سوائے مصور کے دماغ کے اور کہیں نہیں بشرطیکہ وہ انکی AESTHETIC SENSE پر موثر ثابت ہو۔ اس جمالیاتی حِس یا حِس ششم کی جسے حُسن کا تھرمامیٹر کہنا بیجا نہ ہوگا حقیقت بیان کرنے سے میں قاصر ہوں کیونکہ اسکا وجود شاعروں کی اُس کمر کی طرح جو ؎

"کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے"

اس قدر لطیف ہے کہ نایاب بلکہ معدوم ہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے اخبار پایونیر میں مشہور یورپین مصور آنریبل جان کولیر کی تقریر کے بعض فقرے درج ہیں جو انہوں نے کچھ عرصہ ہوا دار المصنفین کی ایک دعوت کے موقع پر اسی نوزائیدہ IMPRESSIONIST فرقہ کے متعلق کہے تھے۔ وہ ہمارے موجودہ ہندوستانی آرٹ پر اس قدر

صادق آتے ہیں کہ یہاں انکا ترجمہ کردینا نامناسب نہ ہوگا۔ کہتے ہیں "سب سے اوّل مجھے آجکل کے جدید ترین آرٹ کی نسبت دو باتیں محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تو اسکی حد سے زیادہ بدصورتی اور دوسرے بالکل خلاف بشریت ہونا" پھر بت تراش ایپسٹین کی ایک سنگین تصویر کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں اس میں مصوّر نے اپنے نزدیک ایک نہایت حسین عورت دکھائی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی جنگلی حیوان کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ تناسب کا نام نہیں۔ ہاتھ بڑے بڑے پنجوں کی طرح ہیں۔ بدن کا درمیانی حصّہ بہت بڑا اور ٹیڑھا ہے اور سر اور چہرہ کسی پیدائشی دیوانے کی طرح فہم و فراست سے مبرّا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے فیشن ایبل نقادانِ فن اور جدید آرٹ کے حامی اگر کوئی ایسی صورت بازار میں زندہ چلتی پھرتی دیکھ لیں تو خوف سے چیخیں مار کر بھاگ جائیں لیکن یہ تصویر چونکہ ایپسٹین کی بنی ہوئی ہے وہ اسے سینے سے لگانے کو تیار ہیں کیونکہ انکے خیال میں ایپسٹین ان مصوّروں میں شامل ہے جو کسی نامعلوم وجہ سے غلطی کرنیکے ناقابل سمجھے جاتے ہیں" اور آگے چل کر کہتے ہیں "کیا ہماری قوم ایسی ہی بدہیئت واقع ہوئی ہے جیسی تصاویر ہمارے آجکل کے مصوّر بناتے ہیں۔ کیا ہم رینلڈس، گینزبرو اور رومنی کے زمانے کے مقابلہ میں اتنے بدشکل ہوگئے ہیں کہ اب ہمیں ایک بھی ایسی دلفریب تصویر نظر نہیں آتی جیسی وہ بناتے تھے۔ یا اب ویسی صورتیں ہی ناپید ہوگئی ہیں؟ جس تصویر میں انسانی احساسات کو دکھایا گیا ہو وہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی اور اظہار جذبات جو کبھی مصوّری کا جزو اعظم سمجھا جاتا تھا بالکل غائب ہے۔ انسان کی آنکھ کچھ مدت کے بعد ہر ایک نئی چیز کو دیکھنے کی عادی ہوجاتی ہے۔ آجکل کا لباس کا فیشن لے لو۔ عورتوں کی کمر بجائے اُس جگہ قائم رہنے کے جہاں قدرت نے بنائی تھی کھسکتے کھسکتے گھٹنوں سے کچھ ہی اوپر رہ گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو قدرتی حسن کے تناسبات سے بہت دُور چلا جانا بھی عادت سے بھلا لگنا شروع ہوجاتا ہے۔ ہم عام طور پر شادی کرنیکے لئے حسین عورتیں تلاش کیا کرتے ہیں، اس لئے جبتک ہمارا معیارِ حسن قدرت کے قریب قریب رہے خیریت ہے لیکن اگر ہمارے نوجوان ایسی عورتوں کو نگاہِ شوق سے دیکھنے لگ گئے جو موجودہ زمانے کی تصاویر سے مشابہ ہوں تو اللہ ہی حافظ ہے"

خدا کرے ہمارے ہندوستانی مصوّر اور انکے مداح بھی رفیق زندگی بنانے کے لئے ایسی صورتیں تلاش نہ کرنے لگ جائیں جیسی انکی تصویروں میں ہوتی ہیں۔

عطاء الرحمٰن

برسات

۱

گلشن گلشن منظرِ مستی
غنچہ غنچہ ساغرِ مستی
پتّہ پتّہ پیکرِ مستی
چشمہ چشمہ کوثرِ مستی
قطرہ قطرہ جوہرِ مستی

۲

کوئل اور خاموشیٔ صحرا
نغمے اور مدہوشیٔ صحرا
مستی اور ہمدوشیٔ صحرا
بوندیں اور گلپوشیٔ صحرا
ابر اور کیف فروشیٔ صحرا

۳

شام مسکر ابر کے کاکل
محوِ نظارہ گیسوئے سنبل
کیف فزا بوندوں کا تسلسل
مستِ صہبا جام بکف گل
درد میں ڈوبا نغمۂ بلبل

۴

رنگِ شفق ہے دہکا دہکا
غنچے چٹکے گلشن مہکا
شاخیں لچکیں سبزہ لہکا
مرغِ گلستاں کیف میں چہکا
چھائیں گھٹائیں زاہد بہکا

۵

مینہ کی بوندیں ہلکی ہلکی
کیف بداماں کیاری کیاری
نکہت غنچہ بھینی بھینی
سرد ہوائیں مہکی مہکی
بادۂ گل میں بھیگی بھیگی

۶

مستِ نزاکت بادِ خراماں
وادیٔ صحرا کیف بداماں
نکہتِ گلشن کیفِ خمستاں
قوسِ قزح بادل میں نمایاں
کچھ کچھ ظاہر کچھ کچھ پنہاں

۷

اک اک قطرہ روح فزا ہے
سبزۂ خفتہ جاگ اٹھا ہے
ذرہ ذرہ جانِ ضیا ہے
کیف سے پُر آغوش صبا ہے
اک اک جھونکا ہوش رُبا ہے

۸

سبزہ ہے تصویرِ جوانی
دھانی دھانی کاہی کاہی
کیا رنگت ہے پیاری پیاری
"سبز پری" ہے اک اک پتی
یہ رعنائی! یہ زیبائی!

۹

چشمۂ سیمیں جوئے مستی
وادیٔ صحرا کوئے مستی
کیفِ خمستان بوئے مستی
ابرِ سیہ گیسوئے مستی
قوسِ قزح ابروئے مستی

۱۰

جذبے آئے جوشِ نمو پر
جھولے ہیں اور شامِ مسکر
سکھیاں ہیں اور نغمۂ دلبر
سُر دلکش ہیں لَے جاں پرور
یہ منظر ہے جانِ منظر

۱۱

میکش اور میخانۂ عشرت
گردش اور پیمانۂ عشرت
صحرا اور دیوانۂ عشرت
گلشن اور مستانۂ عشرت
جھولے اور افسانۂ عشرت

۱۲

یہ نظّارے یہ کیفیّت
ہیں تکمیلِ بزمِ راحت
اک دنیا ہے مستِ فرحت
اک عالم ہے محوِ عشرت
ہم ہیں روشؔ اف پیکرِ حسرت

روش صدیقی

انتقامؔ



فرانس کی معاشرت

(ترجمہ از عربی)

۱

مسٹر کاپرینی کی زندگی ایک طویل مدت سے کامیاب اور غیروں کے لئے قابل رشک تھی وہ نہایت حسین و جمیل بیوی کا شوہر اور بیش قرار دولت و ثروت کا مالک تھا۔ اسکی شرافت اور خوش خلقی نے لوگوں میں اس کو محبوب بنا دیا تھا آخر زمانہ کا رخ بدلا۔ اب کاپرینی مبتلائے مصائب اور گرفتار گردش تھا انقلاب حوادث کے ہاتھوں اس پر کچھ ایسی مصیبتیں آئیں کہ بیوی اور دولت دونوں اپنے ساتھ لیتی گئیں۔ ایک مدت تک کاپرینی اس انقلاب پر مرثیہ خوانی کرتا رہا۔ لیکن جس طرح مصیبت زدہ دلوں کے نقوش ملال مٹتے مٹتے آخر محو ہو جاتے ہیں کاپرینی کا یہ غم بھی بوسیدہ ہو گیا ٭

اب وہ اس فکر میں تھا کہ اپنی لڑکی ایلین کی تربیت کرے اور اسکو ایک نیک بخت اور سعادتمند لڑکی بنائے۔ اس غرض سے اس نے ایک بینک میں قلیل تنخواہ پر ملازمت کر لی۔ اور اپنے فرائض مفوضہ نہایت کوشش اور تندہی سے انجام دینے لگا۔ ابھی تھوڑی مدت بھی نہ گزری تھی۔ کہ حسن کارگزاری کے بنا پر وہ بینک کا وکیل ہو گیا دن بھر کام کرنیکے بعد شام کو جب وہ گھر آتا تو لڑکی گھر کے کام سے تھک کر چور ہو گئی ہوتی۔ اس خیال سے کہ ایلین کی پریشانیاں دور ہوں کاپرینی نے مناسب سمجھا کہ شادی کرلے لیکن اسکی نظر انتخاب اسکی بدنصیبی کا باعث ثابت ہوئی۔ اس نے اپنی زندگی میں ایک ایسی عورت کو شریک کیا جو بدکردار اور بداخلاق تھی تعیش اور ہوس رانی کے سوا زندگی میں

---

[1] یہ افسانہ ناظم صاحب "دائرہ ادبیہ" مالیگاؤں نے ہمایوں کے لئے بھیجا ہے۔ "دائرہ ادبیہ" وہاں کے مقامی مدرسے "بیت العلوم" کے منتہی طلبا اور دیگر اہل علم حضرات کی ایک ادبی انجمن ہے جس کا مقصد پڑھے لکھے طبقہ میں تحریر و تقریر کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ دائرہ کے کتبخانے کو کتابوں کی بہت ضرورت ہے ٭

اسے کسی چیز کا اہتمام نہ تھا۔ مسٹر کاپرینی کو اس جدید رفیق زندگی سے کچھ فائدہ نہ پہنچ سکا۔ بلکہ آلام و مصائب کی زنجیروں میں چند اور کڑیوں کا اضافہ ہو گیا لیکن اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ زنجیر گلے میں پڑ چکی تھی اسکی لڑکی جو کل تک ایک گھر کی مالک اور منتظم تھی آج ایک سنگدل عورت کی حراست میں مقید تھی جو اس کو من مانی تکلیفیں پہنچاتی تھی ایلین ان تمام مصیبتوں کو خندہ پیشانی اور فراخدلی اور صبر کے ساتھ برداشت کرتی تھی اور محض اس لئے کہ باپ کے سکون و اطمینان میں فرق نہ آئے اس سے کسی بات کا تذکرہ تک نہ کرتی تھی وہ اپنی نئی ماں کے اطوار سے اچھی طرح واقف تھی لیکن دیدہ و دانستہ خاموش تھی کاپرینی رات کو اکثر بینک کے بعض کاغذ لئے آتا تاکہ کثرت مشاغل اور تنگیٔ وقت کی بناء پر دفتر کا جو کچھ کام باقی رہ گیا ہے وہ پورا کرلے۔ اسکی تکمیل کے لئے وہ راتوں کو بیدار رہتا اور اپنی نشست گاہ میں بیٹھ کر نیند کی مدافعت کرتا ہوا کام کرتا رہتا تا آنکہ مدافعت میں ناکام ہو جاتا۔ نیند غالب ہو جاتی۔ اور وہ قلم ہاتھ میں پکڑے سو جاتا اور ابھی تک بیگم صاحبہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ کسی تھیٹر یا رقص خانے میں تمام فضائل انسانی کا خون کرتی ہوئیں تفریح میں مصروف ہوتیں اتنے میں ایلین بیدار ہوتی اور باپ کی یہ حالت دیکھ کر دبے پاؤں وہاں تک جاکر سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھتی اور دفتر کے کاغذ ہاتھ میں لیکر کام ختم کرنیکے بعد اپنے باپ کو بیدار کرتی تاکہ وہ اپنے بستر پر آرام کرے کاپرینی بیٹی کا شکریہ ادا کرتا اور بیگم کے متعلق نہایت غیض و غضب کے لہجے میں پوچھتا کہ کیا وہ ابتک نہیں آئی، ایلین سنجیدگی کے ساتھ نفی میں جواب دیتی۔ کاپرینی جس رنج و قلق کے ساتھ اپنے بستر پر جاتا اسکا علم خدا کو ہے۔

مختصر یہ کہ مسٹر کاپرینی کی زندگی نحوست اور شقاوت سے گھری تھی اور وہ منزل حیات کے نہایت تاریک و سیاہ رستے پر چل رہا تھا۔ اگر اسکے آسمان زندگی پر کوئی منور ستارہ تھا تو وہ اس کی لڑکی تھی جس کی پیشانی میں سعادت کا نور روز افزوں ترقی پر تھا۔

ایک روز جب کہ کاپرینی بینک کے اندر اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا منیجر نے اسکو بلایا۔ اور پانچ لاکھ فرانک کا ایک نوٹ اسکے حوالہ کیا تاکہ دفتر میں درج کر لینے کے بعد داخل خزانہ کردے ابھی وہ اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا اور رجسٹر اُٹھا کر اس خطیر رقم کو لکھنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ کا سپاہی آیا اور کہنے لگا اس ہیئت و حلیہ کی ایک لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے اور اپنا نام

نہیں بتاتی یہ سن کر وہ بے چین ہوگیا اور خیال کیا کہ گھر میں کوئی بڑا حادثہ وقوع میں آیا ہوگا جسکی وجہ سے اسکی لڑکی جو یہاں کبھی نہیں آئی تھی اس سے ملنا چاہتی ہے قلم ہاتھ سے رکھدیا۔ سب چیزیں اسی حال میں چھوڑ کر دوڑا۔ باہر جاکر اس نے دیکھا کہ واقعی اسکی لڑکی بحالتِ شرم و خجالت استادہ ہے اور اسکے ہاتھ میں ایک رقعہ ہے جو اسکی سوتیلی ماں نے دیا تھا۔ رقعہ اسکے ہاتھ سے لیکر پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا کہ "مجھے اسی وقت پانچ لاکھ فرانک کی ضرورت ہے، ایک خوبصورت لباس جو میں ایک دوکان پر دیکھ چکی ہوں خریدوں گی اگر آج میں اپنی یہ خواہش پوری نہ کرسکی تو شاید آپ کل مجھے گھر میں نہ پائینگے۔ فرطِ غضب سے کاپرینی دانت پیسنے لگا پھر اس نے ایلین کو الگ بلاکر کہا جاکر اُس سے کہدو کہ اس قدر رقم تو نہ آج میرے پاس ہے اور نہ کل ہوگی اور شاید سال بھر تک بھی نہ ہوسکے یہ کہکر ایلین پر نہایت غیض آلود نگاہ ڈالی کہ وہ کیوں بینک تک آئی۔ اُس نے کچھ یوں ہی سا سر ہلایا اور خاموش ہورہی اور دبے پاؤں واپس چلی گئی کیونکہ وہ یہ کہکر کہ اس حاضری کا سبب اسکی بیوی ہے اپنے والد کے رنج والم میں اور اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی ✦

کارکنانِ بنک میں ایک دنی الطبع، خبیث القلب اور بداخلاق کارکن بھی تھا، جو ہمیشہ منیجر وکیل کی غفلت کے انتظار میں رہتا، تاکہ کسی گھات سے کچھ روپیہ جیب میں پڑے، کاپرینی کے باہر نکلتے ہی یہ بدباطن کارکن بعض کاغذات دینے کی غرض سے کمرہ میں داخل ہُوا، وکیل غیرحاضر، اور پانچ لاکھ فرانک کا نوٹ میز پر موجود تھا۔ دیکھتے ہی بددیانتی کا جذبہ برانگیختہ ہُوا۔ اِدھر اُدھر دیکھا نوٹ داخلِ جیب کیا، اور وہاں سے اس طرح نکل گیا کہ کسی کو اسکی آمدورفت کی خبر تک نہ ہوئی، کاپرینی بیوی کا رقعہ لئے کمرہ میں آیا اور غصہ سے رقعہ نوچ کر پھینکدیا، میز پر نظر پڑی تو نوٹ غائب دیکھ کر چونک پڑا شدت خوف سے اس پر لرزہ طاری ہوگیا، اِدھر دیکھ اُدھر دیکھ سارا کمرہ چھان مارا، نوکروں سے پوچھا، کارکنوں سے دریافت کیا، لیکن کوئی نہ کہہ سکا کہ اسکی غیرحاضری میں کوئی شخص اسکے کمرہ میں گیا ہے، اب تو وہ چلانے لگا اس کی چیخ نے پورا بینک سر پر اُٹھالیا، شور و فریاد سن کر مینیجر آیا، کاپرینی نے بلاکم وکاست کل واقعہ کہہ سنایا۔ ہاں مگر ایلین کے آنے اور رقعہ دینے کا واقعہ بیان نہ کیا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسکے کسی خانگی واقعہ کی اطلاع کسی غیر کو ہو مینیجر کو شک ہُوا، گو کاپرینی کا ماضی شکوک وشبہات سے پاک تھا، لیکن فقر و افلاس نے بدگمانی کی راہ کھولی، اور یہ کوئی نئی بات نہیں، افلاس ہمیشہ

شکوک و شبہات کا سرچشمہ ثابت ہُوا ہے، مینیجر دوسرے کارکنوں اور نوکروں سے دریافت کرنے لگا کہ حقیقتِ حال منکشف ہو، دروازے کا سپاہی کہنے لگا کہ کچھ پہلے ایک لڑکی آئی تھی اور ایک رقعہ لائی تھی مسٹر موصوف نے غلطی کی ہیں اس سے کچھ کہا اور وہ واپس چلی گئی، اب مینیجر کے شک میں کچھ اور اضافہ ہو گیا، اور وہ کاپرینی کے کمرہ میں آیا، جہاں اپنی جگہ پر وہ تقریباً حواس باختگی کی حالت میں اُلٹ پلٹ کر رہا تھا، مینیجر تمام کمرہ بغور دیکھ رہا تھا کہ کہیں اس رقعہ کا پتہ چلے، میز کے نیچے کاغذ کے نُچے ہوئے ٹکڑے نظر آئے، فوراً ان کو جمع کیا، اور پڑھ لیا، پڑھتے ہی کاپرینی پر گرم نگاہیں ڈال کر کہنے لگا، وہ نوٹ تم نے چرایا ہے اور اپنی بیٹی کو دیدیا ہے، تاکہ تمہاری بیوی اپنا پسند کردہ لباس خرید سکے، اب تو کاپرینی کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے، سانس چڑھنے لگا، اور تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد بمشکل وہ اس قدر کہہ سکا ہاں میری بیوی نے مجھے یہ رقعہ لکھا تھا لیکن میں نے نہایت سختی کے ساتھ یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں ایک مفلس آدمی ہوں میرے پاس اس قدر رقم کہاں، مینیجر صاحب میں ایک شریف آدمی ہوں مجھ سے یہ غلطی نہیں ہو سکتی، لیکن مسٹر لورین (مینیجر) نے ایک نہ سُنی اور عدالت میں مرافعہ پیش کر دیا، ابھی دن بھی غروب نہ ہُوا تھا کہ یہ بچارہ حوالات میں محبوس تھا، یہ خبر سُن کر ایلن کا حال ناگفتہ بہ ہو گیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اب رہیں بیگم صاحبہ تو انہیں یہی فکر تھی کہ وہ مرغوب لباس کسی طرح حاصل ہو اگر اس طرح نہ مل سکا تو کسی اور طرح سہی ۔

مسٹر کاپرینی کو صفائی سے کچھ فائدہ نہ پہنچا، نہ بیٹی کی جد و جہد نتیجہ خیز ثابت ہُوئی اور نہ دوستوں اور پڑوسیوں کی یہ شہادت کامیاب ثابت ہو سکی کہ کاپرینی ایک شریف اور راستباز آدمی ہے، کیونکہ محققین سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مسٹر لورین کو جو ایک مشہور بنک کا مالک و مینیجر ہے اور پھر ایک بڑا آدمی ہے، جھوٹا کہیں، یا اسکی قیاس پیمائیوں کو مشکوک نظر سے دیکھیں، اور یہ کہ کاپرینی جیسا قلاش اور نفیر شخص موقع پاکر بھی نقد اڑا لینے سے دریغ کر سکتا ہے دُنیا میں اس قسم کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، مدعی کا بیان، بیوی کے رقعہ کا واقعہ معلوم کرنیکے بعد منصف نے کاپرینی کو صاف مجرم قرار دیدیا، یہ فیصلہ سُن کر ایلن کے ہوش اُڑ گئے، اسکے لئے صرف یہی چارۂ کار تھا کہ وہ مسٹر لورین کے پاس جائے اور گڑگڑا کر اپنے والد کی بریّت میں امداد کی درخواست کرے، لہٰذا وہ گئی اور لورین سے ملی ۔ ایک حسین و جمیل لڑکی کو سامنے دیکھکر وہ کچھ مرعوب سا ہو گیا، آنے کی وجہ پوچھی اور تھوڑی

دیر تک گفتگو ہوتی رہی، ایلن کی سادگی اور اسکا حسن وجمال دیکھ کر لورین کی نیت خراب ہوگئی اور دل ہی دل میں کہنے لگا یہ شکار نہایت آسانی سے ہتھے چڑھ جائیگا، لیکن وہ اس خیال میں اُسی طرح غلطی پر تھا جس طرح اسکے باپ کے متعلق اپنے قیاس میں۔ آنے کی غرض پوچھنے کے بعد لورین کچھ ایسی باتیں کرنے لگا جنہیں ایلن تھوڑی دیر تک بالکل نہ سمجھ سکی اور سمجھتی کس طرح اس سے قبل کبھی اسے اس قسم کی گفتگو کرنیکا اتفاق ہی نہیں ہُوا تھا، اب لورین نے ہاتھ پاؤں پھیلانا شروع کر دیا، ابھی دست درازی کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایلن نہایت غضبناک نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگی، لیکن وہ ایک چھٹا ہُوا بدمعاش تھا۔ پیشقدمی شروع کر دی، ایلن مدافعت میں ناکامی محسوس کرکے فرار ہو جانا چاہتی تھی اور کھڑکیوں اور دروازوں پر نظر کر رہی تھی کہ یکایک اسکی نظر ایک پستول پر پڑی، ڈرانے دھمکانے کی غرض سے فوراً اس نے اسے اچک لیا، ہاتھ میں لیتے ہی فائر ہوگیا جس سے لورین کا صرف ہاتھ زخمی ہُوا، لورین چیخنے لگا، اور چند لمحوں کے بعد ایلن گرفتار ہوکر اس الزام میں حوالات میں داخل ہوگئی کہ وہ مسٹر لورین سے اپنے والد کی رہائی کے متعلق امداد چاہتی تھی، لورین کے انکار پر اس نے پستول نکالا جسے اپنی چادر میں چھپا لائی تھی، اور فائر کر دیا، لیکن نشانہ خطا ہُوا اور موصوف کا صرف ایک بازو زخمی ہُوا۔

مسٹر لورین کے امکان میں تھا کہ وہ حقیقت کا اعتراف کر لیتے، جسے وہ اچھی طرح جانتے تھے اگر وہ ایسا کرتے تو ان کا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ کچھ ہی روز بعد محکمۂ انصاف نے ایلن کو پانچ سال کی سزا دی، اس سے قبل اسی محکمہ نے اسکے والد کو دو سال کی سزا دی تھی۔

۲

ایلن زنانہ قید خانہ کے ایک کمرہ میں داخل کر دی گئی، جہاں پہلے سے ایک اور بوڑھی عورت موجود تھی، یہ ضعیفہ یہاں ایک طویل مدت گذار چکی تھی، آزادی کے دنوں کی یاد اب اسے نہیں آتی تھی وہ یہاں بھی ہنستی اور گاتی تھی، اور تفکراتِ عالم سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی، ایلن کو اس سے ایک بڑی حد تک وحشت معلوم ہُوئی، اور وہ کمرے کے ایک گوشہ میں جا بیٹھی، آلام و مصائب کی یاد نے آنکھوں سے آنسو جاری کرا دیئے، قید خانے کے سپاہی نے اسکے سامنے کھانا لاکر رکھا، لیکن وہ اس کی طرف دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی، جب ذرا طبیعت سکون پذیر ہوئی

وہ ایک مختصر اخلاقی کتاب جسے ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتی تھی، نکال کر پڑھنے لگی، پہلا جملہ جس پر اس کی نگاہ پڑی یہ تھا "العفو اشد انواع الانتقام" یعنے درگذر کردینا شدید ترین انتقام ہے، اس جملہ پر اسکو سخت حیرت ہوئی، اور وہ دیر تک نظر جمائے اسے دیکھتی رہی، یہ پہلا موقع تھا کہ انتقام کا جذبہ اسکے دل میں پیدا ہونا چاہتا تھا، اس نے غور کیا کہ میں اور میرا باپ کس قدر مظلوم ہیں، بلا ارتکاب جرم ہم جور و جفا کے تختۂ مشق ہو رہے ہیں، وہ اپنے دل میں کہنے لگی، جن لوگوں نے یہ اقوال اپنی زبان سے نکالے ہیں، ان کا دورِ زندگی یہ نہ تھا ان کے ماحول میں یہ لوگ نہ تھے جو آج ہیں، اور اگر وہ آجکل کے زمانے میں ہوتے تو ہرگز انکی یہ رائے نہ ہوتی، اور نہ اس قسم کی تصانیف کی وہ کس طرح جرأت کرسکتے، اس لئے کہ معافی اور درگذر میں انتقام کا اثر اس وقت ہوتا ہے جب مجرم نیکدل اور پاک نفس ہو کہ اسکے لئے گناہ باعث قلق اور عفو موجب ندامت ہوسکے، مگر وہ سنگدل جو کسی چیز سے نادم نہیں ہوسکتے جن پر کوئی چیز اثر نہیں ڈال سکتی، انکے لئے چشم پوشی اور درگذر تمرد اور طغیان کا دروازہ کھول دیتی ہے ؛

یہ انہیں افکار میں مستغرق تھی کہ بوڑھیا آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ایلن کے پیچھے جا کھڑی ہوئی، اور کتاب کا وہ صفحہ دیکھنے لگی جسے ایلن دیکھ رہی تھی، جونہی اسکی نظر مذکورہ بالا جملے پر پڑی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی، ایلن گھبرا گئی اور پوچھنے لگی کیوں کیا بات ہے؟ بوڑھیا نے کہا گھبراؤ مت اور مجھے دیوانی نہ سمجھو جیسا کہ یہاں کے اور لوگ سمجھتے ہیں، میں نے تمہیں کامل غور و انہماک کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کرتے دیکھا، اس لئے میں یہ کہنے آئی ہوں کہ تم یہ کتاب طاق پر رکھدو نہ کسی تصنیف پر بھروسا کرو نہ کسی مصنف پر اعتبار، وہ بیچارے اس عالم سے مطلق ناآشنا ہیں۔ یہاں کے متعلق ان کا مبلغ علم اسی قدر ہے، جتنا ہمارا علم جنات اور ساکنانِ مریخ کے متعلق، وہ ایک مختصر گوشۂ خلوت میں زندگی کے اوقات بسر کرتے ہیں جہاں ایک روزن بھی ایسا نہیں جس سے باہر کی دنیا کی ایک جھلک نظر آسکے اور جب وہ خلوت کے وحشت کدہ سے اُکتا جاتے ہیں تو تفریح کی خاطر یا رفع وحشت کیلئے خیال آرائی کرنے لگتے ہیں اور اسے قوم کے سامنے تصانیف کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ شخصی عینک سے جو جو چیزیں انہیں خوبصورت اور حسین معلوم ہوتی ہیں، دل بہلانے کے لئے انکی تعریف و توصیف کرتے رہتے ہیں، ان کے یہ افکار، کائنات کے طبعی اور فطری قوانین کی موافقت میں نہیں لکھے جاتے، اور نہ پیش و پیش کے حالات کے زیر اثر ظہور پذیر ہوتے ہیں، مجرم کو نصیحت کرتے ہیں کہ ارتکابِ جرم سے

توبہ کرے اور باز آجائے اور خیال کرتے ہیں کہ محض اس نصیحت اور ہدایت سے وہ توبہ کر چکا اور باز آ گیا، اب مدعی کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں بھائی معاف کردو معاف کردینا انتقام کی ایک شدید ترین قسم ہے گویا جرم ایک مرض ہے جو نفس پر طاری ہوتا ہے، اور وعظ و ارشاد کی ادنےٰ تحریک سے زائل بھی ہوجاتا ہے، انکی عقلیں کس قدر ضعیف اور انکی نظریں کس قدر کوتاہ ہیں، انکی فہم کو حقیقت سے کس قدر بعد ہے میری بیٹی! یہ کتاب وغیرہ چھوڑو اور آلام و مصائب کو دل سے نکال باہر کرو، اور نہایت بے باکی اور خوشی کے ساتھ یہ کھانا کھالو اور اپنے مستقبل سے بالکل مطمئن رہو، عنقریب یہ دروازہ کھُلیگا، پھر تم یہاں سے نکل کر اپنے حریف سے پورا پورا انتقام لینا، اور اُسے اس منزل تک پہنچادینا جہانتک اس نے تمکو پہنچایا ہے جس طرح کہ میں یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے دشمن سے انتقام لونگی، چشم پوشی انتقام کی کوئی قسم نہیں، بلکہ انتقام خود زندگی کی بہترین فرحت بخش اور لذت آفریں چیز ہے +

اب ایلین کافی سکون میں تھی، اور وہ کھانا بھی کھانے لگی، لیکن وہ ہر رات خواب میں اپنے باپ کو طرح طرح کے عذابوں میں گرفتار دیکھتی اور چیخنے چلانے لگتی بوڑھیا آکر تسلی دیتی اور پھر سُلا جاتی، ایک رات جب کہ وہ سو رہی تھی، اس نے خواب دیکھا کہ اسکا باپ جیل کے شفا خانے میں ایک چارپائی پر مُردہ پڑا ہے، اور دو شمعیں اسکے گرد روشن ہیں، وہ خواب سے چونک پڑی، اور رونے چلانے لگی، اتنے میں قید خانے کا سپاہی آیا اور کہنے لگا داروغہ تمکو بُلاتا ہے، وہاں جاکر اسکو معلوم ہُوا کہ جیل کے شفاخانے میں اس کا باپ مرچکا ہے، یہ سُنتے ہی اسکے مُنہ سے ایک بلند چیخ نکلی اور وہ بیہوش ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ہوش میں آئی، تو اپنے آپ کو جیل کے کمرے میں دنیا کا سب سے زیادہ بدبخت متنفس تصور کرنے لگی +

۳

ایلین کی قید کی میعاد گزر چکی ہے، اور اب وہ جیل سے نکل رہی ہے، ضعیفہ اسکے ساتھ دروازے تک آکر اس سے کہہ رہی ہے، عزیز بیٹی! اپنے دشمن سے انتقام لینا، بھُول نہ جانا، میں بھی عنقریب تمہارے پیچھے اپنے دشمن سے انتقام لینے آتی ہوں، اور ہم جیسے افراد کے لئے دنیا میں انتقام کے سوا اور کیا چیز مسرت بخش ہوسکتی ہے +

جیل سے نکل کر ایلین چلنے لگی، لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جارہی ہے، وہ یہ بھی نہ جانتی

تھی کہ یہ راستہ کونسا ہے؟ وہ اس سے بھی بے خبر تھی کہ دن کو کھائیگی کیا؟ اور رات کی تاریکی کس شبستان میں بسر کریگی، والدین کے انتقال کے بعد اب اس کا دنیا میں کون تھا، خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسکے دامن پر سیاہ حرفوں میں جلی قلم سے "جیل کی مجرمہ" لکھا ہُوا ہے ۔

"گھنٹوں چلتی رہی تا آنکہ بھوک اور تکان نے اپنا اثر دکھایا، اس نے خیال کیا کہ مجھے زندگی کے ان آلام و مصائب سے رہائی پا لینے کے لئے خودکشی کر لینا چاہیئے، تھوڑی دیر تک وہ اسی کشمکش اور تذبذب میں رہی آخر یک طرفہ فیصلہ کر چکی اور نہر کے راستہ پر چل کھڑی ہُوئی، نہر سے اب کچھ ہی فاصلہ باقی تھا کہ اسے ایک گاڑی کے پہیوں کی آواز آئی جس کی روشنی تاریکی کی چادر کو ایک طرف سے پھاڑتی چلی جاتی تھی، ایلن ٹھہر گئی اور گاڑی اس کے پاس سے گذر گئی، اس نے دیکھا کہ مسٹر نورین چند بے شرم و بدمعاش عورتوں کے درمیان بیٹھا ہنسی مذاق کرتا ہُوا جا رہا ہے، اور اسکے قہقہوں سے دمبدم فضا گونج اُٹھتی ہے، یہ دیکھتے ہی ایلن اپنے دل میں کہنے لگی، اس سیاہ کار کو دیکھو کہ انتہائی تعیش اور ہوس رانیوں میں زندگی بسر کر رہا ہے، لیکن اسکی زندگی کا چشمہ مکدر کرنے والا کوئی بھی نہیں، اور میں جو بالکل بیگناہ اور بے خطا ہوں، میری یہ حالت ہے کہ جنگل کے وسیع، تاریک میدانوں میں بھٹک رہی ہوں، کہیں ٹھکانا نہیں۔ اور نانِ شبینہ تک کو محتاج، بسر اوقات کا کوئی ذریعہ بھی نہیں جانتی اور اگر جانتی بھی ہوتی تو اس سے کیونکر فائدہ اُٹھا سکتی تھی، کیونکہ میں مجرمہ ہوں، قاتلہ ہوں، دنیا میں کون ہوگا جو قاتلوں سے تعلق پیدا کرنیکی جرأت پیدا کر سکے اور انکی شقاوت و بدبختی پر رحم و کرم کی نظر ڈالے، مگر مجھے زندہ رہنا چاہیئے اور انتقام لینا چاہیئے اور ضرور لینا چاہیئے، اگر خداوند تعالےٰ کے آسمانی قوانین انصاف سے عاجز ہیں تو انسان کو اپنا انصاف اپنے ہاتھوں لینا چاہیئے، اب وہ نہر کے راستے سے پلٹ گئی، اور شہر کا رخ کرنے لگی، نیکی، راستبازی، عصمت وغیرہ صفاتِ حسنہ کے متعلق جو خیالات ہمیشہ سے وہ اپنے دل میں رکھتی تھی آج نکال چکی، شرافت، طہارت اور اخلاق کا جو خوبصورت لباس اسکے جسم پر تھا آج وہ اس سے عاری اور برہنہ تھی، ابھی رات کی نقاب صبح کے رخ سے اُٹھی ہی تھی کہ ایلن کو لوگوں نے ایک مشتبہ شخص کے ساتھ ہنستی بولتی جاتے ہُوئے دیکھا، اب اس کے رخسار پر شرم و حیا کی خفیف سی سُرخی باقی تھی اور وہ بھی لمحہ بہ لمحہ مائل بسفیدی ہو رہی تھی تاکہ ایلن کو اسکی بہنوں کی صف میں پوری طرح کھڑا کر دے ۔

۴

بیچاری ایلین اب اس گڑھے میں گر چکی تھی، جو انسانی معاشرت نے ایسی عورتوں کے لئے کھود رکھا ہے، اور وہ بتدریج اخلاقی تنزل کی گہرائیوں میں گرتی چلی جا رہی تھی، اس زندگی میں گناہ اور بے عصمتی اسکے لئے اسی طرح مسرت بخش تھے جس طرح اس سے قبل طہارت اور پاکیزگی، ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایلین آسمانِ پیرس کا ایک روشن تارا بن کر چمکنے لگی ٭

ایک رات جبکہ وہ کسی تھیٹر میں اپنے غیر متین بلکہ بیہودہ دوستوں کے ساتھ بیٹھی تھی، یکایک اسکی نظر سامنے کی کرسی پر پڑی، جس پر لورین اپنی کسی محبوبہ کے ساتھ بیٹھا تھا، نظریں چار ہوتے ہی لورین متوجہ ہو گیا، اور چونکہ ایلین اسکو مسلسل دیکھ رہی تھی۔ اسکی نظر بازی میں بھی ترقی ہو گئی۔ لیکن وہ اس نئے شکار کو پہچان نہ سکا، کیونکہ ایلین اب بالکل بدل چکی تھی۔ ابھی ڈرامے کی پہلی ہی فصل ختم ہونے پائی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ایلین کے گرد و پیش چکر لگانے لگا، وہاں ایک دوست سے ملاقات ہو گئی جس کی رسائی ایلین تک پہلے ہی سے تھی، لورین کے پوچھنے پر دوست نے کہا کہ اسکا نام لوسی مارسلیہ ہے جو اس سال پیرس کی سیر کرنے والیوں میں جمیل ترین حسینہ ہے، لورین نے تعارف کی درخواست کی جو فوراً ہی منظور ہو گئی، ایلین نہایت تپاک سے ملی اور انتہائی ملاطفت و خندہ پیشانی سے باتیں کرنے لگی، لورین جیسے ہوس رانوں کو وہ روزانہ دام میں پھنسانے کی خوب عادی اور مشاق ہو چکی تھی، اس لئے چند ہی لمحوں میں شکاری شکار ہو گیا، پر وہ اُٹھا وہ اجازت طلب کر کے اپنی جگہ پر چلا گیا ٭

دوسرے دن صبح کے وقت لورین نے اپنے ایک خادم کے ہاتھ پھولوں کا ایک خوبصورت ہار بھیجا، جس میں موتیوں کا ایک گراں قیمت طوق بھی منسلک تھا۔ یہ تحفے دیکھ کر وہ حد درجہ مسرور ہوئی اس لئے نہیں کہ وہ ہار اور طوق کی محتاج تھی، بلکہ اس لئے کہ اب اس کے ہاتھ میں وہ لگام آ چکی تھی جس کے ادنےٰ اشارے سے لورین کو ہلاکت کے گڑھے میں گرا سکتی تھی، ابھی تھوڑی دیر بھی نہ گزری ہو گی کہ لورین خود آ موجود ہوا، اور اپنی کل ملکیت اپنا دل اور اپنی زندگی اسکے قدموں پر نثار کر دی، اور خود بھی اسکے قدموں پر گر پڑا، اس لڑکی کے قدموں پر جو چند سال ہوئے اسکے قدموں پر گرتی تھی، محض اس لئے کہ اس کے باپ کو جیل سے رہائی دلانے میں امداد کرے، اور اگر واقعی اسکی نظر میں وہ مجرم ہے تو اسکے جرم سے درگزر کرے، اور اگر وہ ایسا کرتا تو پیش کردہ طوق کی ربع قیمت سے

بھی کم ہو وہ ایک پاک و صاف دل کو خرید لیتا، جس کا دامن رنگارنگ گناہوں سے آلودہ اور عوام کی خواہشوں اور ہوس رانیوں کا مرکز نہ ہوتا، بلکہ ایک شریف عورت کو اپنی بیوی بنا کر شریفوں کی سی زندگی بسر کرتا لیکن ایسے مخبوط الحواس نالایقوں کے مقدر میں یہی ہے کہ وہ کسی شریف اور باعصمت قلب کو کم سے کم قیمت میں بھی نہ خریدیں ہاں مگر جب اسکی طہارت و شرافت گناہوں سے پامال ہو چکی ہو۔ جب وہ پاک و صاف دل عوام کے دستِ ہوس میں خوان یغما بن چکا ہو تب یہ اسکی خریدمیں اپنی کل جائداد اپنی کل ملکیت لٹا دیں مسٹر لورین نے اپنی اس نئی محبوبہ کے لئے ایک نہایت خوبصورت کوٹھی خریدکی اور اس میں زینت و تکلف کا ہر سامان مہیا کیا، ابھی اس زندگی پر پورا ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ لورین نے اپنی کل ملکیت صرف کر دی اب اسے لوگوں کی بنک میں محفوظ رقموں کے ڈاکہ زنیکا خیال آیا اور وہ سخت حیران اور مضطرب ہوا۔

انہیں ایام میں پیرس میں ایک مینا بازار لگا، جن حسینوں کو اس بازار میں پھول کی فروخت کا اختیار دیا گیا تھا، انکی فہرست میں لوسی مارسلیہ کا نام بھی تھا۔ اس بازار کی تاجر پیرس کی حسین ترین پرجمال عورتیں تھیں، لوسی اپنی مقررہ دکان پر بیٹھی اور اس نے اپنے ہاتھ میں ایک خوبصورت پھول لیکر فروخت کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کیا، اسکے ساتھ یہ وعدہ تھا کہ جو شخص یہ پھول خریدیگا، میں یہ پھول اپنے منہ سے اسکے منہ میں دونگی، اب کیا تھا اسکے ماحول اُمرا اور اہلِ ثروت کا ایک ہجوم لگ گیا، جس کو دیکھو وہی قیمت بڑھا رہا ہے، کونٹ مارسیال نامی ایک دولتمند آگے بڑھا اور کہنے لگا میں پانسو فرانک دیتا ہوں، لوسی نے کہا میں اس کو ایک ہزار فرانک سے کم میں نہیں بیچونگی، اب ہر ایک کی زبان بند تھی، اتنے میں مسٹر لورین نہایت سکون و متانت سے آگے بڑھا اسکے ہاتھ میں ایکہزار فرانک کا نوٹ تھا لوسی کے ہاتھ میں رکھکر کہنے لگا میرے سوا تمہارا پھول کون لے سکتا ہے، یہ کہکر ایک خاص انداز سے پھول اسکے منہ سے اپنے منہ میں لے لیا، جس سے ہر خریدار خصوصاً کونٹ مارسیال کے دل میں حاسدانہ ٹھیس لگی، اور وہ یہ کہتا ہوا اپنی جگہ سے چلدیا کہ میں نے اپنی زندگی میں کسی بنک کا ایسا مالک و مینیجر نہیں دیکھا کہ وہ اس طرح اسراف اور فضول خرچی سے کام لیتا ہو، میں تو سمجھتا ہوں کہ اسکی ذاتی ملکیت اتنی گنجایش ہرگز نہیں رکھتی، کہ وہ پانی کی طرح یوں روپیہ بہائے، حقیقت میں وہ لوگوں کے محفوظ حصّوں سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور غصب و خیانت سے کام لیتا ہے، افسوس ہے اسکے بنک کے شرکا، پر کونٹ مارسیال کی زبان سے یہ کلمات برسرِ راہ بلند آوازمیں نکلے تھے،

بُری بات میں تو یوں بھی پر لگے رہتے ہیں، اس کا عام چرچا ہو گیا، پھیلتے پھیلتے شرکار کے کانوں تک پہنچی وہ سب سخت بے چین ہوئے اور اس خوف سے کہ کہیں بداعتمادی کی ہوا نہ چل جائے تنقیح حسابات کے لئے ایک دن مقرر کیا، لورین کو جب یہ معلوم ہُوا جعلسازی کا جال پھیلانا شروع کیا، کاغذات اور رسیدوں میں ردوبدل کرنا چاہا، لیکن معاملہ طشت از بام ہو چکا تھا، مجلسِ منتظمہ نے سب کچھ تاڑ لیا، اور عدالت میں مرافعہ پیش کر دیا، ادھر لورین بحر بوالہوسی میں غرق تھا، اسے اپنے ماحول کی کچھ بھی خبر نہ تھی رات کو اس کا ایک وکیل دوست ملنے کے لئے مکان پر گیا وہاں نہ پاکر بغرض تلاش لوسی کے مکان پر آیا اور لورین سے ملنے کے بعد اسکو مطلع کیا کہ گرفتاری کا وارنٹ نکل چکا ہے، اب یہاں سے نکل بھاگنا ہی تمہاری نجات کی صورت ہے ورنہ دائمی عذاب کا سامنا ہے۔ لورین نے لوسی کو فوراً سفر کی تیاری کا حکم دیا، لوسی کی محبت اور اخلاص پر اسکو کامل اعتماد تھا، لوسی نے بھی بظاہر اظہارِ غم کرتے ہوئے تیاری پر آمادگی ظاہر کی، لیکن اسی وقت موقع پاکر بذریعۂ ٹیلیفون پولس اسٹیشن کے آفیسر کو لورین کے ارادۂ فرار سے مطلع کر دیا۔ اور فوری گرفتاری کے لئے پولس بھیجنے کی بھی تاکید کر دی، نوکروں کو دروازوں کے مقفل کرنے اور لورین کو بھاگنے سے روکنے کا حکم دیا، اور لورین کے پاس آئی، لورین نے دریافت کیا کیا سفر کی تیاری ہو گئی؟ لوسی نے اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھا جس کا مطلب لورین کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور کہنے لگا کیوں کیا بات ہے؟ کہنے لگی کچھ نہیں بس یہی اتنی بات ہے کہ اب آپکی حیثیت ایک قیدی کی ہے، پولیس آفیسر آرہا ہوگا جو آپ کو گرفتار کرلیگا، یہ کہکر وہ غضبناک نظروں سے اسے دیکھنے لگی، لورین کو تعجب ہُوا اور وہ سمجھا، کہ لوسی مذاق کر رہی ہے، یا اس میں جنونی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس سے قریب ہو کر کہنے لگا، تمہیں کیا ہو گیا ہے، میں نے سفر کی تیاری کیلئے کہا تھا، کیا تم تیار ہو چکی ہو، یہ مذاق کا وقت نہیں ہے، یہ سُن کر لوسی نے دوسری مرتبہ قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگی پولیس افسر کو میں تمہارے ارادے سے مطلع کر چکی ہوں، اور سپاہیوں کے فوری بھیجنے کی بھی تاکید کر دی ہے، نیز مکان کے دروازے بھی مقفل کرا دئے ہیں، تاکہ ان کے آنے سے پیشتر آپ فرار نہ ہو جائیں، اب تو لورین کے ہوش اُڑ گئے، اس کو لوسی کی باتوں کا یقین ہو چلا تھا، لیکن ان باتوں کا سبب ابتک اسکو معلوم نہ ہو سکا، وہ دروازہ کی طرف دوڑا، لیکن اسکو معلوم ہو گیا کہ لوسی سچ کہہ رہی ہے، اس نے قفل کھولنے کے لئے کہا لوسی نے انکار کیا، لورین دست درازی پر

آمادہ ہُوا اور کنجی کہاں ہے کنجی کہاں ہے چلّانے لگا، لوسی نے کہا کیا تو چاہتا ہے کہ میرے باپ کی طرح مجھے بھی قتل کردے، لورین ان لفظوں کا مطلب کچھ بھی نہ سمجھ سکا، اور اپنی جگہ پر بدحواس کھڑا ہوگیا، اور کہنے لگا مجھے پتہ نہیں چلتا آخر تمہارا کیا ارادہ ہے، تمہارا باپ کون؟ لوسی نے کہا میرا باپ مسٹر کاپرینی جو کل تک تیرے بنک کا ایک وکیل تھا، جس پر تو نے محض ظلم و زیادتی کی بناء پر چوری کا الزام لگایا حالانکہ تو جانتا تھا کہ وہ ایک شریف اور راستباز آدمی ہے، اگر اسکو معلوم ہوتا کہ پانی کا وجود شرافت کے دامن پر دھبّا ہے تو اسکے پینے سے باز رہتا۔ ایسا شریف آدمی تیرے ہاتھوں جیل میں بیکسی کی موت مرا، اسکے پاس کوئی عزیز نہ تھا جو مرتے وقت اس کی زبان سے آخری کلمہ سُن لیتا۔ لورین کا چہرہ زرد اور اس کا جسم کانپ رہا تھا وہ لوسی کو نہایت گہری نظر سے دیکھتا اور پھر ہٹا لیتا، کانپتی ہُوئی غیر مسلسل آواز میں کہنے لگا تو تم ...... قطع کلام کرتے ہُوئے لوسی نے کہا ہاں تمہاری محبوبہ لوسی نہیں بلکہ تمہاری دشمن ایلن ہوں۔ وہ ایلن جو اپنے والد اور خود اپنے صدمات کا انتقام لینا چاہتی ہے، وہ ایلن جو آج چھ برس قبل تیرے قدموں پر گرتی تھی کہ تو اس پر اور اسکے باپ پر رحم کر، لیکن تو نے انکار کیا، اور اپنی ناجائز خواہش کی تکمیل کے لئے اسے مجبور کرنا چاہا۔ اور جب وہ مجبور نہ ہوسکی تو تو نے قتل کا سراسر غلط اور خلاف واقعہ الزام اس پر لگایا، اور کوڑ دماغ منصفوں نے بلاتحقیق و تفتیش اسے پانچ سال کی سزا کا حکم سُنا دیا، جسے وہ انتہائی مُصیبت میں کاٹ چکی، اختتام مدت کے بعد وہ قید خانہ سے نکلی اس وقت اس کے پاس گھر بار، عزیز و اقربا، عزت و شرافت غرض کچھ بھی نہ تھا، حتیٰ کہ وہ دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں کھانے پینے تک کی محتاج تھی، ایسی حالت میں اسکے سامنے دو ہی راستے تھے، ایک موت کا جس پر چل کر وہ زندگی کے جملہ تفکرات و مصائب سے آزادی حاصل کرسکتی تھی، دوسرا گناہ اور خواری کا راستہ جس پر چل کر وہ اپنے اس دشمن سے انتقام لے سکتی تھی جس نے اسے اس حالت کو پہنچایا تھا، اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا، اور انتقام کو موت پر ترجیح دی، اس لئے کہ اسکے پاک دل میں خباثت اپنا پورا اثر کرچکی تھی، اور اب وہ اپنے دشمن کی سعادت اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک مجرم اپنے جرم کا خمیازہ کھینچنے سے بچ جائے الہٰذا اس نے انتقام لیا، اب اسکے دل میں راحت و سکون ہے ◆

لورین تھوڑی دیر تک اپنا سر جُھکائے رہا، اور اسکے بعد کہنے لگا، تو درحقیقت تم نے مجھ سے کسی وقت محبت نہیں کی ؟

ایلین :- ہرگز نہیں، بلکہ میں تم سے ملی ہی اس غرض سے تھی کہ تمہیں اس منزل تک پہنچادوں جہاں آج تم پہنچ چکے ہو، اس وقت تم کو بہت کچھ صدمہ پہنچا ہوگا، بلکہ دنیا میں اس سے زیادہ قلق تمہارے لئے کوئی نہیں، کیونکہ آج بیک وقت تم عزت، شرافت، جائداد، آزادی، محبت، اور زندگی کی تمام امیدوں سے محروم ہو گئے ہو، یہی میری آرزو تھی اور یہی میرا منشا، میرے لئے یہی وقت ہے کہ میں زندگی کے عیش کی لذت سے لطف اندوز ہو رہی ہوں، عمر بھر میں اس سے زیادہ خوشی کا مجھ پر کوئی وقت نہیں گزرا ؟

لورین نے روتے ہوئے لوسی کو دیکھا اور کہنے لگا، دنیا کے کسی نقصان کی مجھے مطلق پروا نہ ہوتی اگر میں تمکو حاصل کر لیتا، لیکن اب جبکہ میرا ہاتھ تم سے خالی ہو چکا ہے، میں اگر جیا بھی تو کیا، یہ کہکر وہ ایک قریب کی کرسی پر گر پڑا اور رونے چلانے لگا، یہانتک کہ پولیس والے آگئے، اور گرفتار کرکے اُسے قیدخانہ لے گئے، ایلین دروازے تک ساتھ گئی، اور اس پر مسرت کی نگاہیں ڈالتی ہوئی واپس آگئی ؟

۵

کہا جاتا ہے کہ انتقام نہایت لذیذ چیز ہے، اور اس میں کچھ شک نہیں، لیکن ندامت و افسوس کی وہ اذیت جو تمام آلام و صدمات سمیت منتقم کو محسوس ہوتی ہے، اگر انصاف کی ترازو میں تولی جائے تو وہ کسی طرح انتقام سے ہلکی ثابت نہ ہوگی منتقم کا دل کسی حالت میں بھی ایک جج کی طرح جس نے سزا کا حکم سنایا ہے مطمئن نہیں، اور کیونکر ہو سکتا ہے، جج حکم سزا سناتے وقت بالکل مطمئن، غور و فکر پر قادر، مقابلہ اور جانچ کا مالک ہوتا ہے، اسکے برعکس منتقم کے اعمال کی بنیاد ہیجانِ نفس پر ہوتی ہے، وہ مقابل کی ہستی کو تباہ و برباد کرنیکے سوا کچھ نہیں چاہتا، پس انتقام لینے والے کی سزا اس خیال کے ماتحت نہیں ہوتی کہ مجرم کو اسکے جرم کی سزا ملنی چاہئیے، یا جرم سے عوام پر بُرا اثر پڑتا ہے، اور اس اثر کی روک تھام کے لئے مجرم کو سزا دینی ضروری ہے، بلکہ اس کے تمام افعال کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ اسکی ذاتی عداوت کی آگ، سرد ہو، اور اسی لئے وہ سب و شتم کی جگہ زد و کوب کا فیصلہ کرتا ہے، مستحق زد و کوب کو گردن زدنی بتاتا ہے، سزاوارِ قتل کیلئے آگ میں جلا دینے یا ناک کان وغیرہ کاٹ

لینے کی سزا تجویز کرتا ہے، منتقم اس کی پروا نہیں کرتا، کہ اس کا مقابل دوسرے مجرمین کے سلسلے میں خود ہوگیا ہے، فی نفسہ وہ جرم سے بری ہے، اسکو اس کا خیال نہیں کہ حقیقی مجرم وہ نہیں اسکا پڑوسی ہے بہرحال انتقام خود ایک گناہ ہے اب اس کا محرک جو کچھ بھی ہو، ہر جرم اپنے مرتکب کے دل میں کچھ نہ کچھ حسرت والم ضرور چھوڑ جاتا ہے، جتنا بڑا جرم ہوگا اتنی ہی بڑی حسرت ہوگی، وہ لوگ اپنے قول میں بالکل سچے ہیں جو کہتے ہیں، "عفو و درگذر میں چند لمحوں کی تلخی ضرور ہے، لیکن اسکے ساتھ ایک دوامی سعادت اور خوشی موجود ہے، اور انتقام ایک مختصر لذت اور شیریں ترین لذت ہے، لیکن وہ اپنے اندر ایک مستمر بدبختی اور طویل شقاوت رکھتی ہے"

لورین کے چلے جانے کے بعد ایلین اپنے کمرہ میں آئی، رات اپنی چادر تان چکی تھی، اب وہ اپنی گذشتہ زندگی کے اعمال کی فہرست پر نظر ڈالنے لگی اور اسکے ایک ایک صفحے کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہوگئی، اسکو ایک گونہ ناگواری، نفرت اور وحشت محسوس ہوئی، اسکو محسوس ہوا کہ شقاوت اور بدبختی کا سیاہ بادل روز بروز اسکے قریب ہوتا جاتا ہے، اپنے دل سے وہ سوال کرتی کہ اس نے جو کچھ کیا وہ صحیح تھا یا غلط، انتقام لیکر وہ سعادتمند بن گئی یا شقی، جس روز وہ جیل سے باہر نکلی تھی اور مستقبل پر غور کرتی تھی، اس کے لئے پانی میں ڈوب کر مر جانا اچھا تھا، یا زندہ رہنا، اور عزت و آبرو بیچ کر انتقام لینا، اپنے اس معرکہ میں وہ کامیاب ہوکر لوٹی ہے یا ناکام؟

وہ اپنے دل سے یہی سوالات دہراتی رہی لیکن کوئی جواب قابل قبول نہ مل سکا، رات کی چادر اب سکڑ رہی تھی، اس نے آرام کا ارادہ کیا لیکن اپنے ارادے کی تکمیل سے عاجز رہی، آخر اسکے ضمیر نے یہ فیصلہ سنا ہی دیا کہ وہ اپنے اس عمل میں مجرم ہے گنہگار ہے، اس نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اسکے لئے سب بے سود ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس نے اپنی آبرو نہایت سستے داموں فروخت کردی، اس نے لورین کے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کیا جتنا خود اپنے ساتھ، اب اس نے بطور کفارہ اس بات کا پختہ ارادہ کرلیا کہ آئندہ زندگی کسی خیراتی شفاخانے میں مریضوں کی خدمت اور تیمارداری میں بسر کردیگی ◆

۶

ایلین شفاخانے میں داخل ہوگئی اور خلوص و خدا ترسی سے مریضوں کی خدمت انجام دینے لگی، وہ رات رات بھر

مریضوں کے سرہانے بیٹھی رہتی، انتہائی ہوشیاری اور ہمدردی کے ساتھ تیمارداری کے فرائض انجام دیتی، تھوڑے ہی دنوں میں ایلن اپنی حسن خدمت، سچی ہمدردی اور خالص رحم و احسان کی بنا پر شفاخانے میں ضرب المثل ہوگئی۔

عدالت نے مسٹر لورین کو دو سال کی سزا دی، جیل کی ہوا موصوف کو کس طرح راس آتی، کچھ ایسے بیمار ہوئے کہ موت کی کوٹھی سامنے نظر آنے لگی، جسکی سیر کیلئے داخلہ کا فارم تلاش کرتے کرتے شفاخانے تک آئے، جہاں ایلن تیمارداری میں مصروف تھی، اگرچہ لورین بالکل بدل چکا تھا، لیکن اس نے دیکھتے ہی پہچان لیا، اُسے دیکھکر رونے لگی، اور نہایت توجہ کے ساتھ اسکی تیمارداری میں مشغول ہوگئی، لورین کی نقاہت اسکے ہوش و حواس کی متحمل نہ تھی، وہ بیہوش تھا اور ایلن بیہوشی کے عالم میں اسکی تیمارداری کرتی رہی، ایک روز لورین نے جبکہ مرض سے کچھ افاقہ میں تھا، ایلن کو اپنی جانب کھڑی ہوئی دیکھا کہ وہ اسکو دوا پلا رہی ہے، پہچانتے ہی اٹھ بیٹھا، اور اس کا ہاتھ چومنے لگا، اور گذشتہ گناہوں کی معافی مانگنے لگا، اب تو ایلن کی لبریز آنکھوں میں اور چند قطروں کا اضافہ ہوگیا، اور وہ رو کر کہنے لگی میں نے تمہارے ساتھ بُرا سلوک کیا خطا میری ہے اور میں تم سے معافی کی خواستگار ہوں، ایلن کی یہ جدید زندگی جو سر سے پاؤں تک خیر و احسان تھی گذشتہ خباثت بھری زندگی کو بھلا چکی تھی، اب اس کا پاک دامن بغض و عداوت کے بدنما دھبوں سے بالکل صاف ہو چکا تھا، اس میں خدا اور انسانیت کے نقوشِ محبت کے سوا اگر کچھ باقی تھا تو وہ احسان و خیر خواہی کے جذبات کی تصویریں۔

ایلن شب و روز اسکی تیمارداری اس طرح کرنے لگی جس طرح کوئی ماں اپنے اکلوتے لڑکے کی، وہ ہر وقت، ہر گھڑی اسکی خبر گیری اور معالجہ میں مصروف رہتی، لیکن مرض جسم کی گہرائیوں تک پہنچ چکا تھا، اس لئے علاج و تیمارداری کی کل عمارت نقش بر آب ثابت ہوئی، اور کچھ ہی روز بعد لورین کی روح اسکے جسم سے جدا ہوگئی، ایلن اسکے پاس روتی گڑگڑاتی اور دل میں یہ سوچتی تھی کہ خدا نے لورین کو اس طویل عذاب میں مبتلا کیا، اس ابتلا میں اسکی کل خطائیں معاف ہوگئیں، جب وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو چکا تو اب خدا اسکو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دینا چاہتا ہے، اسی لئے دنیا سے لورین کو اُٹھا لیا۔

دوسرے روز لوگوں نے دیکھا کہ ایلن نہایت سکون اور متانت سے معبد کے راستہ پر جا رہی ہے، وہ معبد تک پہنچ چکی، اور اس کا وہ بڑا دروازہ کھلا جس میں داخل ہونے والا تا ابد نہیں نکلتا، ایلن اس میں چلی گئی اور یہ اس کا دُنیا میں آخری دن تھا۔

عبد الحمید

سرگوشیاں

بچپن ۔مور کی "خیالی دُنیا" افلاطون کی "جمہوریہ" کی بابت علم تو مُجھے اب ہوا لیکن ان پر کچھ کچھ عمل میں اُس زمانے میں کر چکا ہوں جب میں دُنیا والوں میں شاید شمار نہ ہوتا تھا۔

ہر شخص کے لئے وہ امیر ہو یا غریب بچپن دُنیا کی جنت ہے۔ امیروں غریبوں کے بچّے مل کر نہ بھی کھیلیں نہ انکو اس پر "علمی" فخر نہ انکو اس پر عملی ذلت کا احساس ہوتا ہے۔ دونوں کو اک دوسرے کی پروا نہیں ہوتی۔ اِسکو اُس پر رشک نہیں آتا۔ کوئی اپنی قسمت کا شاکی یا دوسرے کی شوکت پر زندگی سے بیزار نہیں ہو جاتا جس وقت سے میں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ میرے ہمجولی میرا اپنے میں وہ مرتبہ نہیں سمجھتے جو میرا موروثی حق ہے اُس وقت سے گویا میرا بچپن ختم ہو چکا۔ اس سے قبل کبھی ایسے خیالوں نے میری رُوح پر جابرانہ حکومت نہیں کی۔ کبھی رشک یا غرور یا نفرت نے دیر تک مجھے دبلائے نہیں رکھا۔ میں آزاد تھا۔ بار ہا میں نے ڈپٹی کمشنر یا تحصیلدار کو سلام نہیں کیا بلکہ اُنکو آتے دیکھا تو یہ سُن کر کہ سلام کرنا ضروری ہے میں وہاں سے بھاگ نکلا اس لئے نہیں کہ کسی کی عزت کرنا میری شان کے خلاف تھا یا میری خودداری کے منافی۔ صرف اس لئے کہ یہ چیزیں میرے بچپن کی مختصر دُنیا کا جزو نہ تھیں اور میں اجنبیت کے باعث ان سے گھبراتا تھا۔

کچھ میرا اخلاقی معیار زیادہ بلند نہ تھا نہ اس کا دعوےٰ تھا جس کو جو کرتے دیکھا اگر وہ کام تکلیف دہ نہیں تو خود بھی کرنے لگ گیا۔ وجہ؟ صرف مصروفیت کا ملکہ اور کچھ نہیں۔ میری چیزیں کھُلی الماری میں رہتی تھیں اور دوسروں کی بند صندوقچیاں ہمیشہ مجھے کاوش میں مبتلا کر دیتی تھیں صرف چند لمحوں کے لئے۔ کمزوروں سے چیز چھین لینے کی عادت بھی تھی لیکن نیت بالکل کھری تھی اُس چیز کو "بلا شرکتِ غیرے" ہمیشہ کے لئے اپنی بنا لینے پر عملاً اصرار نہ تھا صرف تھوڑے عرصے کے لئے۔

گذرے یا آنے والے زمانے کا خیال نہ تھا سمجھانے بجھانے سے بھی نہ آتا تھا۔ حال کا حاکم اپنی دُنیا میں صرف میں تھا۔ اَور بھی حاکم تھے لیکن مجھ پر کسی کی حکومت نہ تھی۔ ہم سب آزاد تھے، حاکم تھے، غاصب تھے نیک نیت، نقّال تھے بے نفرت۔ موسم کی تبدیلیاں خوراک کی کمی بیشی، مقابلے کی دُھن، مباحثے کا فن کبھی بہت دیر تک ہم ان پر چیں بجبیں نہ رہتے تھے۔ کھُلی ہواؤں میں بند کمروں میں

باغ میں میدان میں ہر جگہ ہم اپنوں کی موجودگی اور دوسروں سے علیحدگی چاہتے تھے۔ ماں باپ کا روپیہ صرف کرنا ہمارا غیر محسوس حق تھا۔ دوستوں کی محفل میں شریکِ مسرت ہونا ہمارا فرض اولے۔ باغوں میں یہ خوبی تھی کہ وہاں پھل لگتے تھے بازاروں میں یہ لطف تھا کہ وہاں مٹھائی بکتی تھی۔ یہ چیزیں تو دلکش تھیں باقی تمام قطعی ناقابلِ التفات۔

یہ آزادیاں کیونکر چھن گئیں؟ تعلیم وتہذیب نے کیسے ہماری گت بنائی؟ بڑوں کا باقاعدہ طور پر ادب کرنا کتابیں رٹنا کپڑوں کو بے داغ رکھنا یہ ظلم کس طرح ہوئے؟ ان کا ذکر نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ جی یہی چاہتا ہے کہ بچپن کی باتیں کر کے بچپن کی دنیا میں چند لمحے گذاروں۔ سو آج کھیلوں گا کھاؤں گا اُچھلوں گا، کودوں گا، بے تحاشا بلا تامل کھلکھلا کر ہنس پڑوں گا اور خوب شور مچاؤں گا! کہاں کس جگہ؟ کن لوگوں کے درمیان؟ —— اس صفحے کے سوا کوئی جگہ نظر نہیں آتی اور اپنے دل کے سوا کوئی رفیق نہیں مل سکتا! شاید یہی غنیمت ہے!

اے دوست! اے دوست! جس سے کبھی ملنا نہیں ہوا جس کی ہمدردی پر میری ہر مصیبت مسرت میں بدل جائے جس کی ہلکی سی مسکراہٹ میرے آنسوؤں کو نسیمِ بہار کی طرح خشک کر دے جو دن رات میرے پہلو میں رہے یہانتک کہ مجھے احساس ہو جائے کہ میں اب میں اور وہ ہو گیا ہوں جو کوئی بات کہے تو میں بلا مباحثہ اُسے مان لینا چاہوں —— ملنا جو تجھ سے نہیں ہوا کب ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ تو ہے لیکن تو ملنے کے لئے ہے کہ نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ یہ مجھے یقین ہے کہ دوست ملنے کے لئے ہوتے ہیں یہ مجھے یقین ہے کہ نہ ملنے والا دوست نہیں ہوتا، تو مجھ سے نہیں ملا لیکن تو میرا دوست ہے اس کا مجھے پھر بھی یقین ہے۔

"اے دلگیر! تجھے میری دوستی کا یقین ہے یہی ملاقات کا مطلب ہے یہی ملاقات ہے کہ دوستی کا یقین ہو۔ تو مجھ سے مل رہنے کے لئے کیوں تڑپتا ہے۔ جب تو میری دوستی کے خیالوں میں مگن ہے تو یہ اضطراب کیا ہے اور کس لئے؟ دوست! تو جانتا ہے کہ تو اپنے دوست سے مل چکا ہے تیرا دوست ہر روز ہر لمحے جب تو اسے یاد کرتا ہے تجھے ملتا ہے۔ پھر بھی یہ اضطراب! —— ہاں میری محبت کا سکون بھی اضطراب ہے اضطراب ہی میں میری محبت کا سکون ہے!"

"باغبان"

میں اور تو

اے کہ دردِ تلخیٔ دوراں کا ہے تو شکوہ سنج
تیری چشمِ تنگ بیں نے کیا کبھی دیکھا مجھے

تو خرابِ نشۂ خوابِ آورِ صہبائے دوش
عشرتِ امروز میں ہے کاوشِ فردا مجھے

تو فریبِ جلوۂ حسنِ قدامت کا اسیر
اور ہر لحظہ جمالِ تازہ کا سودا مجھے

ہر نفس خاموشیٔ ساحل کی تجھ کو جستجو
اور تلاشِ شورشِ بیتابیٔ دریا مجھے

عقلِ حکمت آفریں تیری عناں گیرِ مجاز
رہنمائے حسنِ باطن شوقِ بے پروا مجھے

کشمکش ہائے نبردِ زیست سے تو گوشہ گیر
اشتیاقِ ترکتازِ عرصۂ دنیا مجھے

سینۂ ویراں ترا ہے بے گدازِ آرزو
اضطرارِ سوزشِ شوقِ جنوں افزا مجھے

گلشنِ ہستی تجھے آشوب گاہِ رنج و بیم
وحشت آبادِ جنوں اک منظرِ رعنا مجھے

اس تمنا زار میں میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے

تصدق حسین خالد

زائر

جیاکومو کئی سال کے بعد گھر واپس آرہا تھا، وہ اُس بل کھاتی ہوئی سڑک کے ایک موڑ پر ٹھہرا جو کوہِ اٹنا کے لہراتے ہوئے میدانوں سے ہوتی ہوئی اوپر پہاڑی کو چلی جاتی تھی، جہاں سے اُسکا آبائی شہر سینٹا روزا اور اُس کا موروثی قلعہ بخوبی دکھائی دیتے تھے +

سینٹا روزا کے گرد مستحکم فصیل تھی اور مضبوطی سے اُسکی قلعہ بندی کیگئی تھی، شہر پہاڑی پر آباد تھا، پہاڑی پر سبزہ اُگا تھا، اور وہ اُن زرخیز وادیوں اور وسیع میدانوں کی طرف ڈھلوان ہوتی چلی گئی تھی جو کوہِ اٹنا کے دامن میں ہیں +

جیاکومو نے اپنی زائرانہ ٹوپی اُتار کر سینٹا روزا کے شہر اور اپنے قلعے کو سلام کیا، جو شہر کے کل مکانات سے اونچا تھا +

اُسے اپنا وطن چھوڑے پندرہ یا سولہ برس ہوئے تھے، یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ گزرا تھا، کیونکہ اس نے اپنا وقت کچھ تو الجیریا کے ایک قید خانے میں گزارا تھا، کچھ ایک ترکی جہاز میں اور کچھ ایک غلام کی حیثیت سے ٹیونس میں، اور اب وہ اس مدت کا حساب بھول گیا تھا +

اس عرصہ کے دوران میں وہ بہت متغیر ہو چکا تھا —— اور وہ بھی اس سے بخوبی واقف تھا، اس گردشِ ایام نے اُسکی تمام رعنائی اور جوانی اُس سے چھین لی تھی۔ حالانکہ ابھی وہ ادھیڑ عمر کا بھی نہ تھا۔ لیکن تمام دنیاوی خوشیاں، اپنے ہمجنسوں کی محبت اور دلی مسرت اُس سے چھین لی گئی تھی +

وہ اپنے آبائی شہر کو کھڑا دیکھ رہا تھا، اور اُس وقت اُسکے دل میں تمام دنیا کی طرف سے نفرت اور سختی کے سوا کچھ نہ تھا، اُسے کسی شخص کی مہربانی اور شفقت یاد نہ تھی، اور اس لئے اُسے سوائے تلخی کے کچھ اور محسوس نہ ہوتا تھا، چونکہ اُسکی ساری زندگی اُس کے چچا کے گناہ سے تاریک ہو چکی تھی جس نے اُسے قید اور غلامی کے ناقابلِ شنید عذاب میں مبتلا کیا، اِس لئے وہ دُنیا کو اپنی رُوح کی تاریکی سے دیکھتا تھا +

دُنیا میں صرف ایک انسان تھا جس کی وہ عزت کرتا تھا، اور وہ صقلیہ کا وائسرائے تھا،

جس نے اُسکی دردبھری داستان پر یقین کیا اور اُسے انتقام کے ایک مضبوط ہتھیار سے آراستہ کیا تھا، اب وہ خوشی خوشی گھر واپس آرہا تھا۔ اُس شخص سے انتقام لینے کے لئے جس نے آج سے پندرہ برس پہلے اُسے دامِ فریب میں پھنسا کر ایک افریقی بحری ڈاکو کے حوالہ کردیا تھا، جو ایک جہاز میں صقلیہ کی طرف جارہا تھا۔

جیاکومو نے وائسرائے سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ اُسکا چچا بڑے آرام و اطمینان سے قلعوں اور زمینوں کی آمدنی سے عیش کررہا ہے اور کسی نے بھی اُسکے چچا کے قول کے مطابق جیاکومو کے سمندر میں غرق ہوجانے کے متعلق ذرا شک نہیں کیا، لیکن کسے گمان تھا، کہ جب سمندر کا خوشگوار سفر ختم ہوا تو یہ لڑکا کشتی میں بٹھا کر سمندر میں تنِ تنہا چھوڑ دیا گیا اور کسے خیال تھا، کہ یہ لڑکا ایک بحری ڈاکو کی مدد سے بال بال بچ گیا ہے۔

اُس نے موت سے زیادہ تکلیف اُٹھائی تھی۔ اس قدر تکلیف کہ صرف آئندہ انتقام کے خیال ہی نے اُسے مصیبت اور غلامی میں زندہ رکھا تھا، اور خدا کی قدرت سے اُسے بہت جلد اسکا موقع مل گیا، وہ ایک ترکی جہاز میں نوکر تھا جسے لیپنیٹو کی جنگ میں ہسپانوی بیڑے نے گرفتار کرلیا اور وہ صقلیہ کے ایک بندرگاہ پر ٹھہرا، وہاں سے جیاکومو پھٹے پُرانے لباس میں پلرمو کی طرف روانہ ہُوا، اور وائسرائے سے مل کر اسے اپنی رام کہانی سُنائی، اب وہ اپنی جیب میں اپنے چچا کی برطرفی اور اپنی بحالی کے احکام لیکر سینٹا روزا کو آرہا تھا، وہ شاید سیدھا اپنے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ لیکر غاصب کو گرفتار کرنے آجاتا، لیکن وہ اپنے دشمن کو اچانک حیرت میں ڈالنا چاہتا تھا، اور اُسے مارنے سے پہلے عذاب دینا اور اپنے انتقام کو ڈھیل دیکر اُسکے ہر ایک لمحہ سے لُطف اندوز ہونا چاہتا تھا، یہ تمام باتیں جیاکومو کے دل میں مضبوطی سے جگہ پکڑ گئی تھیں، اپنے چچا کی شکست، اور مکمل انتقام ہی وہ واحد مسرت تھی، جسے وہ حاصل کرنیکا متمنی تھا۔

اس لئے وہ چپکے سے ایک زائر کا سا پھٹا پُرانا بھیس بدل کر آیا تھا، وہ جو کونٹ ڈی بیسکیپی تھا وہ جو سینٹا روزا اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی ارد گرد کے تمام کھیتوں، میدانوں اور پہاڑوں کا واحد اور جائز مالک تھا۔

اُس نے آہستہ آہستہ بل کھاتی ہوئی سڑک پر چڑھنا شروع کیا، اُس روزا دلیا کی یادگار کا دن تھا۔

خانقاہوں کے میناروں اور گنبدوں میں گھڑیال بج رہے تھے، فصلِ انگور گزر چکی تھی اور فصلِ زیتون شروع ہُوئی تھی، خچر جو زیتون سے بھرے ہوئے ٹوکروں سے لدے تھے، لگاتار جیاکومو کے پاس سے گزر رہے تھے اُنکے سروں پر نیلے اور گلنار اُون کے پُھندنے تھے، کسان اُنکے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ کسانوں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے ڈنڈے تھے جن سے وہ زیتون جھاڑتے تھے، جیاکومو کو یہ باتیں اچھی طرح یاد تھیں لیکن اپنے محبوب بچھڑے ہُوئے وطن کے یہ مناظر اُسکے دل کو نرم نہ کرسکے، لمبے لمبے بالوں والی بکریوں کا ایک ریوڑ اسکے قریب سے گزرا جنہیں بچّے ہانک رہے تھے، بچّوں نے بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے وہ آئندہ صبح کی مسرّتوں پر بحث کر رہے تھے، کل "مُردوں کا دن" تھا، جب مُردہ رشتہ داروں کی رُوحیں زندوں کو چند تحائف بھیجتی ہیں، جب اُس نے بچّوں کی جوشیلی گفتگو سُنی اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی، اور دل سے کہا "میرا چچا مُردوں کی طرف سے یہ تحفہ قبول کریگا"۔

جیاکومو آگے ہی آگے بڑھتا گیا، اُس نے سب سے چھوٹا راستہ منتخب کیا جو سیدھا قلعہ کو جاتا تھا، اور جہاں خچر بھی مشکل سے اپنے قدم جما سکتے تھے۔ قلعے کے بُرج میں ابھی تک روشنی تھی، شاید اُسکی چچازاد بہن آرسولا، جسے وہ بچپن سے جانتا تھا، وہاں بیٹھی اپنی مردہ ماں کے لئے ہار گوندھ رہی تھی، اُس نے اُس وقت کا تصوّر کیا جب وائسرائے نے رحم سے "تمہاری حسین اور بیگناہ چچازاد بہن" کہا تھا، اور وہ صرف مُسکرا کر چپ ہو گیا تھا، شاید وائسرائے نے یہ خیال کیا ہو کہ اس سرگرمی کو جو انتقام کے جوش سے پیدا ہُوئی تھی آرسولا کا حسن کسی شعریت سے لبریز خاتمہ تک پہنچا دے۔ اور جیاکومو دام محبت میں گرفتار ہو کر اپنی چچازاد بہن سے شادی کرے، لیکن وہ جیاکومو کو نہیں جانتا تھا، اب کوئی عورت اُسے مغلوب نہ کرسکتی تھی۔

تاریکی بڑھتی جاتی تھی، کاروباری لوگ اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے، دوکاندار اپنی دوکانیں سنبھالنے میں مشغول تھے، جیاکومو اب اُس ڈھلوان سڑک پر ہولیا، جو قلعے کو جاتی تھی، مکانوں کی کھڑکیوں میں سے خوشنما چراغ جھلملاتے نظر آرہے تھے، اور چاند نکل رہا تھا، جب وہ قلعہ کے قریب پہنچا تو اس نے ہر سمت خاموشی طاری پائی، صرف ایک محرابدار کھڑکی میں سے ایک لیمپ دکھائی دیا۔ وہی لیمپ جسکی روشنی اُس نے نیچے سے دیکھی تھی۔

قلعے کا دروازہ ابھی تک کُھلا تھا، جیاکومو اندر داخل ہُوا، ایک دربان آگے بڑھا، جیاکومو نے

کہا میں صرف ایک رات بسر کرنا چاہتا ہوں ۔

دربان نے ذرا تامل کے بعد جواب دیا "تم عجب موقعہ پر آئے ہو، مجھے ڈر ہے کہیں میڈونا آرسولا انکار نہ کردے"

اُس نے تمکنت کے انداز سے زائر کی طرف دیکھا اور قلعہ کے تاریک دروازے کی طرف چلا جیاکومو نے اپنے دل میں کہا "میری بہن آرسولا! کیا اپنے والد کے مکان میں وہ اتنی جلدی مالکہ بن بیٹھی ہے؟"

وہ دربان کے پیچھے گیا، اور دروازے کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا، اپنے مکان کے دروازے کی دہلیز پر، ایک لڑکا شمع لایا، جیاکومو نے دیکھا کہ جگہ صاف، ستھری اور عمدگی سے آراستہ ہے، اُس نے اپنے دشمن کو دیکھنے کے شوق میں سیڑھیوں کی طرف دیکھا، دربان واپس آیا، آرسولا نے میزبانی قبول کرلی تھی، اور یہ سُن کر کہ وہ شرق سے آیا ہے۔ اس سے خود ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی، وہ دربان کے پیچھے پتھریلی سیڑھیوں پر چڑھ کر اُس عظیم الشان ہال میں پہنچا، جس سے وہ بخوبی آشنا تھا ۔

اچانک اُس نے اپنے تئیں ایک دراز قامت عورت کے روبرو پایا، جو ایک سیاہ کرسی سے سلام کرنے کے لئے اُٹھی، اُسکے پہلو میں ایک نوجوان شخص ایک چھوٹی سی چوکی پر بیٹھا تھا، کمرہ ایک لیمپ سے روشن تھا، جیاکومو جانتا تھا کہ یہ وہی لیمپ ہے، جو اُس نے نیچے سڑک پر سے دیکھا تھا، اُس نے سلام کا جواب دیئے بغیر اپنی چچازاد بہن کی طرف بغور دیکھا ۔

وہ کچھ ایسی خوبصورت نہ تھی، لیکن اُسکے ہر نقش اور ہر حرکت میں ایک رعنائی اور نزاکت تھی اُسکے سیاہ بال اُسکے نازک چہرے کے گرد بل کھاتے تھے، اُسکی پلکیں گھنی تھیں اور اُسکی سیاہ آنکھیں ملائمت اور کشش سے لبریز تھیں ۔

وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھی اور اُس نے کوئی زیور وغیرہ نہ پہن رکھا تھا، ریشم کا ایک دوشالہ جس پر ایک خوشنما جھالر تھی، اُسکے نازک کندھوں پر پڑا تھا، وہ کرسی پر بیٹھ گئی، اُس کا چہرہ موتی کے مانند سفید تھا، زائر کی مستقل طور پر جمی ہوئی نظر نے اُسے ایک قسم کے خوف میں ڈالدیا، اُس نے اپنے ہاتھ دوشالے سے باہر نکالے گویا وہ اپنے تئیں بچانا چاہتی ہے، جیاکومو جو اُسکے سیاہ لباس کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا، کہنے لگا "کونٹ ـــ کونٹ کہاں ہے؟"

اس فقرے نے اُسے اَور خوفزدہ کردیا، وہ نوجوان کی طرف پلٹی، جس نے زائر کی طرف دیکھکر

مختصر سا جواب دیا "کونٹ کو مرے دو دن ہو گئے ہیں، کل ہی اُسے دفن کیا گیا ہے"

جیا کومو کانپ گیا، آہ! ایک ہی لحظہ میں اُسکے انتقام کی تمام اُمیدیں خاک میں مل گئی تھیں گویا اب ایک مردہ انسان تھا جس پر وہ فتح حاصل کرنا چاہتا تھا، ایک مُردہ انسان کو بے حُرمت اور ذلیل کرنے کی اُمید میں تھا! آرسولا نے آرام و سکون سے کہا "لے زائر! یہ ماتم کدہ تمہاری مہمان نوازی کے لئے تیار ہے، جتنی دیر چاہو رہو"

وہ حقارت سے مُسکرایا "ہاں تو جتنی دیر چاہوں رہوں؟"

آرسولا نے کہا "مجھے اندیشہ ہے کہ میں نے اپنے الفاظ کے مفہوم پر پورا غور نہیں کیا، کیونکہ میں یہ نہیں جانتی کہ میں کبتک اس گھر کی مالکہ ہوں"

جیا کومو اپنے خیالات سے چونکا اور اُسکی طرف تیز نگاہوں سے دیکھنے لگا، آرسولا نے اِس کے جواب میں کہا "میں اپنے والد کی وارث نہیں ہوں"

جیا کومو کہنے لگا "غالباً وہ اپنی جائداد کسی اور کے لئے چھوڑ گیا ہے؟"

اُس نے یہ فقرہ بڑی اُداسی سے کہا، کیونکہ ناکامی کے صدمہ نے اُسکی زندگی برباد کر دی تھی، انتظار کے یہ تمام سال بیکار ثابت ہُوئے تھے۔ اُس کا دُشمن زندہ رہا، اور خوشی اور چین سے مر گیا تھا صرف دو دن پہلے آ کر وہ انتقام لے سکتا تھا، لیکن اب اُس نے اِس خواہش کے سوا اپنے دل میں کچھ نہ پایا کہ تمام اُن واقعات کو معلوم کرے جو اُسکے بعد وقوع پذیر ہُوئے اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے۔

نوجوان آدمی بے صبری سے اُٹھا، وہ بھی ماتمی لباس میں تھا، جب وہ آگے بڑھا تو اُسکے پیچھے ایک میز دکھائی دی، جس پر دستاویز تھیلیاں اور کاغذات رکھے تھے، انکو دیکھتے ہی جیا کومو کی آنکھوں میں اچانک ایک چمک سی پیدا ہو گئی، دستاویز! اُسکے پاس بھی چند دستاویزیں تھیں، اُس نے اپنا کمزور ہاتھ جیب میں ڈالا، اور اُن کاغذات کو دیکھا، جو اُسے وائسرائے نے دئے تھے، اور جو اُسکے جائز کونٹ ہونے کے دعوے کو ثابت کرتے تھے۔

وہ ابھی تک نیم حیران نگاہ سے اُسکی طرف دیکھ رہی تھی، اُس نے اپنے نازک ہاتھ کی ایک ہلکی سی جنبش سے اپنے ساتھی کو چُپ رہنے کی ہدایت کی اور جیا کومو سے پوچھا "کیا تم مشرق سے آئے ہو؟

"ہاں"

"کیا تم صقلیہ کے باشندے ہو؟"

"ہاں"

"کس شہر کے؟"

"اسی شہر کا"

"سینٹا روزا کے! تو پھر تم ایک مدتِ مدید تک باہر رہے ہو، میں سینٹا روزا کے تمام باشندوں کو پہچانتی ہوں، لیکن تمہیں بالکل نہیں جانتی"

"مجھے یہ شہر چھوڑے پندرہ برس یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزرا ہے"

اُس نے ایک سرد آہ بھری، نوجوان آدمی سختی سے بولا "ہاں اے زائر! تو تم نے بہت سفر کئے!"

جیاکومو نے جواب دیا "ہاں اور بڑے عجیب تجربات حاصل کئے"

پھر کہنے لگا "جناب آپ کون ہیں؟"

آرسولا نے جھٹ جواب دیا "یہ میرا ہونے والا شوہر ڈان اجینیو ہے! بہت جلد ہماری شادی ہونے والی ہے، آج رات یہ کفن دفن کے چند معاملات میں میری مدد کرنے آیا ہے"

اچانک اُسکی آواز رک گئی اور اُسکی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں، ڈان اجینیو نے کہا "لیکن ہم تمہیں یہاں رکھیں گے، میرے خیال میں تمہیں آرام اور کھانیکی ضرورت ہوگی"

جیاکومو تاڑ گیا کہ یہ مجھے یہاں سے ہٹانا چاہتا ہے، وہ مسکرا کر کہنے لگا "جیسے آپکی مرضی، باقی جو کچھ مجھے کہنا ہے کل "مُردوں کے دن" کہونگا، کیوں ٹھیک ہے نا؟ جب تمام لوگ اپنے بستر کے قریب وہ تحائف پاتے ہیں جو اُنکے مُردے اُنہیں بھیجتے ہیں، میں عیسائی رسوم بالکل بھول گیا ہوں، شاید میں بھی مُردوں کی طرف سے کوئی تحفہ لاؤں"

یہ کہہ کر اُس نے پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذات کو چھوا، آرسولا نے آرام سے کہا "کیا تمہارا بھی کوئی مُردہ یہاں ہے جو تمہیں کل تحفہ دے؟ کیا کوئی قبر ایسی ہے جس پر تم جاؤ؟"

جیاکومو ہنس کر کہنے لگا "میرے مُردے بھی سینٹا روزا میں ہیں، لیکن میرا کام تو زندوں سے ہے"

ڈان اجینیو نے کہا "زائر! اب جاکر آرام کرو، تاریکی زیادہ ہوتی جاتی ہے"
جیاکومو پلٹ ہی رہا تھا کہ آرسولا بولی "اسے یہاں ٹھہرنے دو، آج میں اس سے باتیں کرنا چاہتی ہوں"
اجینیو نے غصے سے کہا "یہ فضول ہے، وہ اسکے متعلق کیا جانتا ہے، دوسرے اس سے پوچھنے کا یہ مطلب ہے کہ اسے تمام راز کی خبر ہو جائیگی"
وہ ذرا کانپی اور کہنے لگی "نہیں، میں اسے ضرور بتاؤنگی، آخر ایک نہ ایک دن اس راز کا سب کو علم ہو جائیگا، مجھے اس سے باتیں کر لینے دو"
وہ کرسی پر بیٹھ گئی، اور کہنے لگی "میں ایک آدمی کی تلاش میں ہوں جو کہیں مشرق میں کھو یا گیا ہے اور چونکہ تم وہاں رہے ہو اس لئے تم سے پوچھنا چاہتی ہوں"
جیاکومو نے بہ انداز استغنا اپنے کندھے ہلا کر کہا "یہ بعید از قیاس ہے، میں آپکی مدد نہیں کرسکتا میں بہت تھوڑے عیسائیوں سے ملا ہوں"
آرسولا نے اُسکی طرف دیکھ کر کہا "وہ آدمی جسے میں اور ڈان اجینیو تلاش کر رہے ہیں، اغلب ہے کہ عیسائی نہ ہو، بلکہ ایک مرتد بے دین ہو —— یا شاید کسی جہاز میں غلام یا قیدی ہو!"
جیاکومو نے غور سے اُسکی طرف دیکھکر کہا "وہاں بحری ڈاکوؤں اور افریقی تاجروں کی زنجیروں میں سینکڑوں بیگناہ گرفتار ہیں"
دوبارہ وہ کانپی اور کہنے لگی "بس وہ بھی اُنہیں میں سے ایک ہوگا، ہم اُسے ضرور تلاش کرینگے — اُسے ضرور آزاد کرائیں گے"

"یہ بہت مشکل ہے"

"نہیں ہم اُسے تلاش کرینگے اور ضرور کرینگے"

"وہ آدمی کتنے سال سے گم ہے؟"

"سولہ سال سے"

"اور آپ اُس سے ملنے کی اُمید رکھتی ہیں؟"

ڈان اجینیو نے کہا "یہ ایک مقدس جستجو ہے، اور اے زائر ہم ضرور کامیاب ہو کر رہینگے

یہ وہ فرض ہے جس کے لئے ہم اپنی جانیں دے دینگے"

آرسولا نے کہا" وہ فرض جو خود خدا نے ہم پر عاید کیا ہے"

اُس نے کرسی کی طرف اشارہ کرکے جیاکومو سے بیٹھنے کو کہا، وہ بیٹھ گیا اور اپنی نگاہ اُس لیمپ پر جمادی جو آرسولا کے پیچھے لٹک رہا تھا، وہ لیمپ جس کی روشنی اُس نے سڑک پر سے دیکھی تھی جب کہ وہ ایک ایسے آدمی سے انتقام لینے کے منصوبے باندھ رہا تھا، جواب قبر میں تھا، لڑکی نے بیقراری سے پوچھا" کیا تم ایسے آدمیوں سے ملے ہو ——— عیسائی قیدیوں سے؟"

اُس نے مختصر سا جواب دیا" ہاں بہت سے قیدیوں سے ملا ہوں"

" اُن میں سے بعض کے ساتھ تم نے باتیں بھی کی ہونگی ——— اُنکے نام اور حالات بھی سُنے ہونگے؟

"ہاں"

"تو مجھے بتاؤ کیا تم نے ایسی کہانی سُنی؟"

یہ کہتے وقت اُسکی آواز کا لہجہ ایسا تھا کہ جیاکومو لیمپ سے نظریں ہٹا کر اُسکی طرف دیکھنے لگا، اُسکا چہرہ سفید دکھائی دیتا تھا، وہ بھی کانپا اور کہنے لگا" کونسی کہانی؟"

"ایک ایسے آدمی کی کہانی جس کے چچا نے ظلم سے اُسے غلامی کی دائمی قید میں دیدیا ہو؟"

اُنہوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا، جیاکومو نے کہا" آپکو یہ کہانی کس نے سُنائی؟"

"میرے والد نے، اُس وقت جبکہ وہ قریب بہ مرگ تھا۔ سولہ سال ہوئے اُس نے کونٹ جیاکومو بیسکیبی کو جو جائز کونٹ ہے ایک بحری ڈاکو کے حوالے کردیا، اور تمام لوگوں کو یقین دلادیا کہ وہ ڈوب گیا ہے، اُس نے اپنا یہ گناہِ کبیرہ مجھے بتایا اور میں نے صلیب پر ہاتھ رکھکر اُسکی تلافی کرنے کی قسم کھائی"

جیاکومو نے کہا" اپنے والد کی رُوح کو بچانے کے لئے؟"

اُس نے جواب دیا" ایک گناہِ عظیم کو بخشوانے کیلئے مجھے میرا چچا زاد بھائی ضرور ملنا چاہیئے"

نوجوان نے کہا" وہ ضرور ملیگا"

جیاکومو نے پوچھا" اور اگر آپ اُس آدمی کو پالیں تو؟"

"تو وہ کونٹ ہے ـــ اُسی وقت جب وہ سینٹاروزا میں واپس آئے"

"اور آپ اپنے تئیں اُس کے لئے اتنی دولت سے محروم رکھیں گی؟"

اُس نے جواب دیا "یہ سب اُسی کا حق ہے، میرا کچھ نہیں، میں اُس دولت سے ایک پائی بھی نہیں لے سکتی جو میری نہیں"

ایک کمزور اور نازک ہاتھ سے اُس نے اُن کاغذات کی طرف اشارہ کیا جنہیں ڈان اجینیو اُلٹ پُلٹ رہا تھا، وہ کہنے لگی "اپنی ماں اور ڈان اجینیو کی جائداد سے میں خزانے کی کمی پوری کردونگی"

زائر نے مسکرا کر پوچھا "اور آپ خود کیا کرینگی؟"

اُس نے جواب دیا "ڈان اجینیو میری خبر گیری کریگا"

پھر کہنے لگی "کیا تم نے ایسی کہانی سُنی؟ کیا تم ہماری مدد کرسکتے ہو؟ کیا تم جیاکومو کے متعلق کچھ جانتے ہو؟

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، ڈان اجینیو نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہ کیا جانتا ہے؟"

جیاکومو نے اچانک اپنا سر اُٹھایا اور کہا "نہیں آپکا خیال صحیح نہیں، میں نے ایسی کہانی سُنی ہے اور اُسی کہانی کے باعث میں سینٹاروزا میں آیا ہوں"

آرسولا کا چہرہ سُرخ ہوگیا اُس نے کہا "تم ـــــــ تم اُس آدمی کے متعلق جانتے ہو جس کی ہمیں تلاش ہے، آہ اجینیو! میرے والد کی دعاء قبول ہوگئی! یہ اُسی کی توبہ کا نتیجہ ہے، یہ ایک معجزہ ہے!"

جیاکومو نے کسی قدر خشونت سے ایک مشتاق چہرے سے دوسرے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "میں جائز کونٹ بیسکیپی کو جانتا ہوں، اور اُسی نے مجھے یہاں بھیجا ہے"

آرسولا زرد ہوگئی اور اپنے منگیتر کے ساتھ لگ گئی، جیاکومو نے کہا "میں اُس وقت الجیریا میں تھا جب میں آپکے چچا زاد بھائی سے ملا"

اُس نے آہستہ سے کہا "آہ کس حالت میں، کس مصیبت میں؟"

"پہلے وہ غلام بنا کر بیچا گیا، لیکن اُسکے آقا نے اُسے اپنا متبنے بنالیا، اور ایک بیٹے کی مانند اُس سے سلوک کیا، جب اُس کا آقا مر گیا، تو وہ اُسکی جائداد کا وارث ہوا اور ایک بیش بہا دولت اُسکے ہاتھ لگی"

ڈان اجینیو نے کہا "لیکن وہ یہاں آکر اپنی اس جائداد کو حاصل کرنیکی کوشش کیوں نہیں کرتا؟"

ایک طنز آمیز تبسم زائر کے لبوں پر کھیلا، وہ کہنے لگا "اُس نے مشرق کی زندگی کو بہت

خوشگوار پایا، صرف چند لوگ جانتے تھے کہ وہ عیسائی ہے — اُسکی رام کہانی کسی نے نہیں سُنی"

"تاہم اُس نے تمہیں بتادی؟"

"ہاں مجھے بتائی، میں موروں کا قیدی تھا، اُس نے مجھے خرید لیا اور ایک رات مجھے بلاکر اپنی یہ کہانی سُنائی"

"اے زائر! یہ کس لئے؟"

جیاکومو کی تھکی ہُوئی نگاہ آرسولا پر پڑی اور وہ کہنے لگا "کیونکہ وہ مر رہا تھا"

لڑکی نے کانپ کر کہا "مر رہا تھا!"

"وہاں ایک سریع الاثر زہریلے بخار سے ——— اُس نے مجھے آزاد کردیا، اور مجھ سے کہا کہ جب تم یورپ جاؤ، تو صقلیہ کے شہر ینستار دزا میں جاکر اُس آدمی کو ضرور تلاش کرنا جسے کونٹ بیسکیی کہتے ہیں، اور پھر اُس نے چند الفاظ میں مجھے وہی کہانی سُنائی جو آپ نے ابھی سُنائی ہے"

"وہ — وہ مر گیا؟"

"ہاں اُسی رات — آرام سے، اور اُس نے مجھے آپکے والد کے نام ایک پیغام دیا، جواب کئی برس کے بعد میں آج رات لایا ہوں، لیکن بعد از وقت"

آرسولا نے کہا "مجھے سُناؤ"

ایک لمحہ کے لئے جیاکومو متامل ہُوا، پھر کہنے لگا "اُس نے یہ پیغام دیا تھا، کہ میں نے اپنی زندگی یہاں عمدگی سے بسر کی، تم زمینوں کی اچھی طرح نگہداشت کرنا اور میری بہن آرسولا کو شادی کے موقعہ پر خاطر خواہ جہیز دینا، اور یہ کہ میں نے تمہیں معاف کردیا ہے"

آرسولا نے اپنا سر ڈان اجینیو کے سینے سے لگا دیا، اور اُسکی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ وہ کہنے لگی "اُس نے معاف کردیا! کاش اباجان زندہ ہوتے! آہ میں نے تو زنجیروں، چابکوں اور غلامی کا تصور کیا تھا!"

ایک بار پھر وہ مُسکرایا، اُسکے بدن پر ابھی تک زنجیروں اور چابکوں کے نشانات تھے، اُس نے جواب دیا "بہن آپکا بھائی بڑے اطمینان سے مرا آپکو اُسکے متعلق کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں"

وہ اجینیئو سے الگ ہوکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی، اور نرمی سے زائر کی آستین کو بوسہ دیا۔ جیاکومو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آرسولا کو اُٹھاکر اجینیئو کی طرف کر دیا اور کہا "آپ اپنے بھائی کی جائز وارث ہیں۔ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں بھی مُردوں کی طرف سے تحائف لاؤنگا، مرحوم جیاکومو بیسکیمی آپکے لئے یہ تحفہ بھیجتا ہے"

وہ جانے کے لئے فوراً کرسی سے اُٹھا۔ اُنہوں نے روکا، لیکن اس نے جواب دیا "نہیں اب کل پھر اسکے متعلق گفتگو کرینگے، اب میں تھک گیا ہوں"

وہ اُنہیں اکیلا چھوڑ کر نیچے اُترا، جہاں دربان ایک انگیٹھی کے سامنے بیٹھا تھا، جیاکومو نے کہا "دوست میں بہت پیاسا ہوں"

دربان پانی لینے گیا، جیاکومو اب اکیلا رہ گیا، اُس نے جھٹ اپنی جیب سے کاغذات نکال کر آگ میں جھونک دئے، جب وہ جل کر راکھ ہو گئے تو یہ بڑبڑا کر کہنے لگا "مُردہ کے تحائف ـــــ مُردہ کے تحائف!"

پھر اُس مکان کی طرف دیکھ کر، جو اُسکی ملکیت تھا، اور جسے اب اُس نے ترک کر دیا تھا وہ آہستہ سے دروازے سے باہر نکل گیا، چاند آسمان پر چمک رہا تھا، رات ازحد سرد تھی، اور کوہ ایٹنا سے سرد ہوا چل رہی تھی، چند لمحہ بعد آرسولا زائر کو کھانا کھلانے نیچے اُتری، لیکن اُس کا کچھ پتہ نہ تھا، وہ چلا گیا تھا، اس کے بعد آج تک کسی نے بھی اُسے سینٹا رونزا یا صقلیہ میں نہیں دیکھا +

نظامی　　　　　　　　　　(ماخوذ)

موجِ شرار

کیا لطفِ سیرِ گُل غمِ ہجرانِ یار میں
اک آگ سی لگی نظر آئی بہار میں

یہ رنگ تھا نہ خندۂ صبحِ بہار کا
ہے گُل فروش کس کا تبسم شرار میں

ہر دل ازل سے خونِ تمنا میں غرق ہے
آیا نہ فرق قاعدۂ روزگار میں

میں اور حدیثِ شوق سُنا بھی سکوں تجھے
ڈرتا ہوں مر نہ جاؤں کہیں اضطرار میں

تُو اور مرے پیام کا دینے لگے جواب
تیرا کرم ہے ورنہ ہوں میں کس شمار میں

طوفانِ حشر سر پہ اُٹھا ہے اُٹھا کرے
اک عمر سے ہوں گردشِ لیل و نہار میں

بُلبل سے گُل جُدا نہ کبھی ہو خدا کرے
ماتم سرا بنا ہے گلُستاں بہار میں

پھر ہو رہا ہے سینہ ترے غم سے داغ داغ
آ دیکھ پھُول کِھلنے لگے لالہ زار میں

شاید بہشتِ عشق میں ہے اِمتحاں مرا
کاٹا ہے مجُھ کو سانپ نے فصلِ بہار میں

ہیں میرے ساتھ دفن سبھی حسرتیں مری
چھوٹی سی ایک قبر ہے میرے مزار میں

ہوں مے گسارِ عشق مری مے یہی تو ہے
جس کی جھلک ہے دیدۂ خونابہ بار میں

گاتا ہوں نغمہ ہائے محبت تمام دن
دل بہ رہا ہے نغمہ کی اِس جوئبار میں

بیگانہ اک جہاں سے ہوں اب میں کدھر کو جاؤں
میں آکے راہ بھُول گیا کوئے یار میں

سوزِ ندگی نثار اگر زندگی ہو یوں
کٹ جائے کاش عمر ترے انتظار میں

حامد علی خان

محفلِ ادب

اساتذہ کے کلام میں املا کی تجدید۔ حامد اللہ صاحب افسر بی اے نے مطبوعہ مراسلہ کے ذریعہ سے دریافت فرمایا ہے" میں قدیم اُردو شعرا کے دیوان مرتب کر رہا ہوں جو عنقریب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر شائع ہونے والے ہیں میرتقی۔ سودا۔ میردرد وغیرہم کے کلام میں اکثر ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو آجکل متروک ہیں' بعض لفظ تو ایسے ہیں جو بالکل ترک کر دیئے گئے۔ جیسے "ٹک" تئیں" وغیرہ۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں مثلاً "کسو" کبھو" "اُن نے" انکی جگہ اب "کسی" کبھی" "اس نے" مستعمل ہیں میری رائے یہ ہے کہ ہم ان الفاظ کو بلا کسی ہرج کے موجودہ صورت میں لکھ سکتے ہیں اس طرح بحر میں بھی فرق نہ آئیگا اور کلام میں موجودہ زمانہ کے مطابق فصاحت بھی پیدا ہو جائیگی۔ مثلاً

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا

اس مصرعہ کو اگر ہم اس طرح لکھیں۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا

تو بہتر ہوگا۔ اس میں کسی قسم کا تصرف نہیں ہُوا ہے' صرف املا میں ذرا سا فرق کیا گیا ہے۔ انگریزی میں اسکا عام رواج ہے۔ چوسر۔ شیکسپئیر وغیرہ کے اشعار اور ڈرامے بالکل قدیم زبان میں تھے لیکن اب انہیں بالکل نئی زبان میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

میں انگریزی کی طرح کوئی خاص تصرف نہیں کرنا چاہتا۔ صرف بعض الفاظ کے املا کو زمانہ حال کے مطابق بدل دینا چاہتا ہوں' لیکن میں اساتذہ کے کلام میں اتنی دست اندازی بھی اُردو کے مستند انشا پردازوں کی رائے کے بغیر کرنا نہیں چاہتا"

سوال دلچسپ ہے اور بظاہر کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی کہ بعض الفاظ کے املا کو زمانۂ حال کے مطابق اس طرح بدل دیا جائے کہ کسی قسم کا تصرف نہ ہونے پائے اور بحر میں بھی فرق نہ آئے لیکن احتمال ہے کہ اگر نہایت احتیاط اور ذمہ دارانہ حیثیت سے املاء کو نہ بدلا گیا اور عام طور پر پُرانے الفاظ کے املا کو جدید الفاظ سے تبدیل کر دیا گیا تو اُستادوں کے کلام کو شدید صدمہ پہنچ جائیگا۔ اور سرمایۂ ادب بھی انگریزیت کی فضا میں غارت ہو جائیگا' بہتر تو یہ ہے کہ میر سودا اور درد سے استادوں کے کلام کے املا تک کو ہاتھ لگانیکی جسارت نہ کیجائے کیونکہ اس دورِ بے ہنری میں بہت سے ایسے ہاتھ نکل آئینگے جو املا کے بعد اُستادوں کے الفاظ کو بدلنا بھی جائز سمجھنے لگینگے۔

"شمع"

دنیا کا سب سے بڑا لغت - دنیا کا سب سے بسیط لغت زبان انگریزی کا ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے تیار ہو رہا ہے۔ اسکی تیاری میں متبحرین زبان مصروف ہیں ۱۸۵۸ء میں اس لغت کی ترتیب و تدوین شروع ہوئی تھی اب تک ۹ جلدیں ختم ہو چکی ہیں جن میں چار لاکھ الفاظ کے معنی درج کئے گئے ہیں اور الفاظ کے مفہوم کے ساتھ پونے دو کروڑ کے قریب مثالیں بھی اساتذہ کی پیش کی گئی ہیں +
"زمانہ"

بندروں کی زبان کی تدوین۔ مسئلۂ ارتقاء کی عقدہ کشائی کے لئے یورپ کے دو ماہرین نے بندروں کی زبان کی تحصیل و تدوین کی طرف توجہ کی ہے حصول مقصد کے لئے ان دونوں نے بندر کے دو بچوں کی اپنی نگرانی میں پرورش کی اور دوران پرورش میں ابتدا ہی سے بامعان نظر انکی زبان کا مطالعہ کرتے رہے اور جب انکے تجربے نے انکی رہبری کی اور وہ ان بچوں کی زبان سمجھنے لگے، تو اسکی تدوین کی طرف متوجہ ہوئے، اور اس خاص موضوع پر ان دونوں نے اپنی ایک کتاب شائع کی، جس میں اس موضوع کے متعلق تمام معلومات اور اپنے تمام تجربے قلمبند کر دیئے ہیں، اور نیز انکی زبان کو کاغذی پیراہن میں لے آئے ہیں، مثلاً بندروں کی زبان میں لفظ "غاک" سے مراد "کھانا ہے" اسی طرح اگر ان کی زبان سے لفظ "کاہا ہا"، "اواہو" تو یہ انکی "ہنسی" ہے اور اگر "یہ ہوا وہ" نکلے تو انکا "خوف" ظاہر ہوتا ہے، ان دونوں ماہرین میں سے ایک ڈاکٹر برکس ہیں، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ان بندروں کے منہ میں بعض ایسے "اعضائے نطق" پائے جاتے ہیں، جو انسانوں کے "اعضائے نطق" کے مشابہ ہیں، اور انہیں اعضا میں "قوت ذکاوت"، پائی جاتی ہے جسکی وجہ سے وہ الفاظ کو انکے صحیح معنے میں استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں +
معارف

دوستی۔ تمام خوشیوں سے زیادہ یقینی اور پُر اطمینان ایسے دوست کی دوستی کی خوشی ہے جو محبت میں سچا اور پکا ہے، اس یقین کا لطف اور سرور ہی ہمارے تفکرات کو مٹا دیتا ہے اور اسی سے سخت مصائب بھی قابل برداشت ہو جاتے ہیں، مصائب کا سچے دوستوں کی ہمدردی سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی علاج نہیں، موت کے خیال سے جو روحی تکلیف ہمکو پہنچتی ہے سچے دوستوں کی دوستی کا اطمینان ہی اسے رفع کر سکتا ہے۔ دوستوں کی شناخت ہمکو انکی آمد و رفت کی قلت یا کثرت سے نہ کرنی چاہیئے اور نہ دوستی کی پاک رسوم اور طریقوں کو شناسائی کی ان فضول رسم و رواج سے مخلوط نہ ہونے دینا چاہیئے جو تجارت پیشہ یا اور لوگوں سے

سلسلۂ تجارت یا دیگر تعلقات میں جاری ہو جاتے ہیں۔ (رسالہ تجلی)

لمعات

شرعِ نبی سے حق نے اپنی حجت کا اتمام کیا — عرضِ کمالِ حسن کو پیدا نور نے ماہِ تمام کیا

جذبِ پیامِ حق کے اثر سے کافر نے دل تھام لیا — ہم نے اسی شمشیر سے دودۂ کفر کا قتلِ عام کیا

خرمنِ شرک پہ برق گرائی ایک خدا کا نام لیا — آگ بتوں کے گھر میں لگائی کفر کا یوں انجام کیا

ہمکو جنوں ہے باعثِ ناز اور تمکو عقل ہے وجہِ غرور — اِس نے ہماری بات بنائی اُس نے تمہارا کام کیا

ہم نے جذبِ شوق سے اپنے دل میں اُسکو دیکھ لیا — تم نے نگاہ کو وقفِ حیرتِ جلوہ برلبِ بام کیا

بوالہوسوں نے عشق کا دعوےٰ کر کے قیامت ڈھائی ہے — آپ تو رسوا ہو گئے ناحق ہم کو کیوں بدنام کیا

عشق میں شورِ ملامت نے کچھ اور کیا بیباک ہمیں — ناصح تجھ کو خبر بھی ہے اسکی تو نے یہ کیا کام کیا

موم کیا اُس سنگیں دل کے دل کو پیامِ اُلفت نے — ہے یہ فسوں کچھ ایسا جس نے وحشی کو بھی رام کیا

کب ہے یہ اُمید کیونکر ہے یہ ممکن دل کو دل سے راہ نہ ہو — سوزِ دلِ پروانہ نے آخر شمع کا کیا انجام کیا

تاکہ تمنا دل کی نہ ہو شرمندۂ حرفِ سوال کہیں — ہم نے فریب سے قاتل کو آمادۂ قتلِ عام کیا

جرمِ تغافل اب بھی ہے قائم ہم سے تم کیوں دُور رہے — اچھا ہم نے یہ بھی مانا تم نے ہمکو سلام کیا

آنکھیں لگی ہیں راہ پہ ہر دم لیکن حامد آپ نہ آئے
شام کو ہم نے صبح کیا اور صبح کو ہم نے شام کیا

(زمیندار) — حامد علی خاں

جذباتِ ہمایوں

آنریبل خان بہادر میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم بی۔ اے۔ بار یٹ لا جج چیف کورٹ پنجاب کا مجموعۂ کلام جس میں اُنکی ولولہ انگیز اخلاقی فلسفیانہ نظمیں۔ اور دلکش غزلیات درج ہیں۔ شروع میں اُنکے سبق آموز حالاتِ زندگی اور کلامِ ہمایوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ حجم (۱۸۰) صفحات۔ دو تصویریں اعلیٰ درجہ کی لکھائی چھپائی۔ ولایتی کاغذ قیمت درجہ اوّل ایک روپیہ۔ دوم ۱۲ر علاوہ محصولڈاک

المشتہر

مینجر رسالۂ ہمایوں۔ ۳۰ مزنگ روڈ۔ لاہور

اشتہار دینے کا نادر موقع

نرخنامہ اشتہارات رسالۂ ہمایوں لاہور

قواعد وضوابط

اشتہار بھیجنے کے وقت حسبِ ذیل امور مدنظر رکھیئے۔

(۱)۔ اشتہار کی اُجرت بہرحال پیشگی پہنچنی چاہیئے۔

(۲)۔ خلافِ تحریر اور دل آزار اشتہار درج نہیں کیئے جاتے۔

(۳)۔ اگر آپ اپنے اشتہارات کے چربے بھیجدیں تو ہمیں سہولت اور آپکو اطمینان رہیگا۔

تعدادِ طبع	۱ صفحہ	½ صفحہ	¼ صفحہ
۱ مرتبہ	۷ روپیہ	۴ روپیہ	۲ روپیہ آٹھ آنے
۳ مرتبہ	۲۰ روپیہ	۱۱ روپیہ	۶ روپیہ
۶ مرتبہ	۳۸ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۱ روپیہ
۱۲ مرتبہ	۷۰ روپیہ	۳۸ روپیہ	۲۰ روپیہ

المشتہر مینجر رسالۂ ہمایوں ہر کوٹھی میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا ۳۰ مزنگ روڈ لاہور

اُسوۂ حسنہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

ــــــ قرآن حکیم

"ہم جہالت و ضلالت کے قعر میں گرے ہُوئے تھے۔ بُت پرستی ہمارا قومی کیش و آئین تھی۔ ہم مُردار کھاتے اور فحش بکتے تھے۔ کوئی وصفِ انسانی ہم میں باقی نہ رہا تھا۔ .... اتنے میں خدا نے ہمیں میں سے ایک شخص پیدا کیا جس کی شرافتِ نسب، صدق و تدین اور صفائے باطن ہم پر خوب آشکار ہے۔ اُس نے ہمکو توحیدِ ایزدی کی دعوت دی، بت پرستی سے روکا اور راست گفتاری کی تلقین کی۔ اُس نے ہمکو نصیحت کی کہ امانت میں خیانت نہ کرو، ابنائے جنس سے بہ رحم و رفق پیش آؤ، حقوقِ ہمسائیگی کی نگہداشت کرو، عورتوں کو بُرا نہ کہا کرو، یتیموں کا مال نہ کھاؤ اور گناہوں سے بچے رہو"

جعفر طیار رضی اللہ عنہ

وہ برقِ تجلّی جو صبحِ آفرینش کو ازل کے افق پر جھلملاتی اور جگمگاتی ہوئی نظر آئی تھی، سینا کے ذرہ ذرہ کو اپنی محشر خیز تڑپ سے بے قرار کر چکی تھی۔ اس کا شعلۂ جمال، شعیر کی فضا میں خاموشی سے چمک چمک کر ارضِ بنی اسرائیل کے پردۂ ظلمت پر اپنے منور نقوش چھوڑتا گیا تھا اور اب وقت آپہنچا تھا کہ اسکی گہنی فروز لمعانیاں ابرِ غلیظ کے اُس سیاہ سائبان کو جو فاران کی چوٹیوں پر چھایا ہُوا تھا، تار تار کرکے ایک نا متناہی چشمۂ نور کی طرح صفحۂ آفاق پر بہ نکلیں۔ آخر ظلمت چھٹ گئی اور نور آگیا۔ ایک اُمی کو کتاب دی گئی اور کہا گیا کہ اسے پڑھو۔ مگر اس نے جواب دیا کہ میں تو ناخواندہ ہوں اور پڑھ نہیں سکتا[1]۔ اُس پر اُس سے کہا گیا کہ اپنے خالق کا نام لے کر پڑھے[2] اور اُس کو وہ علم عطا کیا گیا جو اس سے پہلے کسی انسان کو نصیب نہ ہُوا تھا۔ یہ علم، عمل کا سامان بھی اُسی طرح اپنے ساتھ لایا تھا، جس طرح آفتاب اپنے نور سے ذرہ ذرہ کو تڑپاتا ہُوا طلوع ہوتا ہے۔ اس محرمِ سترالاسرار اُمی کے لئے علم حقیقی کی یہ شمعِ ہدایت قدم قدم پر اپنا نورانی پرتو ڈالتی تھی۔ اُس کا علم اُس کے عمل کا رہ نما، اور اُس کا عمل اُسکے علم کا آئینہ دار تھا۔ اُس کی لائی ہُوئی کتاب کا اُس کی حیاتِ طاہرہ سے مقابلہ کرو تو صاف معلوم ہو جائیگا

[1] صحیفۂ یسعیاہ، باب ۲۹: ۱۲۔ [2] قرآن مجید سورۂ علق۔

کہ اُس کا علم و عمل ایک ہی حقیقتِ الٰہیہ کے دو رُخ تھے۔ خدا نے اپنے کلام کی اس مکمل عملی تصویر کو دیکھا اور بنی نوعِ انسان کو یہ کبھی فراموش نہ ہونے والا پیغام دیا:۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاٰخر و ذکر اللہ کثیرًا

بلاشبہ تم میں سے اُن لوگوں کے لئے جو اللہ اور روزِ قیامت سے ڈرتے اور کثرت سے یادِ الٰہی کرتے رہتے ہیں ۔ رُسولِ خدا کی زندگی، میں پیروی و اتباع کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہے

اس ارشادِ پاک میں اہلِ بصیرت کے لئے حسبِ ذیل نکتہ آموز مطالب و معارف مرکوز ہیں:۔

(ا)۔ انسان اپنی اخلاقی صلاح و فلاح کے لئے کسی عمدہ نمونہ کا محتاج ہے ۔

(ب)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی یہ قابلِ تقلید نمونہ پیش کرتی ہے

(ج)۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امتیازی فخر حاصل ہے کہ خدا نے آپکے متنوع اور محیط الکل حالات حیاتِ نسلِ انسانی کی رہنمائی کے لئے بطور کامل و مکمل نمونہ کے منتخب کئے کیونکہ کلام مجید میں جہاں اور صلحا و انبیا کا مجاہدۂ حق سراہا گیا ہے وہاں انکی مخصوص زندگی من حیث المجموع تمام بنی نوع انسان کے اعمال کا محور و مرکز قرار نہیں دی گئی ۔

ان حقائقِ سہ گانہ کی دوسری شق تو اصولاً ہمارے اس مقالہ کا موضوع ہے۔ لیکن پہلی اور تیسری شق کے متعلق، اس گنجائش میں، ایک اجمالی تبصرہ سے زیادہ کی جگہ نکالنا نہ صرف دُور از کار بلکہ غیر ممکن ہے کیونکہ اصل مقصود تو صرف یہی ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے گزرا ہوا سماں، مثالِ ہوالنقشہ آنکھوں کے سامنے آ جائے ———— افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت ۔

کائنات میں انسان سے زیادہ عجیب و غریب کوئی چیز نہیں۔ اس کا دل کس قدر اتھاہ گہرائیاں کس قدر بے پایاں وسعت اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے! اخلاقِ انسانی کے عالمِ نیرنگ میں کتنے عظیم تنوعات اور کتنے مہیب تناقضات سے ہمکو دوچار ہونا پڑتا ہے، اور ناممکن ہے کہ ہماری ہستی بے اختیار لرزنے نہ لگے جب یہ ہیبت افزا مگر عبرتناک اور اثر انگیز حقیقت اپنی پوری عُریانی میں اُسکے سامنے آ جائے کہ اس عالمِ نیرنگ کی ناپید اکنار فضا، ایک طرف تو اُن حدود کو بھی قطع کرتی ہوئی جو ملائک کی رسائی سے وراء الورا ہیں، خود حریمِ ایزدی کی آستانہ بوسی پر ناز کر رہی ہے اور دوسری طرف اس کا سُراغ

ضلالت و معصیت کے ویرانہ کی اُن بھیانک تاریکیوں میں ملتا ہے جہاں شاید کبھی ابلیسِ لعین کے قدم بھی نہیں پہنچے۔ کسی نے خوب کہا ہے:۔

آدمی زادہ طرفہ معجونست — از فرشتہ سرشتہ وز حیواں
گر کند میلِ ایں شود بہ ازیں — ور کند میلِ آں شود کم ازاں

انسان کی فطرت جس کی تعمیر قدسیت اور بہیمیت کی متعارض قوتوں سے ہوئی ہے، انہیں دو میں سے کسی ایک قوت کی شکست و فتح پر انسان کو "احسن تقویم" کا تاج پہنا دیتی ہے یا "اسفل سافلین" کی خاکِ مذلت پر پٹخ دیتی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ایمان و ہدایت کی صلاحیت، بمصداق فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا، خانوادۂ آدم کے ہر فرد کو ودیعت کی گئی ہے لیکن تاریخ نوعِ انسانی اُٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اقوام و ملل رہ رہ کر صراط المستقیم سے بھٹک گئی ہیں اور خطوات الشیطان کی پیروی کرنے لگی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بالعموم سرشتِ انسانی کا علوی یا سفلی عنصر اثراتِ ماحول سے منفعل ہوئے بغیر، بطورِ خود، اپنے مخصوص مظاہر کے ساتھ حیاتِ انسانی کے عرصۂ عمل میں بر دئے کار نہیں آسکتا۔ کیونکہ جس طرح شرار پیدا کرنے کے لئے پارۂ سنگ کو کسی بیرونی تہیج کی ضرورت ہوتی ہے، اُسی طرح انسانی خصائل کو بھی اپنے اظہار کے لئے خارجی اسباب و عوامل کا منت کش ہونا پڑتا ہے۔ یہی وہ کڑی شرط ہے جو انسان کی اخلاقی زندگی کو حق و باطل کی اس قدر خوفناک رزمگاہ بنائے ہوئے ہے کیونکہ محرکاتِ شر اُس پر ہر طرف سے ہجوم کرتے ہیں اور اُس کی رُوح کے حیوانی جزو کو اُبھارتے اور برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔ انسان اس ہنگامہ سے گھبرا کر کوئی سہارا ڈھونڈتا ہے مگر زبانی تعلیم سے اُس کی تشفی نہیں ہوتی۔ اُس کی فطرت کی اُفتاد ہی ایسی ہے کہ نصیحت کی بجائے ناصح کا عمل اسے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اس موقع پر، برگزیدگانِ حق جو فیضانِ الٰہی کے مخصوص انوار سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اُس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ ہر نبی بلکہ ہر مومنِ صادق اپنے ساتھ ایک عظیم الشان روحانی قوت لاتا ہے جو ایک صاعقۂ نور بن کر انسان کی ہستی کے عمیق ترین احساسات سے اس قیامت خیز طریقہ پر متصادم ہوتی ہے کہ اس میں قرن ہا قرن تک ایک آسمانی لرزش چھوڑ جاتی ہے۔ یہ قدسی ہیجان خدا کی زندہ آواز بن کر انسان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پیغام دیتا ہے اور اس کی رُوح کی ملکوتی کیفیات کو بیدار کر کے اُن میں یہ ولولہ پیدا کرتا ہے کہ اپنے عملی ظہور سے اپنی زندگی کا ثبوت

دیں۔ اس وقت محرکاتِ شر کی عشرت اندوز تحریصات کی حقیقت اُس نظر فریب گلزار سے زیادہ نہیں رہتی جس کا ہر خوش رنگ پھول زہراب میں بسا ہوا اور جس میں ہر شاخِ گل کے ساتھ ایک جاں ستاں افعی لپٹا ہُوا ہو۔
انسان کو کسی قابلِ اتباع نمونہ کی ضرورت محض اسی لئے داعی نہیں ہوتی کہ وہ اس سے انفراداً اپنی حیاتِ اخلاقی کی رہ نمائی کر سکے بلکہ اس مسئلہ کی ایک اجتماعی حیثیت بھی ہے ۔

ہم اپنے معمولی مشاہدات سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے ، اسکے اعمال و افعال ایک سلسلۂ وحدت میں مربوط ہوتے ہیں۔ ہماری مادّی زندگی میں یہی جذبۂ مدنیت مختلف نظام ہائے حکومت کی صورت اختیار کرتا ہے لیکن ہماری روحانی زندگی بھی جو مادیت کے عالمِ شہود سے منفصل نہیں کی جا سکتی کسی ایسے نظامِ سلطنت کی مقتضی ہے جو ہماری اخلاقی ضروریات کا کفیل ہو سکے۔ اگر ہر انسان اپنے انفرادی فہم و ادراک کی مدد سے اپنی ذات کو کسی خاص آئینِ اخلاقی کا پابند کرلے ، تو اس میں شک نہیں ، کہ وہ اُس جرأت کے ساتھ جو خلوص و دیانت کی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے ، اپنے ضمیر کا سامنا کر کے یہ کہہ سکیگا۔ کہ "مَیں نے اپنا فرض ادا کر دیا" لیکن مختلف اصول ہائے کار کا تصادم جو اس قسم کی غیر منظّم زندگی کا اٹل نتیجہ ہے حیاتِ انسانی کی بساطِ تمدن کا تار و پود بکھیر کر رکھدے گا۔ کیونکہ مختلف عقول و افہام کے قائم کردہ نظریاتِ اخلاق کا کسی ایک نقطۂ مرکزی پر مجتمع ہونا از قبیلِ محالات ہے۔ جو فعل میرے معیارِ اخلاق پر پُورا اترے لازم نہیں کہ دوسروں کا اخلاقی نصب العین بھی اُس سے مطابقت رکھتا ہو۔ میں ایک راہِ عمل انتخاب کرتا ہوں تو مجھ جیسے دس دوسرے انسان ایک بالکل الگ رستہ اختیار کرتے ہیں لیکن مذہب کا کام تو ایک انسان کو دوسرے سے قریب تر لانا ہے اور من و تو کے اِن باطل امتیازات کو مٹا کر نسلِ آدم کو ایک شیرازۂ اتحاد میں منسلک کرنا اسکے فرائضِ عالیہ میں داخل ہے۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کو ایک مرسل من اللہ پُورا کرتا ہے۔ وہ ایک مجسّم الٰہی ضابطہ ، ایک زندہ اخلاقی قانون بن کر دنیا میں آتا ہے۔ اُس کے بنی نوع اُسکے اُسوۂ حسنہ کو دیکھتے ہیں۔ اُسکے بے ریا خلوص کو دیکھ کر اُن کی فطرت کے نورانی عنصر کو تحریک ہوتی ہے اور اُنکی ہیئتِ اجتماعی بلاجبر و اکراہ ، اخلاقِ فاضلہ کے اس نمونہ سے تشبّہ پیدا کرنیکے لئے مضطرب نظر آتی ہے۔ اس طرح انسان کے روحانی تمدن میں کہ اسی پر اُسکے مادّی تمدن کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں ایک انضباط اور وحدت رونما ہوتی ہے اور دینی و دنیوی ترقی کی راہیں ہر طرف کھُل جاتی ہیں ۔

حکمیاتِ طبعی کا ایک مشہور مسئلہ ہے کہ ہمارے حاسۂ بصر کو سفید رنگ کا احساس سات مختلف لونی کیفیات کے امتزاج سے ہوتا ہے۔ یہ الوان سبعہ اپنی منفرد حیثیت میں بھی مخصوص فوائد رکھتے ہیں لیکن معمولی اور طبعی حالات میں انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ نُور کی شعاع ہفت رنگ کی اُس ترکیبی صورت کی طلب کرے جسے عرفِ عام "سفید روشنی" کے نام سے موسوم کرتا ہے اور جو تمام الوان معلومہ پر حاوی ہونے کے باوجود کسی ایک رنگ میں محدود و محصور نہیں ۔

انسان کی روحانی تاریخ اس طبعی مسئلہ کے ساتھ ایک عجیب دلپذیر مماثلت رکھتی ہے قدیم الایام سے انبیائے کرام اپنی اپنی اُمت کی رہنمائی اور خاص خاص مفاسد کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوتے رہے اور اس مقصد کو انجام دینے کی غرض سے دین برحق کے خاص خاص پہلوؤں کو روشن کرتے رہے کسی نے جن و انس اور مرغ و ماہی پر شہنشاہانہ فرماں فرمائی کی اور قوتِ ایمان کے کرشمے نمایاں کئے کسی نے فقر و فاقہ میں زندگی کے دن گزارے اور ہجومِ مصائب کے مقابلہ میں انتہائی صبر کا نمونہ پیش کر کے اہلِ تقوے کی شانِ درویشی کو آشکار کیا۔ کسی نے خدا کی تیغ جلال بن کر جہاد کا فرض ادا کیا، اور کسی نے حلم اور آشتی کی مجسّم تصویر بن کر طغیان و تمرّد کو بھی تسلیم و رضا سے تسخیر کرنے کی تلقین کی۔ غرض اِن نفوسِ قدسی میں سے ہر ایک نے دینِ فطرت کے مسائل پر ایک مخصوص رنگ میں روشنی ڈالی لیکن یہ بہ ظاہر متفاوت تعلیمات ایک ہی کُل کے منتشر اجزا، ایک ہی آفتاب کی متنوع اللّون تجلّیاں تھیں۔ نورِ ازل کی اِن ہزار رنگ شعاعوں کو ابھی ایک نقطۂ ماسکہ پر جمع ہونا تھا اور غارِ حرا سے نکلنے والے چاند پر اپنا عکس ڈال کر، مشرق اور مغرب، حال اور مستقبل کو یکساں طور پر اپنی ظلمت رُبا فروغ افشانیوں سے منور کرنا تھا۔ مگر اس قول سے یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ نبیِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے انبیاً کی زندہ جاوید تلقینات بجز انکی اپنی قوم کے کسی دوسری انسانی جماعت پر صادق نہیں آسکتیں، یا کسی خاص دور کے گزر جانیکے بعد اُن کے ارشادات کی صحت مشتبہ ہوگئی۔ وہ حقیقت کبریٰ جسکے جلووں سے زمین و آسمان سرشار ہیں، صبحِ کُن فکان سے ایک چلی آئی ہے اور شامِ علیہا فان تک ایک چلی جائیگی، لیکن اس میں کلام نہیں کہ انبیائے متقدمین کا ظہور مخصوص حالات میں مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے ہُوا تھا، اور اس لئے لامحالہ اُن کی زندگی اُس عمومیت سے عاری ہے جو تمام نوعِ انسان کی تہذیبِ نفس اور تزکیۂ اخلاق کے لئے کوئی مکمل اور جامع ضابطہ پیش کر سکے ۔

حضور سرورِ کائنات کے ظہور سے پہلے ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت قائم رہی کیونکہ کسی ایک فرستادۂ حق نے دینِ فطرت کو کامل اور مکمل نہ کر دیا تھا۔ زمانہ نے تمام انبیاء کی صرف اُن سنتوں کو محفوظ رکھا جن کے وہ مظہر کامل تھے اور جن سے انسان کو نفع پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر سے ہم ایک خاص ایمانی شان منسوب کرتے ہیں حضرت یوسفؑ کی حیا و امانت حضرت ایوبؑ کا صبر، حضرت ابراہیمؑ کی توحید پرستی حضرت عیسیٰؑ کا حلم و بردباری ان انبیائے کرام کی امتیازی نشانیاں ہیں۔ مگر جنابِ خاتم النبیین کے متعلق اس قسم کی تخصیص و تحدید سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ یہاں حیائے یوسف بھی ہے اور صبرِ ایوب بھی، توحیدِ ابراہیمؑ بھی ہے اور حلمِ مسیح بھی پھر جب دنیا نے دیکھ لیا کہ کوئی ایک ذات کس طرح بدرجۂ اتم ان متعدد صفات کی جامع ہو سکتی ہے تو بعثتِ انبیا کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

کچھ عجب نہیں کہ اگر منشائے ایزدی حضور ختم المرسلین سے قبل کے انبیائے کرام کے لئے وہ ماحول پیدا کر دیتا جو سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو میسر ہوا تو وہ برگزیدگانِ خدا بھی اُن تمام صفات و کمالات کو نمایاں کرتے، جن کا عملی ظہور عظیم تر مقاصد کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن انسانی احتیاج اور مصلحت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مصری کی ستمرانی کو دیکھتے ہیں اور اُسی وقت اُس کا خاتمہ کر کے اُسے کیفرِ کردار کو پہنچاتے ہیں[1] مگر جناب مسیح علیہ السلام کی تعلیم ہے کہ "بدی کا مقابلہ نہ کرو بلکہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر طمانچہ مارے، تو دوسرا بھی اس کے سامنے کر دو[2]" بادی النظر میں یہ تفاوت شاید تناقض معلوم ہو لیکن اربابِ فہم و فکر جانتے ہیں کہ نہ تو حضرت موسیٰ اور نہ حضرت مسیح (علیہما السلام) کی مقدس سنت صداقت سے خالی ہے۔ ایک میں خدا کی شانِ جلال اور دوسری میں شانِ جمال جھلک رہی ہے۔ ان مختلف شئون الٰہیہ نے ابھی کسی ایک ذات کو اپنی تجلیوں کا مورد و مہبط نہیں بنایا تھا اور زمانہ ابھی جامِ الست کی اُس گردشِ آخریں کا منتظر تھا جو تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کی مئے طہور پلا کر بزم میں ایک بدی نشاط چھوڑ جانے والی تھی۔ اس حقیقت کے بیان میں آگے چل کر زیادہ تفصیل و توضیح سے کام لیا جا سکیگا لیکن اس جگہ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ حضور خیر الانام علیہ السلام والتحیات کے اسوۂ حسنہ کی جامعیت ہی اسکا طغرائے امتیاز

---

[1] خروج، ۲۔ [2] متی، ۵: ۳۹۔

نہیں۔ بلاشبہ یہ امر بجائے خود کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی فقیری سے لے کر شہنشاہی تک کے تمام معاشرتی مراتب و مدارج پر حاوی ہے مگر اس بارہ میں ایک اور خصوصیت بھی اس قابل ہے کہ اُس کا لحاظ کیا جائے ۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ، یا بہ روایت امام غزالیؒ[1] حضرت سعید بن ہشامؓ نے حضرت عائشہ رضؓ سے خُلقِ نبوی کے متعلق سوال کیا تھا جس کا جناب صدیقہؓ نے یہ بلیغ جواب دیا کہ کان خلقہ القرآن۔ اگر تم حضور کے اخلاقِ جمیلہ کا اندازہ قائم کرنا چاہتے ہو تو قرآن پر نظر ڈالو کہ قرآن اور محمدؐ ایک ہی سرمدی صداقت کے دو رُخ ہیں۔ چاہو تو ایک کو علم کا نام دو اور دوسرے کو عمل کا۔ ایک کو آفتابِ ہدایت کہو اور دوسرے کو اس آفتاب کی تجلّی۔ اس نکتہ کے بیان کر دینے کے بعد یہ سمجھنے میں کوئی دِقت نہیں ہوتی کہ خدائے عزّ وجل نے انّا لہٗ لحٰفظون کا وعدہ فرماتے وقت گویا ذکرِ حمید ہی کے حفظ و صیانت کا پیغام نہ دیا تھا بلکہ سنتِ نبوی کے قیام و بقا کی بھی ضمانت دی تھی کہ یہ قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے چنانچہ ہم آج فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے سوا کسی مذہبی پیشوا کے سوانح زندگی دنیا کو اس شرح و بسط کے ساتھ نہیں ملے کہ خفیف سے خفیف جزئی تفصیلات بھی نظر کے سامنے آگئی ہوں۔ انتظامِ امورِ خانہ داری سے لے کر اہتمام و انضباطِ سلطنت تک حیاتِ انسانی کا کونسا شعبہ ہے جس پر اُسوۂ نبوّت نے اپنے بے نظیر انداز میں روشنی نہیں ڈالی! اور پھر ہمارے محدّثین نے احادیثِ صحیحہ سے غلط اور موضوع احادیث کے طومار خرافات کو، جسے یہود و منافقین کی فتنہ انگیز ریشہ دوانیوں نے فراہم کیا تھا، الگ کرنے میں کس قدر جانکاہی اور کنج کادی سے کام کیا! امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کی تنقیح و تحقیق میں انکی صحت کا جو بلند معیار مقرر کیا تھا، وہ کسی بڑے سے بڑے محقق تاریخداں کے لئے بھی موجبِ ناز ہو سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے سولہ سال کی لگاتار محنت کے بعد چھ لاکھ حدیثوں میں سے مکرّرات کو چھوڑ کر صرف چار ہزار حدیثیں اپنی کتاب میں لکھیں جو بجا طور پر اصح الکتب بعد القرآن کہلاتی ہے۔ حضرت امام مالکؒ نے کئی لاکھ حدیثیں اپنے بیٹے کو یاد کرائیں اور پھر پوچھا کہ "تم جانتے ہو ان حدیثوں کے یاد کرانے سے میری غرض کیا ہے؟ جواب ملا" ہاں غرض یہ ہے کہ میں سنّتِ نبوی کو اپنی زندگی کا

---

[1] "احیاء العلوم" ربع ثانی، کتاب العاشر ص ۳۳۵ ۔

دستور العمل بناؤں" امام ممدوح نے فرمایا "نہیں میرا یہ مقصد نہیں جو احادیث میں نے تمہیں حفظ کرائی ہیں سب موضوع اور غلط ہیں انکے علاوہ اگر تمہیں کوئی اور حدیث ملے تو اس کی صحت یا عدم صحت پر پھر غور کرنا" تحقیقِ حق اور تنقیدِ باطل کے لئے آئمہ حدیث نے کس قدر حوصلہ آزما کاوش کی اور کس قدر صبر شکن صعوبتیں جھیلیں! جس داستان کے سنانے والے عقیدت و خلوص اور ثقاہت و اعتبار کی ایسی گراں مایہ روایات کے حامل ہوں، اُس کی صحت و صداقت میں کیسے کلام ہو سکتا ہے!

ان تمہیدی مباحث سے فارغ ہونے کے بعد اب ہم اصل مطلب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ چونکہ اس مضمون کا موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ ہی نہیں، بلکہ آپ کا اُسوۂ حسنہ ہے، اِس لئے آپ کے مکارمِ اخلاق کے بیان کے ساتھ ساتھ لازماً اُن برکات و فیوض کا بھی مجمل تذکرہ کیا جائیگا جو آپکی پیش نمودہ مثال نے ملّتِ زہرائے اسلامیہ کے واسطہ سے دنیا کو پہنچائے ازبس کہ لفظ "اُسوہ" کے مفہوم کا اطلاق اُسی فعل پر ہو سکتا ہے جس کا کوئی تقلیدی پہلو بھی ہو۔ اس مختصر مقالہ میں اُسوۂ رسالت کے ہر پہلو کے متعلق تشریح و تفصیل سے کام لینا ممکن نہیں، تاہم جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا گیا ہے کہ

کان یخطب فی کل وقت بما تقتضیہ	آپ ہمیشہ مخاطبین کی ضرورت و مصلحت کا لحاظ
حاجۃ المخاطبین و مصلحتھم	کرکے تقریر فرماتے تھے۔

اُسی طرح دورِ حاضر کی ضروریات کے اقتضا سے آپ کی حیاتِ طاہرہ کے ان پہلوؤں کو نسبتاً زیادہ واضح کرنیکی کوشش کی جائیگی جو یورپ کی گمراہی کے ظلمت اندوز ہنگاموں پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوں، یعنی ہم اپنے ہادی کے زندۂ جاوید تقدس سے، انگریز شاعر سوئنبرن کے ہم آہنگ ہو کر یہ التجا کرینگے کہ

"آ اور ہمیں تہذیب سے نجات دے!"

جب حضور رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والتحیات نے "الا تتقون انی لکم رسول امین" کا پرانا سوال اپنی قوم کے سامنے دُہرایا تو آنحضرت کو وہی جواب ملا جو قرونِ ماسبق کی اُمتیں، اس سے پہلے کے

مرسلین من اللہ کو دے چکی تھیں۔ خدا کا آخری پیغام رساں پہلے تو مشقِ استہزا و استخفاف بنایا گیا، پھر رفتہ رفتہ جب اُسکی تحریکِ ربانی ایک بڑھتی ہوئی قوت کی صورت میں آشکار ہونے لگی تو اسے ترغیب و تحریص کے سبز باغ دکھائے گئے۔ اسکے بعد ترہیب و تخویف اور پھر ایذا و تشدد سے کام لیا گیا۔ انجام کار ان طاغوتی سرگرمیوں کا تدریجی سلسلہ، متعدد قاتلانہ منصوبوں کی شکل میں اپنے انتہائی نقطۂ طغیان کو پہنچ گیا، اور اگر خدائے ذوالمنن کا احسان عظیم آڑے نہ آیا ہوتا تو دنیا کی تاریخ آج کچھ اور داستان سناتی لیکن لوحِ محفوظ پر یہ نقش ثبت ہو چکا تھا:۔

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم و اللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ○

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں لیکن خدا خود اپنے نور کا اتمام کرنیوالا ہے، خواہ کافروں کو ناگوار ہو

وہ سماں بھی عجیب ہو گا جب حضور خاتم النبیین نے اپنے اقربا کو دعوت طعام دیکر ایک جگہ جمع کیا۔ اور پیغامِ الٰہی سُنا کر اُن سے پوچھا تھا کہ "تم میں سے کوئی ہے جو میرے ساتھ ہو؟" اُس وقت تذبذب اور تحیّر کی خاموشی جو تمام مجلس پر چھا گئی تھی، اُس کا طلسم یک بیک جنابِ علی مرتضیٰؓ کی پُر جوش آواز نے توڑا تھا کہ "یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں"۔ مجلس میں ابو طالب بھی موجود تھے جن کے سامنے کسی کو بیبا کی یا گستاخی کی جرأت نہ ہو سکتی تھی، لیکن ایک کبیر السن ان پڑھ آدمیؐ اور ایک نوعمر لڑکے کا دنیا بھر کے عقائدِ مروجہ کو پیغامِ جنگ دینا پورے مجمع کو اس قدر مضحکہ انگیز معلوم ہوا کہ سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے[1]۔ کوہِ صفا کے دل نشین خطبہ سے بھی یہی سلوک کیا گیا اور ابو لہب کی شقاوت "انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید[2]" کے ہمدردانہ پیغام پر، بجز ایک سفیہانہ پھبتی کے، اور کسی طرح اظہار شکریہ نہ کر سکی ○

مگر یہ تضحیک بہت جلد تردد کی صورت میں بدل گئی۔ آنے والے واقعاتِ مہمّہ جس طرح بعض دفعہ ہمارے ذہن پر پہلے سے اپنا عکس ڈال دیتے ہیں، اُسی طرح کفارِ قریش کو بھی بالآخر دین قویم کی چھپی ہوئی طاقتوں کے دھندلے سے تصور نے بیدار کیا۔ کعبہ کا بُت خانہ جس کے وہ متولی تھے پورے عرب کی بت پرستی کا مرکز اور اس لحاظ سے اُن کی دولت و ثروت اور رعب و اقتدار کا سرچشمہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ بت پرستی قریش کو محض اپنے آبائی مذہب کی حیثیت سے عزیز نہ تھی بلکہ

---

[1] ابو الفداء ص۱۱۷ [2] بخاری، ج ۲، ص ۲۷۳

اپنی دنیوی اغراض کے حصول کے لئے بھی وہ اُسکے قیام و دوام کے آرزومند تھے۔ چنانچہ ابراہیم کے یہ فرزند اپنے جدِ امجد کی عبادت گاہ کو، جس کی پاسبانی الطافِ خداوندی سے اُنہیں کے حصہ میں آئی تھی، مگر جسے اُنکے ناسپاس ہاتھ صدہا سال تک ناپاک کرتے رہے تھے، بہ دستور نجاستِ شرک سے آلودہ رکھنے کے لئے بے قرار ہو گئے۔ اسکے بعد سے آنحضرت پر وہ خوفناک مظالم و شدائد شروع ہوئے جن کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں آنحضرت ہی برداشت کر سکتے تھے۔ کسی ایذا یا تشدد سے ہر شخص بقدر اپنی ذکاوتِ حس کے متاثر ہوتا ہے، مثلاً ذرا سی سخت کلامی جسے ایک اخلاق باختہ مجرم ناقابلِ التفات سمجھتا ہے، بسا اوقات کسی سلیم الفطرت انسان کے لئے شدید کرب و عقوبت کا باعث ہوتی ہے۔ اس آخر الذکر اُفتادِ مزاج کے لوگوں کو دنیا میں سب سے زیادہ صدمات برداشت کرنے پڑتے ہیں کیونکہ زمانہ کا نامہربان اور درشت ہاتھ اُنکے دل کو مسلتا اور مجروح کرتا رہتا ہے۔ یہ تو عوام کی قلبی کیفیت ہے جسے پیغمبر کی صفائے قلب سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ خود آنحضرتؐ کی ذکاوتِ حس کی یہ کیفیت تھی کہ دوسروں کے سطحی اور معمولی جذبات و احساسات کو بھی خفیف سے خفیف ٹھیس پہنچانا آپؐ کو گوارا نہ تھا۔ لوگوں کے پاسِ خاطر کو اس حد تک ملحوظ رکھتے تھے کہ جب کسی شخص سے ملتے تو مصافحہ میں تقدیم کرتے اور جب تک وہ خود ہاتھ کھینچ نہ لیتا آنحضرت بھی اُس کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔ وعظ و نصیحت سے آنحضرتؐ کی غرض اپنی امت کی فلاح و بہبود کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی مگر بخاری میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ہم لوگوں کو ناغہ دے کر نصیحت فرماتے تھے تاکہ ہم اُکتا نہ جائیں۔ سائل کا سوال آپؐ رد نہ فرماتے تھے اور آپؐ کی انتہائی نزاکتِ حس کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کبھی دینے کے لئے کچھ پاس نہ ہوتا تو اس انداز میں عذرخواہ ہوتے گویا اپنے کسی قصور کے لئے معافی مانگ رہے ہیں۔ حضورؐ کے عظیم رحم و رفق اور بیمثال محبت و شفقت کا قیاس اس ایک واقعہ سے کرو کہ جب کوئی خطاوار آپؐ کے سامنے آ کر عفو کا طالب ہوتا تو خود آپ کی گردنِ مبارک شرم سے جھک جاتی۔ اس قسم کی حساس طبیعت کو ذرا سی بے مہری، خفیف سی کج ادائی بھی انتہائی درد و کرب میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہم زیادہ واضح طور پر اس بات کا اندازہ کر سکینگے کہ اشاعتِ دینِ حنیف کے لئے جو کشمکش آپ کو کرنی پڑی، وہ کس قدر جانگسل تھی اور آپؐ نے اس تمام ہنگامہ

ہیں ماتھے پر بل لائے بغیر تسلیم و رضا کی جو شان دکھائی، وہ فی الحقیقت انہیں الفاظِ ربانی کی مستحق تھی:

قل ان صلاتی ونسکی و محیای	(اے پیغمبر) لوگوں سے کہدے کہ بیشک میری نماز اور میری عبادت
ومماتی للہ رب العالمین	اور میری زیست اور میری موت سب رب العلمین ہی کی راہ میں ہیں
لا شریک لہ وبذلک امرت	جس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسکا حکم دیا گیا ہے اور میں اسکے
وانا اول المسلمین ہ	فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار ہوں ٭

آپ اپنی قوم کو قعرِ ذلت سے نکالنا چاہتے تھے اور آپؐ کی قوم نے اس دلسوزی کا صلہ یہ دیا کہ آپؐ کو گالیاں دیں، راستے میں کانٹے بچھائے جسم مبارک پر نجاستیں ڈالیں۔ اس کے جواب میں آپؐ صرف اس قدر فرمادیا کرتے تھے کہ "فرزندانِ عبد مناف! حقِ ہمسائیگی خوب ادا کرتے ہو"۔

اپنے اقربا سے ہر شخص کو کم و بیش محبت ہوتی ہے، پھر رسول اللہ جیسے دردمند انسان کو جس کی آنکھیں بسا اوقات اغیار کی مُصیبت کا حال سُن کر اشکبار ہو جاتی تھیں، اپنے اعزہ سے کیسی کچھ اُلفت نہ ہوگی اور اس نازک موقع پر عزیزوں کی بے وفائی آپؐ کے رحیم و شفیق دل کے لئے کیسی صبر آزما ثابت ہوتی ہوگی۔ تلوار کے زخم میں درد بہرحال ہوتا ہے لیکن جب زخم پہنچانے کے لئے کسی دوست کا ہاتھ اُٹھا ہو تو درد کی ہر ٹیس میں وہ کیفیت ہوتی ہے کہ انسان بعض دفعہ موت کو اس پر ترجیح دیتا ہے ابولہب آپؐ کا چچا تھا ــــ وہی چچا جس نے آپؐ کی ولادت پر اپنی لونڈی ثوبیہ کو بطور اظہارِ خوشی آزاد کر دیا تھا ــــ مگر آج آپؐ کو اس دردناک حقیقت سے سامنا تھا کہ آپؐ کا چچا آپؐ کا بدترین دشمن ہو رہا تھا اور چچی کا یہ حال تھا کہ جنگل سے کانٹے سمیٹ کر لاتی اور جن راہوں سے بھتیجا گزرتا وہاں بکھیر دیتی، کہ منزلِ حق کے اس رہ نورد کے لئے یہی فرش موزوں تھا۔ یہ آبلہ پا جس کی نگاہیں برابر اپنے منتہائے مقصود پر جمی ہوئی تھیں، شکوہ و شکایت کے بغیر، اپنے پاؤں سے بھی کانٹے نکالتا اور رستے میں سے بھی دور کر دیتا تھا تاکہ دوسرے راہ گیروں کو تکلیف نہ ہو ٭

اعدائے دین نے آپؐ کو "محمدؐ" کی بجائے "مذمّم" کہا (نعوذ باللہ) تو آپؐ نے اس پر عجیب نکتہ آموز تنقید فرمائی کہ "اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو کیونکر مجھ سے پھیرتا ہے! وہ مذمّم کو گالیاں دیتے اور مذمّم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمد ہوں[1] ٭

---

[1] "سیرت" شبلی۔

جس شخص کا ایمان اُسے عرشِ استقامت کے اس بلند کنگرہ پر پہنچا چکا ہو، اُسے زر، زن اور زور کی تحریصات کیا لبھا سکتی تھیں لیکن قریش اپنے زعم میں کچھ اَور ہی سمجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے عنقا کے لئے بھی وہی دام بچھایا جس میں کرگس اور زاغ و زغن اسیر ہوتے ہیں عجیب مؤثر نظارہ تھا جب قریش کا معزز سفیر عتبہ ابن ربیعہ شہنشاہ کونینؐ کو جس کے قدموں پر سارے جہان کی دولتیں نثار تھیں، ایک حقیر رشوت سے رام کرنیکی کوشش کر رہا تھا۔ آپؐ اس کی پوری شرائط کو خاموشی سے سُنتے رہے کیونکہ آپؐ کبھی کسی کی بات قطع نہ کرتے تھے۔ پھر اُس سے پوچھا "یا ابا الولید! تیرا کلام تمام ہُوا؟" اس نے کہا "ہاں یا محمدؐ" آپ نے فرمایا اب میری سُن بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ۝ حٰمٓ۔ تنزیل من الرّحمٰن الرّحیم ۝ کتاب فصّلت آیاتہٗ قرآنا عربیا لقوم یعلمون ۝ بشیرا و نذیرا فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون ۝ الخ عتبہ کی زبان پر مہرِ سکوت لگ گئی، عالمِ محویت میں کلام پاک کو سنتا رہا اور پھر چپ چاپ اُٹھ کر چلا گیا۔ مجبور ہو کر آخر قریش نے ابوطالب سے شکایت کی ابوطالب سے قدرۃً آپؐ کو بہت محبت تھی اور آپؐ کے زمانۂ طفولیّت میں جب ابوطالب نے شام کا قصد کیا تھا تو چچا کی جدائی کے خیال سے آپ کا دل بھر آیا تھا اور آپؐ نے ان سے لپٹ کر ساتھ چلنے کی درخواست کی تھی۔ چچا کی جدائی کا خیال آج بھی آپ کی آنکھوں کو نمناک کرنے کے لئے موجود تھا۔ مگر اس خیال کے ساتھ ایک اور چیز بھی تھی جس نے آپ سے وہ الفاظ کہلوائے جو دنیا کی تاریخِ استقامت و استقلال کا خلاصہ ہیں: "اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لاکر رکھدیں، اور چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں، تب بھی خدا گواہ ہے کہ میں اسے نہ چھوڑوں گا، تاآنکہ اللہ اس کو پُورا نہ کردے یا میں اس کوشش میں فنا نہ ہو جاؤں"۔

مستہزئین کی ایک پوری جماعت آپؐ کے ساتھ لگی پھرتی تھی جو آپؐ پر مجنون، شاعر، ساحر، عیّار کے آوازے کستی اور طرح طرح کی دل آزار پھبتیاں کہتی تھی۔ جو شخصؐ کسی کی بات قطع کرنا بھی خلافِ اخلاق سمجھتا تھا، اُس کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا تھا کہ وہی لوگ جن کی بھلائی کی خاطر وہ نصیحت کرتا تھا اُسؐ کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے لئے شور مچاتے اور اُسے گالیاں دیتے تھے۔ ان بیباکیوں نے بڑھتے بڑھتے آخر نہایت مذموم اور قبیح صورت اختیار کی۔ ایک روز جب آپؐ کعبہ میں مصروفِ نماز تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آکر گردن مبارک میں ایک کپڑا ڈال دیا، اور بڑی سختی سے حضور کا گلا گھونٹنا شروع کیا، لیکن آپؐ بارگاہ ربّ العلیٰ میں بدستور اطمینان کے ساتھ سجدہ ریز رہے اور سکونِ خاطر برہم

نہ ہوسکا۔ اتفاقاً صدیق اکبرؓ اُدھر آنکلے، اُنہوں نے عقبہ کو دھکیل کر ہٹا دیا اور کفار کے مجمع سے قرآن مجید کے ان الفاظ میں خطاب کیا[۱]:۔

اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ وقد جاءکم بالبینات ۔ "کیا تم ایک (حق پرست) انسان کو محض اس لئے قتل کرتے ہو کہ وہ خدا کو اپنا پروردگار کہتا ہے اور تمہارے پاس اپنی دلائل بیّنہ لایا ہے؟"

یہ تو جسمانی تکالیف کی کیفیت تھی مگر آپؐ کو ہر قسم کی روحانی اذیت پہنچانے میں بھی کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا گیا تھا۔ آنحضرت پر کئی خانگی صدمات گزرے تھے، آپؐ کے صاحبزادے طفولیت ہی میں انتقال کر گئے لیکن آپؐ کا شیوۂ تسلیم زبان پر حرفِ شکایت نہ لایا تھا۔ قریش کی بے راہ روقساوت، انسانی جذبات کے آبگینہ کو اس نازک مقام پر ٹھیس پہنچانے سے بھی باز نہ رہتی تھی۔ وہ اِن حوادث پر آپؐ کا ٹھٹھا اُڑاتے اور آپؐ کو ابتر (مقطوع النسل) ہونے کا طعنہ دیتے تھے مگر خدا نے اپنے وفاشعار بندے کے دل کو انا اعطینک الکوثر اور ان شانئک ہو الابتر کی الہامی تسلّی دے کر رضا و توکل سے لبریز کر دیا، گھر کے دروازہ پر عفونتیں پھینک دی جاتی تھیں تاکہ جمعیتِ خاطر میں خلل ہو، مگر ظلم کرنے والے مظلومؐ سے زیادہ طاقتور نہ تھے، جس کا حلم و تحمل اس تمام سامان عذاب و عقوبت کو شکست دینے پر قادر تھا:۔

لیس الشدید بالصرعۃ انما الشدید من یملک نفسہ عند الغضب (صحیحین از مشکوٰۃ ص۳۶۹) ۔ پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے۔ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قدرت رکھتا ہو،

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپؐ پر خاک ڈال دی۔ آپؐ اسی حال میں گھر تشریف لائے۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ آپؐ کی ایک صاحبزادیؓ نے مٹی پونچھ دی اور آپؐ کا سر دھلایا۔ لڑکیوں کا دل یوں بھی نرم ہوتا ہے۔ آپؐ کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں۔ آنحضرت دشمنوں کی درازدستیاں پیغمبرانہ صبر و سکون سے برداشت کر سکتے تھے لیکن آپؐ جیسے شفیق باپ کے لئے بیٹی کی یہ قلبی تکلیف یقیناً بہت زیادہ باعثِ کرب تھی۔ پھر بھی آپ نے فرمایا کہ "بیٹی، مت رو، بیشک اللہ تیرے باپ کا محافظ ہے"۔

"شعب ابی طالب" کے تین سال بھی اسی حیثیت سے آپؐ کے انتہائی صبر و ثبات کا امتحان تھے، آفات و مصائب کا اپنے سر پر لینا آنحضرت کیلئے آسان تھا لیکن اس میں دوسروں کی شرکت کا منظر آپکے لئے بلاشبہ نہایت عقوبت انگیز ہوگا گھاٹی کے پاس سے جو لوگ گزرتے تھے انہیں بنی ہاشم کے فاقہ کش بچّوں کے رونے کی آواز صاف سُنائی دیتی تھی[۲]۔ ان

---

[۱] صحیح بخاری عن ابن عمرو بن العاص، [۲] زاد المعاد، ج۔۱، ص۲۹۹

جگر خراش صداؤں سے حضور کے قلبِ مجروح کی جو کیفیت ہوتی ہوگی، اُس کو وہی مالک الملک جانتا ہے جس نے انسان کا دل بنایا اور اس میں درد کی تڑپ پیدا کی ۔

ہدایت کے اسرار سمجھنے میں قریش بیشک سُست تھے لیکن رموزِ ضلالت کے فہم و ادراک کے لئے اُنکے ذہن کی مناسبت دُنیا کی تاریخ ستمگاری میں عدیم المثال ہے ۔ خود آنحضرت کی ذات اقدس پر جفائیں توڑنے میں بھی انہیں خاص لذت ملتی تھی لیکن وہ اُس حقیقت کو خوب سمجھے ہوئے تھے کہ آنحضرت جیسے رحیم المزاج اور رقیق القلب انسان کے دل کو سب سے گہرا چرکا اُس وقت لگیگا، جب آپ کے متبعین مخلصین تختۂ مشقِ ستم بنائے جائینگے ۔ چنانچہ صرف ایک مسلمان گھرانے کی داستانِ مظلومی ہمارے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی ہے اور یاسر عمار اور سمیہ (ان کی ارواح پاک پر ہزار ہزار رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں)، ایسے نام ہیں جنہیں لکھتے وقت قلم ہاتھوں میں لرزتا ہے مگر ان لوگوں کی نظریں اپنے ہادی کے نقشِ قدم پر جمی ہوئی تھیں اور یہ اُن صابرین میں سے تھے جن پر کوئی مُصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے ۔

یہ آنحضرتؐ ہی کے فیضِ صحبت کا اثر تھا کہ غزوۂ اُحد کے بعد جب خبیب بن عدی اور زید بن ثنہ رضی اللہ عنہما کو قریش نے فریب سے گرفتار کر لیا اور چند روز تک بھوک پیاس کے عذاب میں مبتلا رکھا تو اُن کا پائے ثبات ایک کوہِ وقار کی طرح غیر متزلزل رہا لیکن ان بزرگوں کے لئے دار و رسن کی ایک سخت تر آزمائش ابھی باقی تھی ۔ اُن کے خون کے اُبلتے ہوئے فواروں، اُن کی پتھرائی ہوئی آنکھوں اُنکی اُکھڑی ہوئی سانس نے ابھی زبان حال سے "ہو اللہ احد" کے نعرے بلند نہ کئے تھے ۔ آخر وہ دن بھی آیا کہ اُنہیں صلیب کے سامنے کھڑا ہونا پڑا لیکن آج بھی اس پنج روز فانی کی نافرجام قوتیں، اپنی تمام ترغیبات و ترہیبات کے ساتھ اُن کی آنکھوں کو ہیچ نظر آئیں :-

منصور وار گر ببرندت بہ پائے دار
مردانہ پائے دار، جہاں پائدار نیست !

انہیں اختیار دیا گیا کہ کفر اور موت میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں مگر اب بھی ان کے مقدس رہ نما کا اُسوۂ حسنہ دستِ غیب کی طرح اُسی منزل کی طرف اشارہ کر رہا تھا، جہاں پہنچنے کے لئے موت کی ہیبت افزا سرحد سے گزرنا اُنکے واسطے ضروری ہو گیا تھا ۔

فاقض ما انت قاضٍ انما تقضی هٰذہٖ الحیٰوۃ الدنیا انا آمنا بربنا لیغفرلنا خطایانا ۵ؐ

(تو جو کچھ کرنے والا ہے، کر گزر! تو دنیا کی اسی زندگی پر حکم چلا سکتا ہے (کہ ہمکو عذاب دے یا بہت کرے تو جان سے مار ڈالے) اور بس ہم اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کرے ۰

ظالموں نے انہیں سولی پر لٹکا دیا اور نیزہ برداروں سے کہا کہ نیزوں سے اُنکے جسم کے ایک ایک حصہ کو چھید ڈالیں، ایک ایک عضو پر کچوکے لگائیں[۱] لیکن اسلام کے یہ بطلِ جلیل جوشِ فدویت حق کی اُن بالائے فلک بلندیوں پر فائز ہو چکے تھے کہ اگر کفر کے نیزوں کی انی اُنکے دل و جگر اور رگ و پوست کو چیر کر مغزِ استخواں تک بھی پہنچ جاتی، تو اُن کی لذتِ آزار پروانہ وار "العطش! العطش!" پکارتی ہوئی پائی جاتی

تنم بسوخت، دلم سوخت، استخوانم سوخت تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقی ست!

قریش کے اباء و استکبار کا منظر ابھی آنکھوں کے سامنے تھا کہ حکیم مطلق کے دستِ نے تلخابۂ اجل کے تلخ تریں قطرے پیغمبرؐ کے جامِ ابتلاء و شکیب میں ملا دیئے۔ ابو طالب اور خدیجۃ الکبریٰ نے تین دن کے فرق کے ساتھ، حضورؐ سے مفارقتِ جاودانی اختیار کی، مگر اس سے کیا ہوتا تھا۔ جب آپکی عزیمت اور استقامت اُسی پیغمبرانہ شان سے آپکے ساتھ تھی۔ اس خیال سے کہ شاید مکّہ سے باہر تبلیغ ہدایت میں زیادہ کامیابی ہو، آپؐ خدا کا آخری پیغام لے کر طائف پہنچے مگر اس حق ناشناس بستی نے پتھر برسا کر اپنے مقدس مہمانؐ کو اس قدر مجروح کر دیا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا[۲] لیکن ان صبر فرسا مصائب کے باوجود اِس پیکرِ وفا کی زبان سے اگر کچھ نکلا تو یہ لفظ تھے:-

ان لم یکن علی غضب فلا اُبالی ولکن عافیتک ھی اوسع لی اعوذ بنور وجھک الذی اشرقت لہ الظلمٰت ۵ؐ

(الٰہی! اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو میں بیفکر ہوں۔ کیونکہ تیرا دامانِ رحمت میرے لئے زیادہ وسیع ہے میں تیری ذات کے نور میں پناہ لیتا ہوں جس سے تمام تاریکیاں منور ہو جاتی ہیں ۰

شانِ نبوت کی یہ فتح الفتوح، یہ عظیم الشان کامرانی قریش کی ظاہر بیں آنکھوں کو بجز ناکامی کے اور کسی رنگ میں نظر نہ آسکتی تھی۔ اُن کی ستم رانی کے حوصلے اور بڑھ گئے اور انہوں نے قطعی اور آخری طور

---

[۱] بخاری عن عبداللہ بن عیاض۔ [۲] تاریخ ابن الاثیر جلد ۲، صفحہ

پر اسلام کی بیخکنی کا فیصلہ کر لیا۔ آخر صورتِ حالات کو دیکھ کر آنحضرتؐ نے مومنین کی مختصر جماعت کو مدینہ کی طرف ہجرت کر جانیکا حکم دیا۔ واقعۂ ہجرت میں جو عظیم الشان درسِ حیات اور قابلِ تقلید اُسوۂ تبلیغ ہدایت پنہاں تھا اُس کی حقیقت تک مغربی مؤرخین اپنے قصورِ فہم کی وجہ سے نہیں پہنچ سکے، چنانچہ انگریزی میں جنابِ خیر الانامؐ کی اس سنت کے لئے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ "فرار" کا ہم معنی ہے۔ فرار کی تحریک خوف و ہراس کے جذبہ سے ہوتی ہے لیکن آنحضرت کی حیاتِ طیّبہ پر ایک سرسری سی نظر ڈال لینے کے بعد اس قسم کے خوف و ہراس کو آپؐ کی ذاتِ گرامی سے منسوب کرنا عقلاً محال ہو جاتا ہے۔ عقبہ بن ابی معیط کی گلو فشار گرفت آپؐ کے سکونِ خاطر کو اس حد تک بھی برہم نہ کر سکی تھی کہ آپ کی جبین سجود میں اضطراب کی ایک شکن پڑتی۔ غارِ ثور میں جب خون کے پیاسے دشمن سر پر آہی پہنچے تھے، آپؐ کی استقامت نے آپ کے یارِ غار کو "لاتحزن ان اللہ معنا" کا پیغام دیا تھا۔ دعثور بن الحارث کی تلوار جب آپکی شہ رگ کے قریب آ پہنچی تھی تو آپکی شانِ عبد اللّہی نے خدا کو اپنی شہ رگ سے قریب تر پایا تھا۔ بدر اور حنین اور اُحد کی زہرہ گداز ساعتوں میں اعدا کے طاقتور ہاتھ آپکے رشتۂ توکّل کو قطع نہ کر سکے تھے کیونکہ اس حبل المتین کا دوسرا سرا خود قادرِ مطلق نے تھام رکھا تھا۔ پھر ایسے "اشجع الناس"[1] ایسے مجسّمۂ صبر و ثبات نے اس موقع پر اپنی ساعئی حقہ کا میدان بدل کر دنیا کو جو غیر فانی سبق دیا، اُسکی حقیقت سمجھنے کے لئے یورپ کی عناد کیش منطق ہی اس نتیجہ پر پہنچ سکتی ہے کہ آنحضرت معاذ اللہ اپنی جان کے خوف سے مدینہ کو بھاگ نکلے۔ دار الندوہ میں آنحضرت کے قتل کی سازش ضرور کی گئی تھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ مکّہ کو خیرباد کہہ کر آپؐ نے اپنی جان بچالی مگر اس سنّتِ نبوی کی حقیقت صرف اسی قدر نہیں۔ اس مسئلہ کی نسبت ابھی بہت کچھ اور بھی کہنے کی گنجایش ہے ؏

وہ کیا محبوب مقصد تھا جسکی خاطر آپ تیرہ برس تک تمام مکّہ بلکہ تمام عرب کے مقابلہ میں سینہ سپر رہے؟ یہ مقصدِ عزیز اس ارشادِ ایزدی کی تعمیل کے سوا کچھ نہ تھا:۔

وامانرینّك بعض الذی نعدھم ان (کافروں) سے جو وعدے ہم نے کئے ہیں اُن میں سے بعض کے
اونتوفینّك فانما علیك البلٰغ و پورا ہونیکا منظر خواہ ہم تمہیں دکھادیں اور خواہ وفات دے دیں تمہارا
علینا الحساب ٥ کام (ہمارے پیغام کا) پہنچا دینا اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔

وعلینا الحساب! ہاں، یہ ابدی حقیقت اپنی پوری الہامی تجلّیوں کے ساتھ شب و روز پیغمبرؐ کے

---

[1] خادمِ بارگاہِ نبوی حضرت انسؓ نے آنحضرت کی شجاعت کے بیان میں حضورؐ کو یہ لقب دیا تھا۔

سامنے تھی۔ اُس آخری حج کے موقع پر جب حضور اپنی امت کے مختلف اطراف واکناف سے آئے ہوئے افراد سے رخصت ہوئے، آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ "ایک دن تم سے میرے متعلق بھی پوچھا جائیگا، اُس وقت تم کیا جواب دوگے؟" اور جب ہزارہا مومنینِ مخلصین کی غلغلہ انداز صداؤں نے تبلیغِ نبوی کی ہدایت آموز کامیابی کا اعلان کیا تو آپؐ نے تین بار آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھائی، تین بار لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور تین بار "اللّٰھم اشھد" کا کلمۂ طیبہ زبان سے ادا فرمایا[1]۔ جب حیاتِ عنصری کا پیمانہ لبریز ہوچکا اور رفیقِ اعلیٰ سے جا ملنے کی ساعت قریب آگئی، اُس وقت بھی "فانما علیک البلٰغ" کی نصِ صریح سرورِ کائنات کی نظروں کے سامنے تھی اور آپؐ کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے: "میں تبلیغ کا حق ادا کرچکا، اے خدا تو اس کا گواہ رہ[2]۔" "یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم" کی صداقتِ عظمیٰ قدم قدم پر آپکی آنکھوں کے سامنے چمکتی تھی اور منزلِ حیات میں آپؐ کا اُٹھنا بیٹھنا ٹھیرنا چلنا سب اسی غایت کے حصول کے لئے تھا۔ کامل تیرہ برس تک خونخوار دشمنوں کی مسلسل درازدستیوں، بے محابا گستاخیوں کو آپ نے ایک فوق الکرامت استقامت سے شکست دی، اور عدوان وطغیان کی اس مسموم فضا میں آپؐ کی ایک ایک سانس آپؐ کے خوں چکاں دل سے "واصبر علیٰ ما اصابک ان ذالک من عزم الامور" کا معجز نما جواب لاتی رہی، لیکن جب قریش نے ہدایت کی تمام راہیں اپنے لئے بند کرلیں "ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ" کی عملی اور واقعی تصویر بن گئے، چنانچہ قبیلہ دَوس کے سردار طفیل بن عمرو نے کانوں کو روئی سے بند کرکے کہ کہیں کوئی کلمۂ ایمان اس راہ سے دل تک نہ جا پہنچے، کفّار کی ذہنی کیفیت کا نقشہ کھینچ دیا، خود ابوجہل نے جناب رسالتمآبؐ سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے تیری راست بیانی میں شبہ نہیں لیکن جو پیغام تو لایا ہے میں اُسے نہیں مانتا[3]:۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ‎ ‎ ‎ ‎ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

پھر یہی نہیں بلکہ آخری چارۂ کار کے طور پر یہ لوگ حضور کے قتل کے درپے ہوئے تو اُس وقت محض اس خیال سے کہ مبادا وہ مقدس فرض بھی اس حیاتِ مستعار کے خاتمہ کے ساتھ ناتمام رہ جائے جس کی تکمیل کارفرمائے ازل نے مجھ سے وابستہ کردی ہے، آپؐ نے اپنے مولد ومنشا، اپنے اجداد

---

[1] صحیح مسلم وابوداؤد۔ [2] موطاء امام مالکؒ۔ [3] شفاء عیاض۔

کے قدیم شہر سے جدائی اختیار کی کیونکہ آپؐ کی آنکھیں اس مستحکم اور پائدار حقیقت کو دیکھ رہی تھیں: انّ اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اہل ایمان جو جنت کی آرزو رکھتے ہیں۔ اس بات کے مجاز نہیں کہ خوشنودیٔ خدا کے سوا کسی اور مقصد کے حصول کے لئے اپنی جان یا مال کو معرض خطر میں مبتلا کریں۔ کیونکہ ان کی جان و مال کا مالک اللہ اور صرف اللہ ہے۔ ہجرت کرکے آپ نے محمدؐ ابن عبداللہ نہیں بلکہ محمد رسُول اللہ کی جان بچائی تھی (علیہ الف الف تحیّات) اور اس پیغمبرانہ عمل سے آپ نے دنیا کو بتا دیا کہ صادقین کی زندگی "فتمنّوا الموت" کے امر اور "لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" کی نہی کا مجموعہ ہے۔ قریش نے قبولِ رُشد و ہدایت سے قطعی انکار کر دیا تھا، اس صورت میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عمرِ عزیز کی گزرتی ہوئی ساعتوں کو بے کار رکھنا اور بار بار نیشِ عقرب کا مزہ چکھنا بداہتہً خلافِ مصلحت تھا، چنانچہ اُسی خیال نے جو آپؐ کو طائف لے گیا تھا، اب آپؐ کو مدینہ پہنچا دیا اور دنیا نے بالآخر دیکھ لیا کہ حضوؐر کی یہ مقدّس سنت کس قدر عظیم برکات وحسنات کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ آنحضرتؐ کو محض اسلام کے مقاصد عالیہ کی تکمیل منظور تھی۔ یوروپ کے اُس نوخیز تمدن کی ناشناس تحسین آپؐ کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی۔ جس کے رنگا رنگ معیار ہائے اخلاق ہمیشہ دنیا کے حوادث و تغیرات کی موجِ فنا پر رقص کرتے رہے ہیں اور کرتے رہینگے ۔

(باقی) حمید احمد خاں

کلامِ گرامی

رباعی

از جسم پرید روحِ ما بر افلاک — خاکِ ناپاکِ ما فرو رفت بخاک
اے روح ازیں آمد و شد مطلب چیست — غمدیدہ در آمدی و رفتی غمناک

گرامی

غزل

نگاہ کار تغافل کند چہ بو العجبی ست — جوابِ گریۂ ما خندہ ہائے زیر لبی ست
کتابِ عقل ورق در ورق فرو خواندیم — تمام حیلہ فروشی و مدعا طلبی ست
ز حرفِ لا کہ ترا بر زباں رود بشکست — دلِ منست بہ پہلو کہ شیشۂ حلبی ست
دلیلِ عفوِ گنہ ہم سبب نمی خواہد — عنایتِ ازلی پردہ دارِ بے سببی ست
بچشمِ ما درِ احمدؐ دریچۂ احد ست — زبانِ ما عجمی و نگاہِ ما عربی ست
نہ جبرئیل نہ حسانم و نہ جوہر فرد — مدیحِ خواجہ بخوانم کمالِ بے ادبی ست
سحر رسید بگوشم ندا ز حضرتِ قدس — کہ صدرِ بزمِ نبوت یتیمِ مطلبی ست
دماغِ حضرتِ اقبال نکتۂ آورد — چہ نکتہ ایست کہ در وے ہزار بو العجبی ست
متاعِ قافلۂ ما حجازیان بردند — ولے زبان نکشائی کہ یارِ ما عربی ست”
بہ نیم خندہ گرامی شبم بروز آورد — کرشمۂ اثرِ نالہ ہائے نیم شبی ست

گرامی

اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر

اسلام کے عقلی اثرات یورپ پر

عربوں کی ترقی علوم وفنون میں۔ عربوں نے علوم وفنون کو جس بے تعصبی اور فراخ حوصلگی اور ہمت سے ترقی دی اور جس طرح انہوں نے اپنی عمریں اُنکی تحصیل وتکمیل میں گذار دیں دُنیا میں اُس کی بہت تھوڑی مثالیں ہیں +

انہوں نے غیر مُلکوں کو فتح کرتے ہی جو جو علوم وفنون وہاں پائے انہیں فوراً سیکھنا شروع کیا اور پھر وہاں کے شہروں کو دُنیا بھر کی تعلیم وتربیت کا مرکز بنا دیا + یونان و روما کے علوم وفنون کچھ ایران و شام میں پھیلے ہوئے تھے اور کچھ انہیں ملکوں میں مدفون تھے۔ جہاں جہاں اُن کا ہاتھ پہنچا انہوں نے قدما کی تصنیفات کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عربی میں ترجمہ کیا + یونانی لاطینی سریانی کلدانی شامی سنسکرت قدیم فارسی وغیرہ میں جو جو کتابیں انہیں قابلِ غور نظر آئیں انہیں لے لیا + لیکن وہ بہت دنوں شاگردی نہ کرتے رہے۔ جلد ہی وہ اپنی جدت پسندی اور جدتِ خیالی کے بل پر اپنے قدیم اُستادوں سے سبقت لے گئے + جس فن کو انہوں نے سیکھا اور جس علم کو انہوں نے حاصل کیا اُسے نئے نئے اکتشافات اور اضافوں اور ترمیموں کے ذریعہ سے بے حد ترقی دی +

تراجم۔ ماموں الرشید نے قسطنطنیہ کے شاہنشاہ Theophilus تھیوفائلس کو درخواست کے پیرائے میں لکھا کہ وہ ازراہِ نوازش تمام مستند اور مفید یونانی کتابوں کو اُسکے پاس بھجوا دے تاکہ وہ تراجم کے ذریعہ سے اُنکی دُنیا بھر میں اشاعت کر سکے۔ شاہنشاہ نے خلیفہ کو اسکے جواب میں ایک نہایت گستاخانہ خط تحریر کیا جو مسیحیت کے علمی ذوق اور راست پسندی کا گویا ایک بیّن ثبوت ہے +

علم پسندی۔ ماموں کی علم دوستی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ اُس نے معقولیات کے مطالعہ کو ایسا فروغ دیا کہ علم کے معاملہ میں مذہب کے تعصب کو بالکل بے دخل کر دیا + بغداد میں منگل کے روز علمی مجالس ہُوا کرتیں اور علماء سے یہ درخواست کی جاتی کہ وہ حتی المقدور مذہبی

معاملات کو بحث میں دخل دے کر استدلال نہ کریں ۔ موسیو لی بان کہتے ہیں کہ ہزار برس کی شدید لڑائیوں اور دنیاوی عدالتوں اور بے رحم خونریزیوں کے بعد یورپ نے اس وقت بھی یہ اعلیٰ درجہ رواداری کا حاصل نہیں کیا ہے ۔

کتابوں کے جمع کرنے اور علوم کو ترقی دینے کا انہیں اس قدر خیال تھا کہ جب کوئی امیر خود مختار ہو جاتا تو وہ فوراً اپنے کتب خانے عوام کے لئے کھول دیتا اور عالموں اور حکیموں کی محفلیں جما کر اپنے رقیبوں اور ہمعصروں کے مقابل میں رعایا سے داد چاہتا ۔ گبن کہتا ہے ایک وزیر کی نسبت مذکور ہے کہ اُس نے دو لاکھ دینار ایک کالج کے قیام کے لئے دیئے اور بعد میں اُس کے قیام و انتظام کے واسطے وہ پندرہ ہزار دینار سالانہ دیتا رہا ۔ اس درسگاہ میں چھ ہزار طالب علم تعلیم پاتے تھے ۔

کتب خانے ۔ اندلس میں ستّر عام کتب خانے تھے ۔ الحاکم ثانی کے کتب خانے میں چھ لاکھ جلدیں تھیں اور اُنکی فہرست ہی چوالیس جلدوں میں تھی ۔ چار سو برس بعد جب چارلز عاقل نے فرانس کے شاہی کتب خانے کی بنیاد ڈالی تو وہ نو سو جلدوں سے زیادہ جمع نہ کر سکا ۔ قاہرہ کے کتبخانے میں ایک لاکھ قلمی نسخے تھے جن کی جلدیں نہایت دیدہ ریزی اور کمال عرق فشانی سے تیار کی گئی تھیں ۔ طلباء کو قاہرہ میں عاریتاً کتابیں لینے کی عام اجازت تھی ۔ یورپ کی اُس وقت کی علم پسندی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ زمی نیتر رئیس الاساقفہ نے غرناطہ کی اسّی ہزار کتابوں کو شہر کے چوک میں ایک جاہل تر گروہ کے سامنے جلوا دیا اور اہلِ یورپ نے اُسے سراہا کہ اُس نے کُفر کی بیخکنی کرنے میں مسیحیت پر بڑا بھاری احسان کیا ہے ۔ اُس زمانے میں یورپ میں کُفر کا فتویٰ لگانا کچھ اس طرح مروج تھا جیسے خود ہمارے زمانے میں کٹ ملاّؤں نے علما اور مصلحین قوم پر فتویٰ دینا اپنا دینی شغل سمجھ رکھا ہے ۔ ایسی ہی اور کئی تمثیلوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ آج کل ہم لوگ اُسی حالت میں ہیں جس میں یورپ قرونِ وسطیٰ میں تھا ۔

عربوں کے دار العلوم اُس زمانۂ جہالت میں تہذیب و تمدن کے جگمگاتے شبستان تھے جن کے دریچوں سے نورِ علم کی کرنیں چھن چھن کر ظلمت کدۂ مغرب کو اپنی روشنی سے معمور کرتی تھیں ۔ اُنکے علمی نظامات آجکل بھی ہمارے لئے ایک ایسا معیار ترقی قائم کرتے ہیں جس کو دور اندیشی کی آنکھوں سے دیکھنا صد درجہ سبق آموز ہے ۔

عربی دارالعلوم۔ سپین میں اُن دنوں ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ اُدھر یورپ میں صرف پادری اور راہب ہی اپنی ابجد خوانی پرنازاں تھے۔ امیر سے امیر شخصوں نے بھی جہالت کی دیبی کے ساتھ وفا کا عہد باندھا تھا اور جو علم دوست لوگ علوم و فنون قدیمہ میں عالم شد و بود ہونا چاہتے وہ بلاتکلف ہسپانیہ کے دارالعلوموں میں آتے اور تحصیلِ علوم کرتے۔ قرطبہ کا دارالعلوم قاہرہ کے ازہریہ اور بغداد کے نظامیہ دارالعلوموں سے کچھ کم نہ تھا۔ ہر شعبۂ تعلیم کا ایک سرکردہ تھا۔ جو معاصر علاموں میں سے انتخاب کیا جاتا تھا۔ مذہب کی کوئی شرط یا قید نہ تھی۔ یہودی اور عیسائی علامہ اکثر مقرر کئے جاتے تھے۔ وقتاً فوقتاً انکے جلسے ہُوا کرتے تھے اور سالانہ اجلاس میں خاص و عام کو مدعو کیا جاتا تھا اور اچھی اچھی نظمیں اور عمدہ عمدہ خطبے پڑھے جاتے تھے۔ درسگاہوں کے دروازوں پر یہ حروف کندہ تھے "دُنیا چار چیزوں سے قائم ہے: ۔حکیموں کا علم، بادشاہوں کا عدل، پاکبازوں کی عبادت اور بہادروں کی شجاعت"

عربوں کا قاعدہ تھا کہ جس شہر کو فتح کرتے اُن کا پہلا کام وہاں مسجد اور مدرسہ قائم کرنا ہوتا۔ چھوٹے سے چھوٹے شہروں میں سکول اور کالج تھے اور ہر بڑے شہر میں ایک دارالعلوم۔ قاہرہ[1] کے دارالعلوم میں بہت سے Scientific Institutes دارالحکمۃ تھے جہاں پڑھنے لکھنے کی عام اجازت تھی اور سامانِ تحریر بھی مفت دیا جاتا تھا۔

وہاں کے مباحثوں میں خلیفہ بھی موجود ہوتا تھا اور ہر شعبۂ تعلیم کے مدرس اپنے اپنے شعبے کی خلعتیں پہنے ہوئے بحث میں شریک ہوتے۔ سٹین لے لین پول کہتا ہے کہ انگریزی دارالعلوموں کے جُبّے اور قبائیں Robes and Gowns انہیں عربی دارالعلوموں سے لئے گئے۔

قاہرہ کے مرکزی دارالحکمۃ میں دینیات کا ایک شعبہ بھی تھا جہاں کی مجالسِ حکمت میں داعی الدعوات Grand Prior of The Lodge طلباء کو اسمٰعیلی مسلوں کی مالہٗ وما علیہ سے آگاہ کرکے مختلف مدارج کے رتبے عطا کرتا تھا۔ سید امیر علی کہتے ہیں کہ مسیحیت کی ساری مسیعنی انجمنیں Masonic Lodges اسی دارالحکمۃ کے نمونے پر بنائی گئیں۔

شمالی افریقہ کے باقی ماندہ بڑے شہروں میں بھی کتب خانے تھے جن میں یونانی اور

---

[1] ڈریپر صفحہ ۳۶۔ جلد ۲۔

اطالوی مصنفوں کی کتابوں کے تراجم کثرت سے تھے۔ فاس (Fez) کے بڑے کتب خانے میں لوی Livy کی ساری تصنیفات عربی میں موجود تھیں!

عرب اور یونانی علم ادب۔ "مؤرخوں کی تاریخ دُنیا" میں لکھا ہے کہ عرب اس بات میں رومیوں سے کہیں سبقت لے گئے کہ انہوں نے یونانیوں کی تصنیفات کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اُن کے علوم میں بہت نمایاں ترقی کی اور بہت سی باتوں میں اُن سے بہت آگے نکل گئے۔ انہوں نے محض بڑے بڑے مصنفوں (جالینوس ارسطو۔ افلاطون۔ بطلیموس اقلیدس وغیرہ) ہی کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ کوئی نحوی یا مقرر یا فلسفہ دان خواہ وہ کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو ایسا نہ تھا جس کی تصنیفات کا انہوں نے اپنی زبان میں ترجمہ نہ کیا ہو۔

قرونِ وسطیٰ میں یورپ میں حکما کے دو گروہ تھے ایک Nominalists ظاہر بیں اور دوسرے حقیقت بیں Realist ظاہر بیں ابن سینا کے مداح تھے۔ اور حقیقت بیں ابنِ رشد کے متبعین تھے۔ اُنکی طول طویل بحثوں نے یورپ میں چند حکماء ضرور پیدا کئے اور گویا یہ انہیں علمی بحثوں کا نتیجہ تھا کہ جون ہس John Huss سیونیرولہ Savonarola اور لُوتھر Luther سے مصلحین کا ظہور ہوا۔

موسیو سدی یو کہتے ہیں کہ "اُنکے وہ علم ادب کے بھرے ہوئے خزانے اُنکی ذکاوت و علمیت کی لاتعداد تصنیفات اُنکے طبعی اکتشافات و ایجادات یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اُن کے دماغ ان عقلی مساعی میں روز و شب منہمک رہتے تھے۔ اُنکی اِن تکمیلوں کو دیکھکر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ ہر علم و فن میں ہمارے اُستاد تھے۔ ایک طرف تو اُنکی قرونِ وسطیٰ کی تواریخ اُنکے اسفار بحری و بری اُن کی سوانح عمریاں اور دوسری طرف اُنکی بے مثال صنعت و حرفت اور ایک ایسی طرز تعبیر جو نئے تصورات سے معمور ہے۔ یہ باتیں ہیں جو انہوں نے ہمارے لئے ترکہ میں چھوڑیں اور ہم اُن سے مدتوں متمتع ہوتے رہے"

عربی زبان کا اثر۔ عربی زبان نے یورپ کی زبانوں پر جو اثرات چھوڑے ہیں اُن سے عربوں کے اثر تہذیب کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عربوں ہی کی زبان سے جو آٹھویں صدی میں اور اُسکے بعد بحرِ متوسط پر قابض تھے فرانسیسی اور اطالوی زبانوں نے وہ الفاظ لئے جو بحری انتظامات

---

[1] مؤرخوں کی تاریخ دُنیا جلد ۸۔ ص ۲۷۷

اور جہاز رانی سے تعلق رکھتے تھے۔ افسروں کے نام اور نعرہائے جنگ بھی وہیں سے لئے۔ انتظام مملکت کے متعلق اصطلاحیں بغداد اور قرطبہ سے اخذ کی گئیں۔ فرانسیسی میں شکار کے اکثر الفاظ عربی الاصل ہیں۔ مثلاً تورناماں Tournament. عربی لفظ دوران سے نکلا ہے جو ایک قسم کی فوجی ورزش تھی جس کا ایک جز دائرہ کے گرد پھرنا تھا۔ موسیو سدی یو کہتے ہیں علمی اصطلاحات ہمیں اکثر عربوں سے ملی ہیں ہمارا علم ہیئت اُن سے معمور ہے اکثر ستاروں کے نام بھی عربی ہیں (مشتری Mercur. کی مثال مشہور ہے) کیمیا علم حیوانات اور علم طب کی بہت سی اصطلاحات اور ادویہ کے نام عربی سے لئے گئے ہیں۔ لفظ اساسن Assassin کی اصل یہ ہے کہ ایک گروہ قرامطیوں کا جسکو حسن نیشاپوری نے ۱۰۹۰ء میں جمع کیا تھا اور جو لوٹ مار کیا کرتا تھا وہ حملہ سے پہلے "حشیش" کا استعمال کرتے تھے لہذا وہ حشیشین کہلانے لگے اس سے لفظ اساسن یورپ میں آیا۔ Escadre یا Squadron عسکر سے Darsena یا Arsenal دارالصناعۃ سے (Gabelle یا Alcabala القبالہ سے Tarif تعریف سے Douane دیوان سے ماخوذ ہیں Alchohol, Alcali وغیرہ مشہور الفاظ ہیں۔

فرانسیسی اور ہسپانی زبانوں کے بعض محاورات اور ترکیبیں عربی سے ماخوذ ہیں۔

عربی شاعری کا اثر۔ اگرچہ اکثر مصنفین کے بیان کے مطابق عربوں کی شاعری نے یورپ کی شاعری پر کچھ اثر نہیں کیا مگر موسیو لی بان کہتے ہیں[۱] کہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ردیف و قافیہ یورپ میں عربوں ہی سے آیا اور یہ تو ظاہر ہے کہ پرووانس Provence کی شاعری جو یورپی علم ادب کی بنیاد ہے اُس کا ماخذ عربوں ہی کی شاعری ہے۔

عربوں کا متخیلہ بہت قوی تھا اُنکی دلچسپ داستانیں یورپ کے سب ملکوں میں مقبول عام ہوگئیں۔ الف لیلہ کو دُنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے۔

آخیر میں ہم موسیو لی بان کی طرح یہ سوال کرتے ہیں کہ "پھر کیا وجہ ہے کہ یورپ کے علماء اُس احسان عظیم کا اعتراف نہیں کرتے جو عربوں نے یورپ پر کئے"؟ موسیو لی بان کا اپنا جواب بہت صحیح ہے وہ کہتے ہیں "بات یہ ہے کہ فی الواقع ہماری رائے کی آزادی اصلی نہیں ہے بلکہ ظاہری ہے اور بعض مسائل

---

[۱] تمدن عرب صـ ۴۱۰

پر جس آزادی سے ہم چاہتے ہیں ہم ہرگز غور نہیں کر سکتے۔ موروثی اثرات نے ہمیں مجبور کر رکھا ہے۔ اگر انکے جنگی کارناموں نے ہمیں شرمندہ نہیں کیا تو کم از کم اُنکے اعلیٰ درجہ کے تمدن نے ہمیں ذلیل و خوار کیا اور گویا بہت ہی قلیل زمانہ سے ہم اُنکے تسلط سے نکلے ہیں۔

اس موروثی تعصب کے ساتھ یہ دوسرا تعصب ہے جسے ہماری کم بخت تعلیم نے ہمارے دل میں ڈالا ہے کہ کل قدیم علوم و ادب ہمیں صرف روما و یونان سے آئے ہیں۔ بعض اہلِ مغرب کو اس خیال سے ہمیشہ شرم آتی ہے کہ عیسائی یورپ کی وحشیانہ معاشرت سے نکلنے کا باعث ایک قوم کافر تھی یہ خیال اس قدر دردناک ہے کہ اس سے بچنے کی آسان ترین راہ یہی ہے کہ بلا دلیل اسے رد کر دیا جائے"

تجربہ اور مشاہدہ کا شوق۔ عربوں نے میدانِ تمدن میں قدم رکھتے ہی بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ تجربہ اور مشاہدہ کو عمدہ سے عمدہ کتاب پر ترجیح ہے بیکن کو اس دریافت کا موجد قرار دیا جاتا ہے درحقیقت عرب اس کے بانی تھے۔ ہم بولڈ (Humboldt) لکھتا ہے کہ علمی ترقی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان خود اور اپنے ارادہ سے یعنی بذریعہ تجربہ حوادثِ طبیعیہ کو پیدا کر سکے۔ پھر بطورِ تمثیل کہتا ہے کہ عربوں نے یہ درجہ جس سے متقدمین بالکل ناواقف تھے حاصل کر لیا تھا۔ سدیو Sedillot کہتا ہے کہ معلوم کے ذریعہ سے غیر معلوم کو دریافت کرنا، حوادث کا درست مشاہدہ اِن معلومات کے ذریعہ سے علل کو نکالنا۔ اُن ہی قضایا کو ماننا جو تجربہ سے ثابت ہو چکے ہوں۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب بخوبی آگاہ تھے۔ موسیو ڈیلامبر اپنی تاریخ ہیئت میں لکھتے ہیں کہ اگر یونانیوں میں دو یا تین اجرامِ سماوی کا مشاہدہ کرنے والے تھے تو عربوں میں بکثرت ایسے لوگ تھے۔ یونانیوں میں کیمیا کا تجربہ کرنے والا کوئی نہ تھا عربوں میں سینکڑوں۔ تجربہ کے طریقہ سے اُنکی تحقیقات میں صحت اور جدت پیدا ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے وہ تمام پہلے لوگوں سے کہیں آگے بڑھ گئے۔

بات یہ ہے کہ یہ سیدھے سادھے لوگ اپنے لق و دق صحراؤں میں مدتوں قدرت سے اِس طرح دوچار رہے تھے کہ اُنکی طبیعت میں مشاہدہ کی عادت گویا فطرتِ ثانی ہو گئی تھی۔ جہاں جاتے وہ اپنے اردگرد کی اشیاء اور مظاہرِ عالم کو غور کی نظروں اور دریافت کی نگاہوں سے دیکھتے اور اپنے مشاہدات سے کوئی نہ کوئی نئی بات نکال کر اُسے علوم و فنون کی ترقی میں صرف کرتے۔ مشاہدے سے وہ تجربے پر پہنچے اور تجربے سے انہوں نے دُنیا کو نئی نئی عملیات سے آگاہ کر کے اُسکی مادی اور عقلی ا[illegible]

دماغی ترقی میں ایک معتدبہ اضافہ کیا۔ وہ عرب کے صحراؤں سے نکل کر شام کے میدانوں میں آئے اور شام کے میدانوں اور افریقہ کے صحراؤں سے گذر کر یورپ کی وادیوں میں جا بسے ؛

عرب اور اہلِ یورپ - افریقہ کی ظلمت کو انھوں نے اپنی تہذیب کی روشنی سے مٹا دیا۔ اندلس کی وادیوں کو انھوں نے باغوں اور چمنوں سے آراستہ کیا جن میں چاروں طرف علم دوست لوگوں کی آوازیں پرندوں کے چہچہوں اور ندیوں کے بہتے پانیوں کی صداؤں سے زیادہ شیریں بن کر چاردانگ عالم میں سنائی دینے لگیں۔ یورپ میں جو لوگ علوم و فنون کے پیاسے اور ترقی و اصلاح کے دلدادہ تھے وہ سب عربوں کی اس تمدن گاہِ اسلام میں بے دھڑک جا پہنچے۔ یورپ والے بتیرے چلاتے رہے کہ کافرو! تم سراب کے پیچھے دوڑتے ہو۔ اور ناحق اپنی روح کو خوف و خطر میں ڈال کر تحصیلِ عذاب کرتے ہو۔ مگر انھوں نے اپنے ہمجنسوں کی اس جاہلانہ چیخ پکار کی مطلق پروا نہ کی اور علم و ادب کے اُن میٹھے چشموں سے جو گلستانِ اندلس میں جا بجا جاری تھے سیراب ہو کر اپنے ہموطنوں اور ہم مذہبوں کو اُنکی لاعلمی اور ہٹ دھرمی کی اُلجھنوں سے چھڑانا چاہا۔ کچھ مانے اور کچھ بگڑ بیٹھے مگر جویانِ حق نے اپنی اُن مسلسل مساعی سے جو یقین کامل اور عزمِ راسخ کا ثبوت ہوتی ہیں یورپ کے سسکتے ہوئے مریضوں کو اپنے زبردستی کے معالجے سے گویا از سرِ نو زندہ کر دیا اور وہ جو شبِ جہل میں التباسِ حواس کے باعث خیالی جنوں پریوں اور بھوت پریت کے پنجوں میں گرفتار تھے اس طرح جھنجھلا کر اُٹھے اور ایسے بے اختیار و بیقرار ہو کر نعرہ زن ہوئے کہ ایک دُنیا نے اُنکی قیامت خیز شور شوں کو سُنا اور آج بھی ہمارے غفلت شعار کانوں میں گویا انہیں عربوں کی آوازیں گونج رہی ہیں جنھوں نے اپنے زمانے میں سوئی ہوئی دُنیاؤں کو اُن کے غفلت کے خوابوں سے بیدار کر دیا تھا۔

(بشیر احمد)

کہیں ہے کوئی

درمیانے درجہ کی ایک گاڑی میں صرف تین آدمی تھے۔ ایک سوداگر جو اخبار کے تجارتی کالم میں محو تھا۔ ایک سرکاری ملازم جسکے ساتھ بہت سا اسباب تھا اس لئے غالباً کسی دوسرے شہر کو تبدیل ہوکر جارہا تھا۔ اور ایک اور آدمی جو روشنی سے دُور کونے میں سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ ناژو نے دروازہ کھول کر کمرے میں دیکھا۔ قدرے جھجکا۔ ایک اور گاڑی میں نگاہ دوڑائی۔ پھر واپس آیا اور گویا تعارف کے لئے اپنے آلۂ موسیقی سے ایک خفیف سی آواز نکالی اور سوار ہوگیا! اسکے بائیں ہاتھ میں نہایت محنت سے گھسا کر صاف اور گول کئے ہوئے دو پتلے پتلے پتھر تھے جو قد میں ایک روپے سے کسی قدر بڑے ہونگے وہ انکو داہنے ہاتھ کی مدد سے نہایت تیزی سے بجاتا تھا اور اس ساز کے ساتھ گاتا تھا۔

پلیٹ فارم پر سے اسکے دو تین ہم عمر لڑکوں نے آواز لگائی۔ "ارے او گانے والے!" وہ انکی طرف دیکھ کر صرف مسکرا دیا۔

سوداگر نے نہایت بے پروائی سے اخبار کے کنارے پر سے دیکھا۔ سرکاری افسر جو شاید اس لڑکے کو جانتا تھا مسکرایا۔ لیکن کونے والے آدمی نے نہ تو نگاہ اٹھائی اور نہ کوئی اور حرکت کی۔ اسکی طرف دیکھنے سے کسی کو بھی یہ خیال نہ ہوا کہ وہ اپنی بیوی اور پانچ بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر جارہا ہے لیکن حقیقت یہی تھی۔ آوارہ، شہدہ، بدمعاش؟ نہیں۔ قسمت کا مارا۔ فلک کا ستایا۔ تقدیر کے ہاتھوں عاجز اور اس لئے بزدل۔ کمزور، خود غرض۔ تیرہ بختی کی زندہ تصویر۔

دفتر میں اسّی روپیہ ماہوار پر ملازم تھا۔ تخفیفِ عملہ اور مذہبی تعصب کی وجہ سے ملازمت جاتی رہی۔ اس نے اپنے مکان کو بیچ کر بیوپار شروع کیا لیکن حصہ دار مال خریدنے کے بہانے سرمایہ کا ایک بہت بڑا حصہ لیکر فرار ہوگیا۔ اب ایک چھوٹی سی دوکان میں سٹیشنری یعنی لکھنے پڑھنے کا سامان بیچا کرتا۔ دوست یار آئے دن شام کے وقت تھیٹر یا سنیما دیکھنے لے جاتے۔ مروت کی وجہ سے انکار نہ ہوسکتا لیکن صبح کو جیب بالکل خالی ہوتی۔ اور صابرہ کی آنکھیں ...... صرف آنکھیں ...... ہلکے سے نامعلوم سے درد کی جھلک لئے ہوتیں۔ کبھی بے دلی سے یا کم ہمتی سے دکان پر جانے کو دل نہ چاہتا تو اسکی

آنکھوں میں پھروہی جھلک ہوتی۔ آہ! یہ بات کتنی تکلیف دہ تھی۔ کیا اُسے رونا نہ آتا تھا؟ ملامت نہ کرسکتی تھی؟ یہ دردبھرا صبر۔ ۔ ۔ اور خاموشی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ظلم تھا صریحاً ظلم ــــــ

پھر بچے علیل رہے تھے بخار۔ کھانسی۔ خدا جانے کیا کیا۔ دوائی کا خرچ تھا۔ ڈاکٹر کی فیس اور رات بھر انکے پاس بیٹھنا ــــ گو یہ کام عموماً انکی ماں ہی کرتی تھی ــــ لیکن پھر وہ خود بھی زرد رُو ہونا شروع ہوگئی۔ اسکا رنگ اور تازگی جاتی رہی۔ اگر کسی کو حسن سے صرف حسن کی خاطر الفت تھی تو وہ ممتاز تھا اور اسکے اردگرد کے محدود سے دائرے میں اُسکی بیوی ہی تھی جو اسکی اس روحانی خواہش کو پورا کرتی تھی۔ اب وہ بھی کمر شاخ کی طرح کثرتِ ثمر اور کچھ دوسرے اسباب سے خمیدہ ہونا شروع ہوگئی۔ پھر ممتاز کو ایک روز معلوم ہُوا کہ وہ گھر سے باہر کبھی نہیں نکلتی۔ ہمسائے میں ایک شادی تھی اور انہوں نے مدعو کیا تھا لیکن کپڑے نہ تھے۔ جو تھے وہ کاٹ چھانٹ کر بچوں کی ضروریات میں صرف کردئے گئے تھے۔ بچوں نے مدرسے جانا ترک کردیا تھا۔ ان کی ماں نے ایک دن دھیمی آواز سے کہا تھا کہ ان کے پاس کتابیں نہیں ہیں۔ گزشتہ رات کھانے کے لئے بھی فقط سوکھے ٹکڑے تھے۔ خدا جانے بچوں نے کیا کھایا ہوگا۔ اور مہینہ ختم ہونے والا تھا۔ مکان کا کرایہ ادا کرنا بھی ضروری تھا۔ صابرہ کی کبھی چمکدار اور خوبصورت آنکھوں کے نیچے دو ہفتے سے سیاہی مائل حلقے نظر آنے لگے تھے۔

اب حد ہوچکی تھی۔ اور وہ ان سیاہی مائل حلقوں اور آنکھوں کی اُس جھلک کو برداشت نہ کرسکتا تھا۔ بیوی کی صورت سے متنفر ہوگیا تھا کیونکہ اسکی طرف دیکھنے سے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ گھر کا گھر بھوکا محتاج اور تباہ حال۔ ہر چیز اسے کاٹنے کو دَوڑتی تھی۔ کنبے کی تباہی کا خیال بھوت کی طرح ہر وقت سر پر سوار تھا۔ وہ دل میں کہتا تھا کہ "شاید میری ہی شومئی قسمت اس بربادی کا باعث ہو۔ شاید مجھ سے نجات حاصل کرنے اور میری فضولخرچیوں سے بے فکر ہوجانے پر صابرہ بچوں کو آرام سے رکھ سکے اور خود اپنا پیٹ پالنے کے لئے بھی کوئی رستہ نکال لے۔ وہ محنتی تھی۔ چالاک تھی۔ دستکاری سے گھبراتی نہ تھی۔ کم ازکم اُس وقت تک جبتک میں اپنے ساتھ اُسے بھی برباد کرنے کے لئے اسکی زندگی میں شامل نہ ہُوا تھا۔ ممکن ہے کہ میں خود ہی دُور دراز ممالک سے روپیہ پیدا کرکے کسی دن ساز و سامان کے ساتھ واپس آؤں۔ اور اپنے بی بی بچوں کے زخمی دلوں پر مرہم رکھ سکوں

یا اگر میری بدبختی میرا ساتھ نہ چھوڑے اور میں خوشحال ہو کر واپس نہ آسکوں تو وہ سب کچھ عرصہ کے بعد مجھے فراموش کر دیں اور میری لعنت سے نجات پانے کے بعد اپنا گذارا آسانی سے کر سکیں۔"
غرض اسکے خیالات یہ تھے اور اب وہ بصرہ کی عام بھرتی میں شامل ہونے کے لئے لاہور سے ریل میں سوار ہو کر جا رہا تھا۔

نازو نے کونے میں ایک نگاہ ڈالی اور دل میں کہا "ہوں! ——— نیند آرہی ہے؟ تو لو جگانے کا منتر پڑھتا ہوں" اور اپنے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو بجاتے ہوئے گانا شروع کر دیا ———

"ایک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا . . . . . . "

وہ آدمی کونے میں چپ چاپ بیٹھا رہا اور جب غزل ختم ہو گئی تو بے پروائی کے انداز میں اسکے شانے کو ذرا سی حرکت ہوئی۔
نازو نے کہا "جب انسان سو رہا ہوتا ہے تو عام طور پر اسکے شانے ہلا نہیں کرتے"۔ "لو اور سہی"

"غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا . . . . . . "

طرز غالباً اس نے تھوڑا ہی عرصہ ہوا سیکھی تھی اور شاید مشق کرنے کا خیال تھا۔
ریل جو سٹیشن کی حدود سے نکلکر رفتار میں تیزی پیدا کر تی اور شہر کی عمارات کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ ایک باغ میں سے گذری جس کے گھنے درختوں کے سائے میں اسرار ہائے خفتہ کا شبہ ہوتا تھا۔ پھر چند انگریزی وضع کے بنگلے تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد گاڑی کی کھڑکیوں کے سامنے آکر الہ دین کے طلسمی محلات کی طرح آناً فاناً غائب ہو گئے۔ آبادی کے نشانات کم ہونے لگے نازو الاپ رہا تھا:۔

"جب اتنی بے وفائی پر اُسے دل پیار کرتا ہے ———"

شہر کا ریل کی سڑک پر آخری پھاٹک اور چوکی اپنی مخصوص کبھی نہ بدلنے والی آواز کے ساتھ آئے اور گذر گئے۔

"——— اسے دل پیار کرتا ہے۔
تو یا رب وہ ستمگر با وفا ہوتا تو کیا ہوتا ———"

"کیا آفت ہے!" ممتاز نے اپنی ٹوپی کو اتارا اور کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ بڑی خوبصورت چاندنی رات تھی۔ دھان کے کھیت ہوا کی معیت سے اپنا خاص سُر پیدا کرکے اپنی ہی مست کر دینے والی خوشبو میں سرشار ہو کر جھوم رہے تھے۔ ریل کی سڑک تھوڑا سا چکر کاٹ کر نصف دائرے کی شکل میں گھوم گئی تھی اس لئے دُور شہر کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اُنہیں میں کہیں اُس معمولی کم حیثیت سے مکان میں۔ . . . . اُس پرانے ٹوٹی ہوئی چمنی والے لمپ کی روشنی میں . . . . وہ انتظار کر رہی ہوگی ——"

"—— باوفا ہوتا تو کیا ہوتا۔"

ٹکٹ دیکھنے والا دروازہ کھول کر اندر آیا اور سوداگر سے ٹکٹ مانگا۔ دُبلا پتلا سا آدمی تھا اور گال سُکڑ کر ہڈیاں اُبھر آئی تھیں —— اتنی خوفناک رات میں . . . . . ریل اس زور سے جا رہی تھی . . . . . اگر پاؤں پھسل جائے تو؟ . . . . . . کیا اسکی بھی بیوی اور پانچ بچے ہونگے؟ اور کیا اسے بھی انہیں چھوڑ کر بھاگ جانیکا خیال کبھی آیا ہوگا؟ اگر اسے علم ہو جائے کہ ایک ایسا شخص وہاں بیٹھا ہے تو وہ اس کی نسبت کیا خیال کرے . . . . . . تمام دُنیا کیا خیال کرے . . . . اور وہ . . . . . ہاں وہ . . . . . وہ خود کیا خیال کریگی . . . . . . ؟

"آپکا ٹکٹ؟"

اس نے ٹکٹ نکال کر دکھایا۔ اور بابو دروازہ کھول کر پھر باہر نکل گیا اور گاڑی کے باہر لوہے کی سلاخ کو مضبوط پکڑے ہوئے نہایت احتیاط سے دروازہ بند کرکے غائب ہو گیا۔

کچھ ہواہیں اثر تھا۔ دھان کی خوشبو میں یا چاندنی رات میں۔ یا شاید نازو کے گانے میں جو فن موسیقی کے لحاظ سے گو اعلیٰ پایہ کا نہ تھا تاہم آواز کے پختہ نہ ہونے سے اور بھی مُوثر ثابت ہو رہا تھا۔ کونے والے مسافر کا سر جھکتے جھکتے پھر اسکے بازو پر آ گیا ——

وہاں . . . . دور . . . . اس شہر کے غریبانہ حصے میں جو شاید آخری مرتبہ اسکی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ بیٹھی انتظار کر رہی ہوگی۔ حیران ہوگی کہ آج اتنی دیر کیوں لگائی۔ کھانے کو گرم رکھنے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ دھیمی روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی زیادہ زرد نظر آتا ہوگا۔ اور حلقے —— آنکھوں کے سیاہ حلقے اور بھی زیادہ سیاہ معلوم ہوتے ہونگے۔ بچے بھوک سے بیتاب ہونگے وہ ان سے

کتنی ہوگی کہ تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔ ابھی آتے ہونگے۔ اسکے کان ہر آہٹ پر لگے ہونگے۔ ہاں —— کبھی کتنے خوبصورت تھے۔ وہ انہیں گلاب کی پنکھڑیوں سے تشبیہ دیا کرتا تھا ——

آخرکار بچے کھانا کھالینگے لیکن وہ پھر بھی انتظار کر رہی ہوگی۔ انتظار! تمام رات۔ آہ کیسی لمبی رات اور صرف یہی نہیں خدا جانے کتنی راتیں۔ دن۔ ہفتے۔ مہینے۔ سال!

نازو کی آواز آئی۔

"کیا تھا جرم وفا لذتِ سزا کے لئے ——"

وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ عجیب آدمی ہے جو بازو پر سر رکھے پڑا ہے۔ صرف ایک مرتبہ اُسے جنبش ہوئی اور پھر اُسی طرح —— لیکن سو نہیں رہا ہے۔ سُن رہا ہے۔ پورے غور سے سُن رہا ہے۔ نازو کی آنکھیں جو تجربہ سے لوگوں کے دل کی کیفیت بھانپ لینے کی عادی ہوگئی تھیں یہ کہہ رہی تھیں کہ اس کارواں رواں سُن رہا ہے ——

"ستم کے لطف اُٹھائے مزے جفا کے لئے ——"

وہ بھی تو گایا کرتی تھی —— ہاں —— کبھی۔ . . شادی کے پہلے دنوں میں جب وہ دونوں ایکدوسرے کی محبت کے بھوکے تھے اور دن رات اکٹھے رہنے کے باوجود سیری نہیں ہوتی تھی۔ ان دنوں میں وہ جوان تھی۔ نوعمر تھی۔ حسین تھی۔ دُنیا کی مُصیبتوں اور فکروں نے۔ خاوند کی پہلے بدبختی پھر بے پروائی اور فضولخرچی نے گھر کے کام کاج اور بچوں کے رکھ کھاؤ نے اسے زرد اور منحنی نہ بنا دیا تھا۔ اُسکی آنکھوں میں وہ جھلک —— آہ وہ جھلک اور انکے گرد سیاہ حلقے نہ تھے —— ایک مرتبہ مصیبت کے ابتدائی دنوں میں اُس وفا شعار نے اسکی رونی صورت دیکھ کر کہا تھا "کیا پروا ہے۔ جب تک تم میرے پاس موجود ہو مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" آہ ——

"—— جرم وفا لذتِ سزا کے لئے"

ہاں۔ سزا کے لئے۔ اس لئے کہ وہ اسے چھوڑ کر بصرے کو روانہ ہو جائے . . . . بصرہ . . . . لوگ کہتے تھے کہ وہاں روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔ وہ جان لڑا دیگا۔ بھوکا رہیگا لیکن روپیہ پیدا کرکے لائیگا۔ اور پھر آکر سب باتوں کی تلافی کر سکیگا —— بچے اسکی بدبختی سے نجات پا جائینگے . . . . بدبختی؟ اگر یہ بصرے میں بھی ساتھ رہی ——

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا —"

نازو کی آواز آئی۔

ریل نے سیٹی دی اور اسکی رفتار ہلکی ہونے لگی کوئی سٹیشن قریب آگیا۔ نازو نے ہاتھ بڑھایا۔ اور سرکاری افسر نے اس میں ایک آنہ رکھدیا۔ سوداگر اخبار سینے پر رکھے ہوئے خراٹے لے رہا تھا۔ ممتاز اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اسکی آنکھیں چمک رہی تھیں اور آواز بھرآئی ہوئی تھی اس لئے جب اس نے لڑکے سے کہا "اِدھر آؤ" تو وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ ممتاز نے نرمی سے کہا۔

"ادھر آؤ لڑکے۔ میں تمہیں کچھ نہ کہونگا۔ تم نہیں جانتے کہ اس وقت تم نے کیا کر دیا ہے۔"

نازو کو کچھ ڈھارس سی ہوگئی اور وہ مسکرایا گو ابھی خوف کے آثار باقی تھے۔ اور کہنے لگا میں نے تو کچھ نہیں کیا صاحب۔ میں تو صرف آپکو جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"ہاں بیشک" ممتاز نے ایک آہ بھر کر کہا "تم نے مجھے جگا دیا ہے۔ لو ہاتھ بڑھاؤ۔"

اتنی دیر میں ریل سٹیشن پر پہنچ کر ٹھہر گئی تھی۔ ممتاز نے اپنا بٹوا تمام کا تمام نازو کے ہاتھ میں اُلٹ دیا اور اسکے ابھی ہوش درست نہ ہوئے تھے کہ گاڑی سے نکلکر چلا گیا۔

"او . . . . ف . . . . . فو!" نازو کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی" روپے! ایک۔ دو۔ تین۔ اور دونیاں اور چونیاں! یہ شخص دیوانہ تو نہیں تھا! ضرور ہوگا!"

سٹیشن سے نکلنے پر ٹکٹ بابو نے ممتاز سے پوچھا کہ لاہور کا ٹکٹ لیکر وہ پہلے ہی سٹیشن پر کیوں اُترا جاتا ہے لیکن اُس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور چاندنی رات میں اپنے گھر کی طرف رُخ کر کے کھیتوں میں سے پیدل روانہ ہوگیا۔

عطاء الرحمن

عدل اور سائنس

گزشتہ زمانہ میں عدل و انصاف نے متعدد عجیب و غریب اور تکلیف دہ ذرائع مجرموں اور گواہوں سے حق بات کہلوانے کے لئے استعمال کئے ۔

اینگلوسیکسن کے عہد میں ایک شخص کو اپنی بیگناہی ثابت کرنیکے لئے سُرخ گرم لوہا کچھ فاصلہ تک ہاتھ پر رکھکر لیجانا پڑتا تھا۔ اگر اس کا وہ ہاتھ تین دن کے عرصے میں بغیر پیپ پڑے اچھا ہوگیا تو وہ آزاد کر دیا جاتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ مجرم کے ہاتھ پاؤں باندھکر اسے دریا میں ڈالدیا جاتا تھا۔ اس کا تہ میں بیٹھ جانا بیگناہی کی دلیل سمجھا جاتا تھا ۔

مغربی افریقہ میں جادوگری ایک جرم قرار دی گئی ہے۔ اور مشتبہ شخص کو جرم ثابت ہو جانے پر موت کی سزا دی جاتی ہے۔ درحقیقت یا جیسا کہ وہاں کے باشندے کہتے ہیں انسان سے بالاتر ہستی ہی اس کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ آیا ایک شخص انسانی طاقت سے زیادہ کام کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس لئے اس شخص کو زہر کے چند گھونٹ پینے کو دئے جاتے ہیں اگر وہ زہر کے اثر سے محفوظ رہا تو بے جرم قرار دیا جاتا ہے اور اگر زہر کارگر ہو جائے تو مجرم کا جلد تر خاتمہ ہو جانے میں شہری ڈاکٹر اسکی مدد کرتا ہے ۔

سواہلی لوگوں میں مشتبہ شخص کا منہ چاولوں سے بھر دیا جاتا ہے۔ اگر وہ انکو حلق سے اُتارنے میں کامیاب ہو جائے تو آزاد کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر خوف کی وجہ سے اس کا حلق خشک ہو جائے اور وہ انکو نہ نگل سکے تو مجرم قرار پاکر سزا کا مستوجب سمجھا جاتا ہے ۔

قدیم جنوبی افریقہ کے قبیلوں کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ مشتبہ شخص کو اپنی بیگناہی کا ثبوت پیش کرنیکا موقع ضرور دیا جانا چاہیئے۔ اس لئے وہ اپنی بیگناہی ثابت کرنیکے لئے اُبلتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈالتا تھا جس کا لازمی نتیجہ کھال کا جل کر چربی کا نکل آنا ہوتا تھا اور یہ مجرم ہونے کی بیّن دلیل مانی گئی تھی جس کی سزا میں وہ زندہ آگ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اور گاؤں میں ایک دن کی تعطیل منائی جاتی تھی ۔

سلیمانیوں میں مشتبہ شخص اپنی بیگناہی کا ثبوت ایک ایسے دریا سے تیر کر پار اُتر جانے سے دے سکتا تھا جس میں نگر مچھ اور دیگر دریائی جانوروں کی بڑی تعداد موجود ہو۔ ایسے موقع پر جانوروں کی توجہ

خاص طور پر شکار کی طرف مبذول کرا دی جاتی تھی۔ یا اس شخص کو جادو کا پتھر جو گرم کر لیا جاتا تھا نگلنا پڑتا تھا اگر اسکو کچھ ضرر نہ پہنچتا تو وہ بری کر دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات مجرم اس جادوگر کی امداد حاصل کر لیتا تھا جو وہ پتھر تیار کرتا تھا۔ ایسی حالت میں راز افشا ہو جانے پر جادوگر کو بھی خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔ اسکی سزا یہ مقرر کیگئی تھی کہ وہ تیز گرم کیا ہُوا پتھر جلدی جلدی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرے۔ اگر اس نے بغیر ہاتھوں کو نقصان پہنچائے ایسا کر لیا تو وہ رہا کر دیا جاتا تھا۔

مجرموں سے سچ کہلوانے کے متعدد طریقے ہندوؤں میں بھی رائج تھے۔ انکے یہاں ایک شخص کو اپنے لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھ کر شہادت دینی پڑتی تھی اور یہ یقین کیا جاتا تھا کہ اگر اس نے جھوٹی شہادت دی تو اس کا لڑکا بہت جلد فنا ہو جائیگا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اسکو ایک اُنگلی دریائے گنگ کے پانی میں ڈال کر شہادت دینی پڑتی تھی۔

امریکہ کی پولیس مدت سے ایک ایسی دوا معلوم کرنیکی کوشش میں منہمک ہے کہ جس کو پچکاری کے ذریعہ سے بدن میں پہنچا کر سخت دروغگو شخص کو بھی تھوڑے عرصے کے لئے سچ بولنے پر مجبور کرے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ یہ دوا گواہوں اور مجرموں کو استعمال کرا کے اصلی حقیقت دریافت کی جائے۔ روس بھی اسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ہپنوٹزم سے مدد لے رہا ہے۔

گذشتہ کئی سال سے سائنس مقدموں کے فیصلے صادر کرانے میں اہم حصہ لے رہا ہے اور وہ وقت بہت سرعت کے ساتھ قریب آرہا ہے جب دقیانوسی طریقے جو مقدموں کے دوران میں استعمال کئے جاتے تھے عنقا ہو جائینگے۔ اور اُنکی جگہ تمامتر سائنس کے جدید انکشافات لے لینگے۔ پچاس سال قبل عدالتوں میں جو طریقے کام میں لائے جاتے تھے بہت ہی غیر مہذب تھے۔ گواہوں کو دھمکا اور پھسلا کر زبردستی شہادت دینے کے لئے لایا جاتا تھا کیونکہ خود مجرم کو اپنے حق میں کچھ کہنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر ان طریقوں سے جو نتائج برآمد ہوتے تھے وہ تسلّی بخش نہ تھے اور اگر اس سے بھی قبل کے واقعات پر نظر ڈالی جائے جس زمانہ میں مجرموں اور گواہوں پر تشدد روا رکھا گیا تھا تو نتیجہ قطعی برعکس نکلتا تھا۔

موجودہ زمانہ میں عدالتوں کی تمام تر اُمیدیں سائنسدانوں کے ساتھ وابستہ ہیں مجرموں اور گواہوں سے صحیح اور سچے واقعات معلوم کرنیکے اہم سوال نے بڑی حد تک متعصبانہ جذبات کو دبا دیا ہے اور اب سائنسدان اصحاب خواہ وہ عدالتوں سے اجنبیت کا برتاؤ کرتے ہوں یا دوستی کا عدالتوں کے بہی خواہ

تصور کئے جانے لگے ہیں۔ جدید خرد بین اور صحیح کیمیائی طریقے جو مردہ اجسام سے موت کا راز افشا کرتے ہیں نیز دماغی امراض کی دقیق معلومات نے عدالتوں کو صحیح فیصلے صادر کرنے اور غلط راستہ سے ہٹانے میں اہم حصہ لیا ہے
فوجداری کے مقدموں میں یہ معلوم کرنا کہ گواہ سچی شہادت دے رہا ہے یا جھوٹی ایک دشوار امر ہے۔ معصومیت بعض اوقات جرم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایک بیگناہ ہستی جسکے خلاف مواقع نے بہت سے واقعات جمع کر دئیے ہوں اکثر جرم کی مرتکب خیال کر لی جاتی ہے اور سزا یاب ہوتی ہے ۔

امریکن ڈاکٹر ہاؤس نے ایک ایسی دوا کی تحقیق میں کہ جس کے ذریعہ سے انسانی دماغ کو ایسی حالت پر لایا جائے کہ وہ قوتِ ارادی سے کام نہ لے سکے اور ساتھ ہی سوالات سمجھنے اور انکا جواب دینے کی صلاحیت بدستور قائم رکھے بہت دماغی کاوش سے کام لیا اور آخر کار وہ اس میں کامیاب ہوا لیکن جب اُس نے اپنی عظیم الشان ایجاد اور کامیابی کا اعلان کیا تو اسکے دعوے کو صداقت پر مبنی نہ جانا گیا۔ لوگوں کی اس بے اعتقادی نے ڈاکٹر ہاؤس کو مجبور کیا کہ وہ اسکا عملی ثبوت پیش کرے۔ جس کے لئے وہ ڈالس جیل کے قیدیوں پر آزمائش کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ رضا کاروں کو جو اپنی بیگناہی کے دعوے پر قائم تھے دعوت دی گئی ایک لڑکے نے اس چیلنج کو منظور کر لیا۔ سرکاری وکیل معہ ایک مختصر نویس کے موجود تھا۔ اسکی موجودگی میں ڈاکٹر ہاؤس کی دوا استعمال کرانے کے بعد لڑکے نے جو بیان دیا وہ حرف بحرف صحیح نکلا ۔

اس قسم کے طریقے جن خوشگوار نتائج کا پیش خیمہ ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ فوجداری کے مقدمات جن کے فیصل کرنے میں مہینوں اور بعض اوقات برسوں لگ جاتے تھے انکی مدت بہت ہی قلیل ہو جائیگی کیونکہ اس دوا کے زیر اثر ملزم جو بیان دیگا وہ بناوٹ سے قطعی پاک ہوگا اور خود اسکے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ اسکی گنا ہگاری یا بیگناہی کی دلیل ہونگے ۔

وقیع احمد قریشی طوفان

غزل

جُدا کرینگے نہ ہم دل سے حسرتِ دل کو — عزیز کیوں نہ رکھیں زندگی کے حاصل کو

اُمید رکھتی ہے سرگرم جستجو دِل کو — خدا دراز کرے عمرِ سعیٔ باطل کو

پسند آئی ہے منجدھار کشتیٔ دل کو — مرا سلام ہے اب دُور ہی سے ساحل کو

لڑی نہ تھی سرِ محفل ہنوز آنکھ سے آنکھ — وہ نیچی نظریں اُڑا لے گئیں مرے دل کو

نشانِ زندگیٔ دل ہے بیقراریٔ دل — ہے دل کی موت اگر چین آ گیا دِل کو

کٹھن ہے کام تو ہمت سے کام لے اے دل — بگاڑ کام نہ مشکل سمجھ کے مشکل کو

نہیں وہ کام مرا جس کا نیک ہو انجام — نہیں وہ راہ مری جو گئی ہو منزل کو

تری نگہ نے کیا ہے عِلاجِ بیتابی — کہ دی اک آن میں تعلیمِ بیخودی دل کو

فریب ہے اُسے ہر ہر قدم پہ منزل کا — وہ کیا کرے کہ نہ دیکھا ہو جس نے منزل کو

الم نصیبِ تغافل ہوں ایسے بخت کہاں — کہ سنگِ جور ترا پوچھے شیشۂ دِل کو

نہاں اگرچہ ہے محفل سے سوزِ دل میرا — مگر یہ راز ہے معلوم شمعِ محفل کو

میں اور نکلوں تلاطم سے قعرِ دریا کے — کنارے چھوڑ کے آیا ہوں آپ ساحل کو

بلا کی ہوتی ہے وحشت کی بھی غزل خوانی
کہ اک سرور سا ہوتا ہے اہلِ محفل کو

(رضا علی وحشت)

تپشِ ناتمام

شام کا وقت تھا۔ ٹرین چل رہی تھی تین دوست گاڑی کے ایک کمرے کے آخری کنارے کے ایک بنچ پر بیٹھے ہنس بول رہے تھے کچھ دیر کے بعد گاڑی ایک سٹیشن پر رکی اور کچھ مسافر باہر نکل گئے جسکی وجہ سے انکے سامنے کی بنچ خالی ہوگئی اور یہ تینوں دوست اس پر قابض ہو گئے انکے قریب کی تیسری بنچ پر ایک لڑکی ایک بڑھیا اور کچھ اور مسافر بیٹھے تھے +

لڑکی کچھ زیادہ حسین نہ تھی۔ کوئی تنک مزاج شخص تو اسے حسین کہنا بھی گوارا نہ کرتا البتہ نوخیزی شباب کے اثرات اس کے چہرہ سے ظاہر تھے اور شباب بذاتِ خود حسن ہے۔ لڑکی کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہ ہوگی بوڑھی خاتون بظاہر اس کی ماں اور پاس بیٹھے ہوئے دو نوجوان مرد اسکے بھائی معلوم ہوتے تھے۔ اور غالباً یہی ان کا سارا کنبہ تھا۔ جو گنگا مائی کے کسی پوتر استھان پر اشنان کر کے واپس آ رہے تھے کیونکہ کبھی کبھی موتیوں کے سے قطراتِ آب انکے برتن سے گرتے تھے جس کا منہ مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ ہمارے دوستوں نے لڑکی کو اندر داخل ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اب انکی نگاہیں پہلی دفعہ اس پر پڑیں۔ وہ جذبات جو کسی نوجوان کے قلب میں جنس لطیف کو دیکھنے سے پیدا ہو سکتے ہیں ان کا تجزیہ مشکل ہے۔ کیونکہ نہ تو وہ ہمیشہ تہیج زا محبت کا اثر ہوتے ہیں اور نہ جیسا کہ تنگ نظر لوگوں کا خیال ہے ہمیشہ ہوس ہی سے آلودہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ان میں ایک عجیب قسم کا ابہام ہوتا ہے۔ ایک خوف آمیز لرزہ ایسا لرزہ نہیں جو بالکل ان کو بے اوسان ہی کر دے۔ نہ ایسا جو ان کے حواس کو معطل بنا دے۔ بلکہ بالکل اس معصوم بچہ کا سا لرزہ جو خوفناک ہوئے کے خیال سے بیتاب ہو جاتا ہے جس کے متعلق وہ خیال کرتا ہے کہ بکس میں بند ہے اور ابھی اپنے نامعلوم ہاتھ نکالیگا۔ نوجوانوں کی سرشت میں صنفِ نازک کے متعلق ایک پُر اسرار اور نامعلوم محبت آمیز نظربازی کا جذبہ ہوتا ہے۔ جس میں شرارت کی رنگ آمیزی کی دخل اندازی بھی کسی قدر ہوتی ہے اسی لئے ان دوستوں نے بھی اس لڑکی کو کبھی کبھی دیکھ کر آپس میں چٹکیاں لے لیکر کانا پھوسی شروع کر دی۔ ایک نے کہا کہ وہ کنواری ہے۔ کیونکہ انگلیوں میں کوئی انگوٹھی نہیں۔ دوسرے نے کچھ اور کہا اور تیسرے نے بھی کچھ اپنی ہی سی کہہ ڈالی۔ غرض اسی طرح بار بار اسکو دیکھ دیکھ کر وہ باہم باتوں میں مصروف رہے +

ایک سٹیشن آیا۔ تینوں میں سے ایک دوست نیچے اُتر گیا۔ رات بھی ہو گئی تھی۔ لالٹینیں روشن ہو گئیں روشنی میں نظر آیا کہ ان دونوں دوستوں میں سے ایک کی عمر ۲۳ سال سے زیادہ اور صحت بہت اچھی ہے اعضاء بھی متناسب ہیں بجز ناک اور ہونٹوں کے۔ کیونکہ ناک غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی اور پتلی اور ہونٹ بہت بڑے بڑے اور موٹے تھے۔ دوسرا اس سے کم عمر کا تھا شاید ۱۹ سال کی عمر ہوگی مگر پہلے سے زیادہ شانِ دلربائی اس میں پائی جاتی تھی۔ گو پہلے میں انجذاب ضرور تھا۔ علاوہ ازیں موخرالذکر میں ایک خاص قسم کا بھولاپن تھا۔ جس نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

وہ ایک دوسرے کے بالمقابل بنچوں پر بیٹھے تھے۔ اس لئے دونوں میں سے کم عمر نوجوان اور لڑکی میں صرف ایک بنچ کا فاصلہ تھا۔ اور بڑے میں دو بنچوں کا۔ ان میں سلسلۂ گفتگو پھر اسی لڑکی کے متعلق شروع ہو گیا۔ اور سلسلۂ گفتگو میں اطمینان پیدا کرنے کے لئے اس کو بھی دیکھ لیا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے بڑے بڑے بستروں کو اپنے سروں کے نیچے رکھ لیا اور اب بار بار دیر دیر تک اسکو دیکھنا شروع کیا۔ دونوں میں سے چھوٹا دیکھنے میں کسی قدر شرمیلا معلوم ہوتا تھا۔ مگر ظاہر ایسا کرتا تھا کہ گویا نہیں ہندوستانی شعراء نے بجا طور پر نگاہ کا مقابلہ کبھی تیر اور کبھی تلوار سے کیا ہے۔ تبسّم کے متعلق یہ استعارات استعمال کرنے کے خلاف اگر کوئی بات ہے تو صرف یہ کہ ان میں تبسم کو سختی اور اور شدت سے تشبیہ دی گئی ہے اگرچہ تبسّم ایک نرم اور دلگداز چیز ہے۔ لیکن نگاہ کی ایک شعاع بھی جو آنکھوں سے نکلتی ہے۔ کبھی تیر کی طرح سخت نہیں ہو سکتی۔ مگر اسکے ساتھ ایک پُراسرار تعجب خیز قوت ضرور ہوتی ہے میری مراد اس سے نگاہ کی وہ قوت نہیں جو توجہ سے بالارادہ پیدا کی جاتی ہے۔ یہ کیفیت صرف نظر کی ایک جھلک سے پیدا ہوتی ہے مگر اس میں "عامل" اور "معمول" کی کیفیات کا کچھ بھی دخل نہیں۔ بلکہ اس کو محض اتفاقی بھی کہہ سکتے ہیں بااین ہمہ یہ واقعہ ہے کہ چھوٹے نوجوان نے اپنے ساتھی سے بیان کیا کہ وہ جب چاہے اس عورت کو اپنی طرف دیکھنے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔ یہ تو اس کا یقین تھا۔ اور خوش قسمتی سے اتفاق بھی ایسا ہی ہُوا کہ جب بھی وہ ایک خاص وقت تک اسکی طرف دیکھتا۔ تو وہ لڑکی بھی اسکی نگاہوں کو اپنے جسم پر پڑتے ہُوئے محسوس کرتی۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ آتشیں شیشہ میں سے آفتاب کی شعاعیں کسی چیز پر پڑا کرتی ہیں یہ بالکل تھوڑا سا وقفہ ہوتا تھا۔ جب بھی وہ لڑکی اسکی طرف دیکھتی یہ اپنی نگاہیں اُسکی آنکھوں کے عمق تک میں بٹھا دیتا۔ جب وہ اپنی ماں سے باتیں کرتی تب بھی یہ اسکی آنکھوں میں اپنی عمیق نگاہو ں

کی ندیاں انڈیل دیتا۔ جس سے وہ متاثر ہوتی اور شرم سے کچھ بھیگ سی جاتی۔ وہ شخص جو دوپہر کے وقت آتشیں شیشہ لیکر کسی سوئے ہوئے شخص کے کپڑوں سے کھیلتا ہے درحقیقت "وہ آگ سے کھیلتا ہے" اور کچھ ایسا ہی حال ہمارے اس دوست کا بھی تھا۔ لڑکی نے ایک دفعہ۔ دو دفعہ تین دفعہ اسکی نگاہ سے بے التفاتی بھی کرنا چاہی۔ مگر وہ نگاہیں اس کثرت سے آتی تھیں اور ان میں ایسی مسرت خیزیاں پنہاں ہوتی تھیں۔ کہ کسی معصوم لڑکی سے یہ امید کہ وہ بے التفاتی کریگی مشکل ہے۔ اس نے بھی ذرا پلٹ کر اسکی آنکھوں کو دیکھا۔ محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ان میں خالص شرارت ہے یا کچھ اور۔ مگر وہ نظر اتنی عمیق اور معنی خیز تھی کہ گویا اُسے اس میں کوئی خاص دلچسپ شے مل گئی۔ اتنے میں اسکی ماں ہلی اور وہ کچھ ادھر سے بے توجہ ہو گئی۔

اب پھر نوجوان مسافر کی نگاہ اُٹھی اور کچھ دیر تک برابر اس پر جمی رہی۔ اب تو یہ کیفیت ہوئی۔ کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر پہلو بدلنے لگی اسکی کوشش تھی کہ نوجوان کی توجہ کو بھی اپنی طرف منجذب کرے۔ وہ اپنی ماں سے اس قسم کی باتیں کرنے لگی کہ شاید یہ نوجوان فلاں جگہ کے رہنے والے ہیں۔ اس قسم کی باتوں سے وہ انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی گو یہ لڑکی کچھ زیادہ حسین نہ تھی۔ مگر اس کی دوشیزگی اور شباب کی تازگی میں جادو کی سی تاثیریں کام کر رہی تھیں۔ ہمارا ہیرو ایک مضبوط خیال کا آدمی تھا جس کی طبیعت میں نوجوانوں کی سی عجوبہ پسندی کے علاوہ افسانہ سے بھی دلچسپی پائی جاتی تھی۔ اس لئے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ آتشِ جذبات نے اسکے تخیل کو مشتعل کیا اور رشدہ شدہ وہ اسی دلچسپی میں محو ہو گیا۔

اب دوسرا اسٹیشن پہنچ گیا۔ دونوں ساتھی گنے لائے۔ اور انہیں چوسنے لگے۔ لڑکی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی باہر کی طرف دیکھتے تھے اور کسی قدر گردن بھی باہر نکالتے تھے جس سے اسکا چہرہ نظر آجاتا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اندر کی طرف کر لیا۔ بڑے دوست نے بھی اندر کی طرف گردن کر لی۔ لیکن چھوٹا نوجوان کھڑکی سے باہر ہی گنا چوستا رہا چند لمحوں کے بعد لڑکی نے پھر باہر کی طرف دیکھا۔ ٹرین سے باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ لیکن اس تاریکی کے باوجود نوجوان کو لڑکی کی اور لڑکی کو نوجوان کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ایسی سخت تاریکی تھی کہ بمشکل کسی اخبار کے سرورق سے اس کا نام پڑھا جا سکتا تھا۔ ان دونوں کی نگاہیں الفاظ سے مستغنی زبان کو پڑھ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کی نگاہوں میں نگاہ ڈالنا ایک بہت ہی دلچسپ چیز تھی دونوں کی نگاہوں میں خاموشی سے وہ کام ہو رہا تھا اور کچھ ایسی از خود رفتگی تھی

کہ لڑکی تو تقریباً یہ بھی بھول گئی تھی کہ اسے اسکی جرات ہی کیسے پیدا ہوئی۔ اور اس نے اپنا چہرہ اس وقت اندر کی طرف کیا۔ جب اچانک ایک حادثہ سے اسکی ماں نے اسے چھُوا۔ تاجدار عشق (کیوپڈ) نے اس کی معصوم روح پر اپنے تیروں کی بارش شروع کردی۔ اور ادھر نوجوان بھی اسکے حملے سے یقیناً زخمی تھا

اب اگرچہ وہ کھڑکی سے باہر نہیں دیکھ رہے تھے مگر ہر ایک ممکن موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرے کی نگاہ کو دیکھتے تھے۔ لڑکی اپنی ماں کی طرف جو نوجوان مسافر کے پاس بیٹھی تھی کسی قدر جھک گئی۔ مگر دوسری طرف کیونکہ درمیانی تختہ نے بنچوں کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ اور جب لڑکی ادھر جھکی تو روشنی اسکے چہرے پر پڑی۔ جس سے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ نوجوان بھی اس کی طرف پھر گیا کہ اس وقت دونوں نے ایک دوسرے کی نگاہ میں جذبات "شوق" کا راز پڑھ لیا۔

نوجوان مسافر نے کھڑکی میں سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دوست سے کہا کہ ازراہِ مہربانی وہ اسکے لطف کو کرکرا نہ کرے۔ دو پر شوق نگاہوں کا ملنا؟ آپس میں دیر تک ایک دوسرے کو دیکھنا۔ نگاہ جما کر دیکھنا! دو روحوں میں پیدا ہونے والی محبت کے خیال کو نشو ونما دیتا ہے۔ نوجوان تو اب تقریباً بخار کی سی حالت میں تھا۔ اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کے اندر کرلیا اور اپنے دوست سے پنسل اور کاغذ کا ٹکڑا مانگا۔ جب اس نے کاغذ دیدیا تو اس کے دل میں وہ کیفیات پیدا ہوگئی تھیں جن کے سامنے یہ بے بس ہوکر رہ گیا اس نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنا پتہ اسپر لکھدیا اور اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ لیکن پھر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کاغذ دینے سے پہلے کوئی اور چیز دینا ضروری ہے۔ آہ اب اسکو اپنی جیب پر اس لئے غصہ آیا کہ اس میں کوئی رومال نہ تھا اور ہاتھ پر اس لئے کہ اس میں کوئی سکہ یا کوئی نوٹ نہ تھا۔ ہاں اس کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی اسے اس کا خیال آیا۔ مگر چونکہ گھڑی کا چھپانا اس لڑکی کے لئے بہت مشکل تھا اس لئے اس نے خیال کیا کہ اسکی نقرئی زنجیر پیش کرنی چاہئیے "آہ" چھپانے کا خیال اس سے تو پاکیزہ تمناؤں میں تکدر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جس طرح کہ انسان کی سفلی خواہشیں محبت کو گدلا کردیتی ہیں اور اسکو ہوس کی پستیوں میں گرادیتی ہیں۔

وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ نوجوان بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے زنجیر کو ہاتھ میں لیکر ادھر اُدھر ہلایا۔ زنجیر کی حرکت سے ہلکی ہلکی آواز آتی تھی۔ ابتداء میں تو لڑکی ادھر سے کچھ بے پروا معلوم ہوئی۔ آخر متواتر اشاروں نے کام کیا اور لڑکی نے اسکی طرف آہستگی سے اپنا بازو بڑھایا۔ لیکن دونوں

کے بازو ایک دوسرے تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان دو بڑی بڑی کھڑکیاں حائل تھیں۔ اس لئے ان میں کسی قدر جدائی تھی اس سے دونوں کے دلوں پر نا امیدی چھا گئی۔ لیکن محبت تو انتہا درجہ کی ہوشیار اور حد سے زیادہ ذوالفنون ہے۔

درمیانی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اکتوبر کا مہینہ تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی نے پہلے اپنی کھڑکی بند کر دی اور جب کہ اس کے بعد دوسری بھی بند کر دی گئی۔ نوجوان مایوسی اور حیرت کی حالت میں تھا۔ غالباً اسکا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی کامل توجہ" پر کچھ خفا تھا۔ کھڑکیاں بند کرنے کے بعد گاڑی کے رُکنے تک وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔ اور پھر اس نے کھڑکی کھول دی۔ اپنی کھڑکی نہیں۔ اسکو چھوڑ کر دوسری اور باہر دیکھنے لگی۔ اگرچہ اپنی کھڑکی کی بجائے دوسری میں سے باہر دیکھنا تکلیف دہ ضرور تھا۔
گاڑی چل پڑی سٹیشن گذر گیا۔ اور ٹرین نے چھائی ہوئی تاریکیوں میں سے گذرنا شروع کیا۔ نوجوان نے باہر دیکھا اور اسکی طرف اپنا ہاتھ پھیلایا۔ لڑکی نے اپنا۔ لیکن اب بھی فاصلہ باقی تھا۔ نوجوان مایوس ہو کر گاڑی کی دیوار سے چمٹ گیا جتنا کہ اس سے ممکن تھا۔ اور پھر اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور اب اسکی انگلیوں کو اسکی اُنگلیاں چھُو گئیں۔ اس چھونے میں ایک برق تھی جو نوجوان کے تمام جسم میں دفعتہً دوڑ گئی۔ اس نے زنجیر دی اور اس لڑکی نے پکڑ لی۔ لیکن اسکے چھوڑنے کے لئے بڑی ہمت درکار تھی ہزاروں اندیشے۔ شکوک۔ خیالی بھوت اور خوفناک خیالات نے اسے متذبذب کر دیا۔ اب وہ زنجیر نہیں چھوڑتا تھا۔ اسکی ماں بھی وہاں موجود تھی اسے ڈر تھا کہ وہ اسکو دکھا دیگی۔ لڑکی زور زور سے اسے کھینچتی رہی یہانتک کہ جب لڑکی نے چھوڑا تو زنجیر کی کڑیاں کھُل گئیں۔ ایک مرد کو اس سے زیادہ رنجیدہ شرمندگی نہیں ہو سکتی جس قدر اس نوجوان کو ہوئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ باغِ ارم کی مسرتیں اسے میسر تھیں مگر اس نے بے پروائی سے انکو کھو دیا۔ لڑکی نے اپنا چہرہ اندر کر لیا۔
چند منٹ کے توقف کے بعد نوجوان نے پھر اسکے چہرہ کی طرف دیکھا اور ایک پر اعتماد نظر کے ساتھ اس سے چاہا کہ وہ پھر گاڑی کے باہر کی طرف دیکھے۔ تاریکی میں دونوں کے ہاتھ پھر اپنے پر اسرار کام میں مشغول تھے۔ اب اس نے زنجیر کو چھوڑ دیا۔ زنجیر کو چھوڑتے ہی منہ اندر کر کے لیٹ کر چھپا لیا۔ افسوس اب پھر چھپانے کا ناپاک خیال آ گیا۔ لیکن اس نے آہستہ سے کمرہ میں

دوسری طرف جو کچھ ہو رہا تھا اسے دیکھا۔ اسے لڑکی کی ایک نگاہ پھر کھڑکی کی طرف بلاتی معلوم ہوئی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ بھی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی! اسکا ہاتھ نوجوان کے ہاتھ کو آگے طلب کر رہا تھا۔ اور بدلے میں پیش کئے ہوئے تحفہ کی پر مسرت قبولیت لیکن یہ تحفہ اسکی اپنی ہی زنجیر تھی۔ نوجوان کے جذبات پر اوس سی پڑ گئی۔ اس نے ہر چند کئی دفعہ اس زنجیر کو ہلایا۔ مگر لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کر دیا۔ اس سے نوجوان مسافر کی رُوح کو کس قدر مایوسی ہوئی اس کا کچھ اندازہ نہ پوچھیئے۔ مگر ایک تسلی بخش خیال اس کے دل میں آیا کہ وہ اس لئے زنجیر کے لینے سے انکار کرتی ہے کہ اس کا چھپانا ایک مشکل امر ہے۔ اور جب دوبارہ وہ دونوں باہر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے کاغذ کے پُرزے کو ہلانا شروع کیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس تمنا کے ساتھ کہ وہ اس کو قبول کرے۔ لڑکی نے اثباتی طریق پر سر ہلایا۔ اب کاغذ دینے کے لئے بھی تو اُسے تمام ہمت درکار تھی۔ اس کاغذ پر اس کا نام اور اس کا پتہ اسی کے قلم سے لکھا ہُوا تھا۔ یہ کاغذ بھی ایک یادگارِ وقت چیز تھا۔ نوجوان نے اپنا بازو اسکی طرف بڑھایا اور کاغذ کو اسکی انگلیاں چھوتی ہوئی محسوس ہُوئیں۔ پھر مخالف خیالات اور مبہم اندیشے اسکے دل میں لرزہ پیدا کرنے لگے۔ اور اس نے کاغذ سمیت اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ پشیمانی نے جوش خیالات کے ساتھ ساتھ اسے پھر ابھار دیا کہ وہ پھر جرأت کرے نوجوان کے پہلے تذبذب سے لڑکی کو کچھ تکلیف ضرور ہوئی تھی۔ مگر اب اس کے تھوڑی دیر اپنے ہاتھ کو حرکت نہ دینے سے اس کے تمام تذبذب دُور ہو گئے۔ چنانچہ اب دونوں ہاتھ تاریکی میں پھر مل گئے اور کاغذ کا ٹکڑا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چلا گیا۔ نوجوان کی زندگی میں یہ لمحہ کیسا تھا۔ اس کے بعد اس کے دل میں کیا کیا کیفیات تھیں۔ کسی قلم کی طاقت تو ہے نہیں کہ بیان کرے۔

اسے اپنے چہرے میں عجیب تغیر معلوم ہوتا تھا اور وہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ پہلا ہی چہرہ ہے اپنا ہاتھ اس پر پھیرتا تھا۔ غالباً لڑکی بھی کچھ اسی قسم کی حالت محسوس کر رہی تھی۔ وہ بلند آواز سے بولنے لگی۔ اور اس کی آواز میں کچھ تعجب خیز بات تھی۔ کہ جس سے وہ بھی اس شک میں مبتلا تھی کہ کیا یہ آواز اسی کی ہے۔ وہ بلند آواز سے اس لئے بول رہی تھی کہ اسکے چہرے کی کیفیت پوشیدہ ہو جائے نوجوان لیٹ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ابھی تک وہ لیٹا ہُوا تھا۔ وہ ایسی تکلیف میں لیٹا ہُوا تھا جیسا کہ کوئی چٹان پر پڑا ہوا۔ اسے اپنا چہرہ جلتا ہُوا سا معلوم ہُوا۔ لڑکی کے

بہ آواز بلند بولنے سے اس کے دل میں عجیب قسم کا خوف پیدا ہوگیا۔ دو افسروں کے متعلق جنکو یہ کسی قدر دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ جاسوس ہیں جو اسے برباد کر دینگے۔ اس نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ اُٹھے اور دیکھے کہ کیا ہُوا +

یہ اسی حالت میں لیٹا رہا مگر کتنی دیر؟ اسکو نہیں معلوم لیکن جب یہ اٹھا بالکل خاموشی تھی اور کسی قسم کا جوش کمرے میں نہ تھا۔ اب اس نے لڑکی کو پھر دیکھنے کی جرات کی۔ لڑکی کی حالت عجیب تھی۔ اس کا چہرہ مُرجھائے ہوئے پھول کے مانند اداس تھا اور اس کا دل بھرا ہُوا تھا۔ کیونکہ جب گاڑی ٹھہری تو وہ پاس سے گذرنے والی گاڑی کے کمروں کے متعلق بات کر رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کے زانو پر سر رکھدیا اور لیٹے ہوئے نیچے کو دب گئی۔ نوجوان کے پہلو میں ایک شریف دل تھا۔ اور اُس نے بھی اپنے دل میں اُسکی تکلیف کا احساس کیا۔ اور کڑھنے لگا۔ لڑکی کی بیچارگی نے اس پر اثر کیا اور اسکو اس سے ایسی ہی ہمدردی ہوگئی جیسی کسی کو ایسے بیمار بچّہ سے ہوتی ہے جو اکیلا چھوڑ دیا گیا ہو +

وہ بھی لیٹ گیا۔ لیکن یہ حالت نہ نیند کی تھی نہ بیداری کی۔ اسکو بیداری خواب معلوم ہوتی تھی اور خواب بیداری۔ آخر وہ اُٹھ بیٹھا۔ لڑکی اسی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ وہ سوئی ہوئی ہے لیکن چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اب وہ بھی اُٹھ بیٹھی اور اپنے گوشہ میں خاموش بیٹھ گئی۔ سٹیشن آگیا۔ اسکے بھائی کھڑکی کے پاس جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لڑکی کو موقعہ مل گیا کہ بھائیوں کی جگہ پر قبضہ کرلے۔ چنانچہ گئی اور شال سے اپنا منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ایک ہی بنچ تھی جو لکڑی کی دیوار نے دو حصّوں میں تقسیم کر دی تھی۔ یا دو بنچیں اس طرح ملی ہُوئی تھیں کہ ان کا پشتہ ایک ہی تھا۔ وہ ایک طرف لیٹ گئی اور دوسری طرف وہ لیٹ گیا +

دونوں ایسی حالت میں دوسرے بڑے سٹیشن کے آنے تک لیٹے رہے۔ پھر لڑکی اُٹھ کر وہیں بیٹھ گئی جہاں لیٹی ہُوئی تھی۔ اور ہمارے لیٹے ہُوئے ہیرو کی طرف دیکھنے لگی اور وہ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ ایک عجیب قسم کی روشنی لڑکی کی آنکھوں میں چمک رہی تھی اور اس کے چہرے پر کچھ اور ہی قسم کے جذبات پائے جاتے تھے۔ گویا وہ اپنے گردو پیش کو بھلائے بیٹھی ہے کیونکہ اس نے اپنی ماں کو بھی نہ دیکھا تھا جو اپنی منزلِ مقصود کے قریب پہنچنے کے باعث اپنی جگہ سے

اُٹھ کر اُس پر جھکی ہوئی تھی۔ اور اس نے اپنا ہاتھ اس تختہ پر رکھا ہوا تھا جس نے ان دونوں کو جدا کر رکھا تھا۔
جدائی کی گھڑی جس قدر قریب ہوتی جا رہی تھی لڑکی کی حالت خراب سے خراب تر ہو رہی تھی۔ اس نے کئی دفعہ بیچ پر اپنا رومال ڈالدینا چاہا۔ مگر پوشیدگی کے ہر موقع سے کام لینے کے باوجود وہ ناکام رہی۔ اس کا دل قابو سے نکلا جارہا تھا۔ اور ادھر نوجوان کا قلب گداز ہو گیا تھا۔ نوجوان نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلی کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر ہلایا جس سے وہ یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ اگر وہ کاغذ پر کچھ لکھ سکتی ہے تو لکھ دے۔ دامِ محبت کی اس نوگرفتار نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔ اوپر کے بیان سے نوجوان کی حالت کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا۔ کیونکہ وہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور ایک آنسو لڑکی کی آنکھوں سے ٹپک پڑا۔
سٹیشن آگیا۔ لڑکی اور اس کی والدہ وغیرہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمارے دوست نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اس کا اسباب بھی اپنے اسباب کے ساتھ رکھے۔ کیونکہ اُن کو بھی گاڑی بدلنا تھی اور وہ لڑکی کے پیچھے جائیگا۔ وہ پلیٹ فارم پر اس کے پاس سے ہو کر آگے نکل گیا۔ اور بک سٹال پر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ اس کو پاس سے گذرتے ہوئے دیکھ سکے۔ پلیٹ فارم کی روشنی اور اس ازدحام میں اسے وہ بہت ہی حسین معلوم ہوتی تھی۔ وہ پھر انکے پیچھے ہو لیا۔ اور جبتک وہ انکے پیچھے رہا لڑکی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ اور اسی لئے وہ اپنے ہمراہیوں سے پیچھے رہ گئی۔ لیکن وہ جلدی ہی پھر ان سے آگے نکل گیا۔ تاکہ اس کو اپنے سامنے سے جاتے ہوئے دیکھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باہر کی تازہ ہوا نے ان کی شکلوں کو روشن اور روحوں کو تازہ کر دیا ہے۔ دروازہ پاس ہی تھا۔ لوگوں کا ازدحام بھی بہت تھا۔ اب انکے لئے کوئی موقع نہ تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔ اس لئے لڑکی نے "الوداع" کہی نوجوان کے لئے یہ "الوداع" ایسی ہی تھی کہ ممکن ہے وہ اپنی عمر میں اور سب کچھ بھول جائے۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ اسکو بھولے۔ لڑکی کے ہاتھ شال کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ تاہم اس نے دائیں ہاتھ کو اسی طرح لپیٹے ہوئے سلام کے لئے کسی قدر اونچا کیا۔ یہ بات گویا ایک جھلک تھی یا ایک اشارہ جس کی تشریح نہیں ہو سکتی کیونکہ موقع اس قسم کا تھا لیکن باوصف اس کے کہ لڑکی کے ہاتھ چھپے ہوئے تھے۔ اور شال کی تہوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ پھر بھی اس کی شانِ دلفریبی دوبالا ہو گئی۔ جس نے نوجوان کے دل پر

ایک مستقل اثر پیدا کر دیا۔

سفر کے بعد ہمارا نوجوان دوست اپنے کمرے میں بیتابی اور بے آرامی کی حالت میں پڑا تھا وہ پورے طور سے کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ مگر ایک مایوس کن بوجھ اس کے دل پر موجود تھا۔ کبھی سنجیدگی سے اس نے ان امور میں داخل ہونے کی کوشش نہ کی تھی۔ مگر وہ اچانک اس میں مبتلا ہو گیا اور اب یہ بات اسکے لئے بہت اہم تھی۔ اسے ایک معصوم روح کو مبتلاءِ آزار کرنے پر خود بھی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ چند روز مغموم بھی رہا۔ اسکو یہ بھی امید نہ تھی کہ وہ اس لڑکی کے متعلق کبھی کچھ سُنیگا لیکن وہ اس بات کے لئے بہت فکرمند تھا کہ وہ کس قدر دور چلی گئی ہے۔ دن رات دو تصویریں اسے گھیرے رہتی تھیں۔ ایک گاڑی کی مورت جس کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔ دوسری پلیٹ فارم پر چلتی ہوئی مورت جبکہ اس نے مختصر طور پر الوداع کا لفظ کہا تھا۔ چاندی کی ٹوٹی ہوئی زنجیر اس سارے واقعہ کی یادگار کے طور پر میز پر پڑی تھی اور گھڑی کی ٹک ٹک اسے اپنے اوپر ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں یہ کہہ چکا ہوں کہ وہ ایک شریف اور سادہ روح تھی۔ لڑکی "محبت" اور "تخیل" میں امتیاز نہ کر سکتی تھی۔ نوجوان بھی اسکے لئے سنجیدہ خیال اپنے دل میں رکھتا تھا۔ بالآخر وہ ہفتہ بھر تک اسی طرح بخار کی سی حالت میں مبتلا رہا۔

تخیل عشق کا چھوٹا بھائی ان دونوں کے لئے ہلکا پھلکا پیام رساں تھا۔ یہ گذرتا ہوا بادل ہے۔ وہ بادل نہیں۔ جو برستا ہے۔ بلکہ وہ سفید کہر کا لکّہ جو آفتاب کے چہرہ پر چھا جاتا ہے لیکن تاریکی پیدا نہیں کرتا۔ یہ اس لہر کے مانند ہے جو جھیل میں ہوتی ہے اس طوفان کی طرح نہیں جو تہ تک کو ہلا دے۔ یہ روشنی کی جھلک ہے۔ جس میں تیزی نہ ہو۔ یہ اُڑتی ہوئی آگ کی چمک ہے۔ مگر چراغ کی روشنی سے زیادہ خوبصورت یہ چاندنی کا روانِ دواں بادلوں میں سے جھانکتا ہے۔ یہ نسیم سحر ہے۔ جو راحت بخشتی ہے۔ مگر ماحول میں تہیج پیدا نہیں کرتی۔ یہ اس تصویر کے مانند ہے جو چلتے ہوئے بادل کی جھیل میں قائم ہو جاتی ہے مگر دیرپا نہیں ہوتی۔ یہ ایک دلکش مگر آواز سے بے نیاز گفتگو ہے جو دل کو لگتی ہے لیکن اس پر قبضہ نہیں کر لیتی۔

نوجوان ایک سال بعد رات کے وقت اپنے بستر پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ فکر و حیرانی اس کے

دلچسپ تجربہ کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو رہی تھی۔ بلکہ باوجود اس زنجیر کے سینہ پر ہمیشہ آویزاں رہنے کے اس لڑکی کی یاد اب فقط کبھی کبھی آتی تھی اس نے نوجوان لڑکی کے متعلق پھر کبھی کچھ نہیں سنا تھا۔ اور لڑکی کے متعلق یہ خیال کرنے میں غلطی پر نہ تھا کہ وہ بھی اس واقعہ کو بچپن کی لوریوں کی طرح بھول گئی ہوگی۔ گو یہ تو صحیح نہیں کہ وہ اس واقعہ کو بھی سرے سے بھول گئی ہوگی ایسا تو کم ہی ہوتا ہے ؀

غرض ہمارا دوست بستر پر لیٹا ہؤا سوچ رہا تھا۔ اس واقعہ کے متعلق نہیں اور امور کے متعلق چودھویں کا چاند سر پر تھا۔ تمام عالم بقعۂ نور بنا ہؤا تھا۔ سب چیزیں نور میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اسی طرح جیسا کہ اس موقع پر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ وہ اپنا بازو اپنے سر کے نیچے دھرے ہوئے لیٹا تھا۔ جب اس نے پہلو بدلا تو اسکی کلائی پر زنجیر کا نشان اور کچھ چبھن تھی۔ اسکی دماغی قوتیں رات کی طرح خاموش اور نچلی تھیں۔ مگر اب وہ یونہی سا چونکا۔ بہت مدت کے بعد اسکو کچھ دھندلی سی یاد آئی۔ لیکن اسکے دل میں فکر کی دھڑکن نہ پیدا ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہؤا۔ کیونکہ اسکے دل میں اُلجھن سی پیدا ہوئی۔ اور اس چاندنی میں باہر چلا گیا۔ سردی کا موسم اور اکتوبر ہی کا مہینہ تھا۔ وہ چلتا گیا بالآخر ایک کنوئیں پر ٹھہر گیا جو اس کے مکان سے زیادہ دور نہ تھا۔ کنوئیں پر درختوں اور ٹین کی چھت کا سایہ تھا وہ درخت کے پتوں میں سے چھنتی ہوئی چاندنی اور سایہ میں کھڑا ہو گیا اور اپنی کلائی سے وہ زنجیر اتاری۔ وہ کنوئیں کے کنارے پر بیٹھ گیا اور زنجیر کو ہمیشہ کے لئے کنوئیں کی تاریکی میں پھینک دیا۔ وہ دیکھتا اور سنتا رہا جبتک کہ اندر سے اسکے جھنکار کی آواز آتی رہی۔ جیسا کہ پہلے گاڑی کے باہر آتی تھی۔ اور وہ زنجیر جسکو لڑکی نے چھُوا تھا۔ اور جسے نوجوان سونے کی زنجیر سے بدل نہ سکتا تھا اور جسے ہزاروں روپیہ میں اس نے نہ بیچا تھا۔ جیسا کہ اکثر وہ کہا کرتا تھا اب غائب ہو گئی تھی ؀

(ترجمہ) "سروش"

جوشِ رقابت

تمہیں تو پھول پھول ہے مجھے تو ایک خار ہے
کہ پھول تم میں بس رہا ہے مجھ کو ناگوار ہے

تمہیں ہے پھول چاندنی مجھے تو ایک بار ہے
کہ چاند تم کو دیکھتا ہے مجھ کو ناگوار ہے

یہ جلوۂ جمال سے جو غیر ہمکنار ہے
یہ کیوں مقابل آئنہ ہے مجھ کو ناگوار ہے

رہِ تلاشِ جستجو میں خلق میرے ساتھ ہے
جہان تمکو ڈھونڈتا ہے مجھ کو ناگوار ہے

جہان ہے کہ شیفتہ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو
جہان ہے کہ مبتلا ہے مجھ کو ناگوار ہے

ہے مدعا خلوص کا یگانگی۔ دوئی نہیں
یونہیں جو نقشِ ماسوئی ہے مجھ کو ناگوار ہے

یہ عشق کی رقابتیں ہیں عشق کے خیال ہیں
یہ عشق کے خیال کیا ہیں پرتوِ جمال ہیں

گویا جہاں آبادی

جذباتِ عاقل

ہمنشیں عکس اُس میں ہے از بسکہ چشمِ یار کا
میں ہوں سودائی ازل سے نرگسِ بیمار کا

خوف کھا کر تھام لیتے ہیں ملائک عرش کو
جب دھواں اُٹھتا ہے دل سے آہِ آتشبار کا

انتظارِ یار میں آآ کے پھر جاتی ہے نیند
وعدہ کرتے ہیں وہ جس دن خواب میں دیدار کا

لب تک آنیکے لئے ساغر اِدھر ہے بیقرار
مے اچھلتی ہے اُدھر مُنہ چوم لے میخوار کا

شاعری کہتے ہو تم جسکو غذائے رُوح ہے
خوب یہ نسخہ ہے دل کے درد کا آزار کا

بعدِ مُردن بھی رہیں تربت میں آنکھیں وا تری
کچھ ٹھکانا بھی ہے عاقل حسرتِ دیدار کا

کیشو داس عاقل

اسرار

ایک روز بعد از دوپہر میں قہوہ خانہ "ڈی لاپیکس" کے باہر بیٹھا ہُوا پیرس کی زندگی کی دلچسپیوں اور قباحتوں کے متعلق سوچ رہا تھا، کہ کسی نے میرا نام لیکر میری دنیائے محویت کو برباد کر دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ لارڈ مرچن تھا۔ کالج سے نکل کر دس سال کا عرصہ گزرتا تھا کہ ہمیں پھر ملنے کا اتفاق نہ ہُوا۔ میں نے دفورِ محبت کے ساتھ اُس سے مصافحہ کیا۔ آکسفورڈ کے قیام کے زمانہ میں وہ میرا ایک گہرا دوست تھا۔ مجھے اُس سے بیحد محبت تھی، وہ حسین تھا، اور صاحبِ اعزاز تھا۔ اسکے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ایک کامیاب انسان ہوگا۔ اب اسکی کایا پلٹ چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب افسردہ دل اور پریشان سا ہے۔ جسے دیکھ کر مجھے کچھ اور گمان گزرا، میں نے پوچھا "کیوں شادی کر لی ہے نا"

"افسوس کہ میں آجتک عورت کی ماہیت اور حقیقت بھی نہ سمجھ سکا"

میں نے پھر کہا کہ "گرلیڈ! عورت کی تخلیق محض محبت کرنیکے لئے کیگئی ہے نہ کہ اسکی ماہیت سمجھنے کے لئے"

"مجھے جبتک اعتماد حاصل نہ ہولے میں کسی نوع سے قطعی طور پر محبت نہیں کر سکتا"

میں نے کہا کہ "گرلیڈ! تمہاری زندگی پُراسرار معلوم ہوتی ہے، میں تمہاری مفصل سرگزشت سننا چاہتا ہوں"

"آؤ نا ذرا سیر کو چلیں! ایسے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ زرد گاڑی نہ ہو، بلکہ وہ شوخ رنگ والی سُرخ گاڑی لائیں"

چند لمحوں کے بعد ہم "مڈیلین" کے راستہ پر پہنچے۔ میں نے پوچھا کہ "تم کہاں جانا چاہتے ہو"

"کہیں نہیں! باٹس ہوٹل چلیں، تاکہ وہاں کچھ کھا پی کر آپ کی بپتا سُن سکوں"

میں نے بے صبری کے لہجہ میں جواب دیا کہ "نہیں جناب! پہلے میں آپکا پُراسرار افسانہ سُننا چاہتا ہوں"

پھر اس نے جیب سے ایک روپہلی ڈبیا نکالی، اور میرے ہاتھ کے قریب کر دی۔ جسے میں نے لیکر کھولا تو اس میں ایک سرو قد طناز عورت کی تصویر تھی۔ جو لمبے لمبے بالوں کے ساتھ سمور لپیٹے ہُوئے تھی۔

"کیوں اس چہرے سے اعتماد اور سادہ لوحی برس رہی ہے یا نہیں؟"

میں نے ایک پُر معنی نگاہ ڈال کر جواب دیا کہ "معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخصیت پراسرار ہے لیکن یہ امتیاز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اسرار بُرا ہے یا بھلا۔ آتم ودیا سے معلوم ہوتا ہے کہ حُسن اثر رے چکا ہے لیکن یہ تبسم جو ہونٹوں پر ہے ہر قسم کی آلائیشوں سے پاک ہے۔ ذرا کھل کر سرگذشت بیان کیجئیگا"

"ابھی وقت نہیں آیا۔ کھانے پینے کے بعد"

پھر ہمارا موضوع یکسر بدل گیا۔ خدمتگار کافی اور سگریٹ لایا۔ میں نے گرلیڈ کو وعدہ کی یاددہانی کرائی، وہ اُٹھا اور آرام کرسی میں بیٹھ کر اُس نے یہ کہانی سُنائی +

ایک شام کو پانچ بجے میں "بانڈ سٹریٹ" سے گزر رہا تھا کہ دو گاڑیوں میں تصادم ہُوا۔ ایک زرد گاڑی سنگین صوفے کے قریب رُکی، جس نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کرلی۔ میں نے جھانک کر دیکھا، تو یہ صورت جسے آپ دیکھ چکے ہیں نظر آئی۔ میرا دوچار ہونا، ایک قیامت تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا مجھ پر کیا گزر گئی۔ گاڑی چلی گئی لیکن دن بھر اس کا خیال میرے دل میں نقش رہا، میں نے ہر گزرنے والی گاڑی میں تجسّس و تفحص کی نظریں ڈالیں اس اُمید سے کہ شاید وہ کہیں نظر آجائے۔ مگر آہ! وہ کہاں؟

کئی دن گزر گئے مجھے یقین سا ہو گیا کہ یہ سب کچھ ایک خواب تھا +

کم و بیش ایک ہفتہ عشرہ کے بعد میں آٹھ بجے مادام دار شیل کے ساتھ ڈنر کھا رہا تھا کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھٹ سے کھلا، اور نوکر نے لیڈی لرو کے آنے کی اطلاع کی +

آہ! یہ وہی صورت تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہ ہولے ہولے چاند کی سیمیں کرنوں کے مانند کمرہ میں داخل ہوئی آتے ہی میں نے اُسے کھانے کی دعوت دی، اور کہا کہ "لیڈی لرو مجھے یاد آتا ہے کہ میں آپ سے "بانڈ سٹریٹ" میں دوچار ہُوا تھا"

یہ سُنتے ہی وہ اداس سی ہو گئی اور مدھم آواز میں بولی کہ "جی ہاں! ذرا آہستہ آہستہ بات چیت کیجئیگا مبادا کوئی سُن پائے"

میں اس بڑے آغاز سے دلشکستہ ہو گیا، میں نے اپنا موضوع یکسر بدل کر فرانسیسی ڈراموں کی بابت سلسلۂ گفتگو چھیڑا۔ پھر بھی وہ اُسی مدھم اور رسیلی آواز میں بولتی رہی، جس سے معلوم ہوتا کہ اسے اس بات کی فکر ہے، کہ مبادا ہماری یہ باہمی گفتگو کوئی سُن رہا ہو +

میں یہ دیکھ کر مجسمۂ وہم و گمان بن گیا کہ آخر یہ کیا اسرار ہو گا۔ آہ! کچھ نہ پوچھو میری محبت نے دیکھتے

دیکھتے ابتدائی منزلیں طے کرلیں، اب میں دیوانہ ہوچکا تھا۔ وہ ڈنر کے بعد جانے لگی تو میں نے دوبارہ ملنے کے لئے درخواست کی اس نے جھجک کر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں، اور جواب دیا کہ "کل سوا پانچ بجے پھر ملینگے"۔

میں نے مادام دارشیل سے اس کے حالات دریافت کئے۔ جس سے اتنا اور صرف اتنا معلوم ہُوا کہ وہ ایک بیوہ ہے جو پارک لین میں رہتی ہے۔ صبح میں ٹھیک وقت پر پارک لین پہنچا، لیکن خانساماں نے دریافت کرنے پر کہا کہ لیڈی الرواکیس باہر چلی گئی ہیں۔ میں یہ روح فرسا خبر سُننے کے بعد کلب پہنچا، جہاں اسے ایک خط لکھا کہ وہ مجھ سے کب مل سکیگی۔ جس کا کئی دن کے بعد جواب آیا۔ کہ میں اتوار کو چار بجے مکان پر موجود رہونگی، آپ آکر مجھ سے مل جائیں۔ ساتھ ہی لکھا تھا کہ آئندہ اس پتے پر خط وکتابت نہ کیجئیگا، اصلی پتہ بوقتِ ملاقات بیان کرونگی+

میں حسبِ وعدہ اُس سے اتوار کے دن ملا رخصت کے وقت اس نے پھر التجا کی آئندہ بعض وجوہ کی بنا پر اس پتہ سے خط وکتابت کیجئیگا،

مسز ناکسی

بہ وساطت

وہائیکرز لائبریری، گرین سٹریٹ"،

یہ سُن کر میں دُنیائے حسرت میں کھو گیا کہ ہو نہ ہو وہ کسی کے بس میں ہے۔ لیکن رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اتنی رسائی کیسے میسر آسکتی ہے۔ اب کسی نتیجہ پر میرا پہنچنا قطعی طور پر محال سا ہوگیا۔ میری حالت بعینہٖ اس عجائب گھر کے بلور کی مانند تھی۔ جو کبھی تو صاف دکھائی دیتا ہے، اور کبھی دھندلا سا ہو جاتا ہے۔ میں نے تنگ آکر مصمم ارادہ کیا کہ اسے شادی کے لئے کہوں، آخر اُسے ایک خط لائبریری کے پتے سے لکھا کہ میں دوشنبہ کو چھ بجے آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ جس کا جواب ملا کہ میں دلی شکریہ کے ساتھ آپکا خیر مقدم کرتی ہوں

اسی روز مجھے اپنے چچا کے ہاں عصرہ کرنا تھا۔ کوئی چار بجے میری لیبرن روڈ" پر پہنچا، آپ جانتے ہیں کہ میرا چچا "ریجنٹ پارک" میں رہتا ہے میں وہاں سے راستہ قطع کرکے پیچ در پیچ کوچوں سے گزر رہا تھا کہ ایک تنگ کوچہ میں میری نظر لیڈی الرو پر پڑی، جو خیالات کی دنیا پہلو میں لئے سرعت کے ساتھ قدم اُٹھا رہی تھی، آخر وہ رُکی، اور ایک مکان کے اندر داخل ہُوئی۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا کہ ہو نہ ہو یہی اسکی خلوت گاہِ راز ہے۔ میں بے اختیار ہوکر اس عقدہ کو حل کرنیکے لئے۔ ہاں اس اسرار کی ماہیت سمجھنے کے لئے مکان کے اندر پہنچا۔ جہاں جاکر

معلوم ہوا کہ یہ کوئی سرائے ہے۔ دروازہ پر لیڈی الرد کا رومال پڑا تھا، جسے میں نے اُٹھا لیا۔ قریب تھا کہ مکان کے اندر داخل ہو جاؤں لیکن، پھر خیال آیا کہ مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ اندر جا کر جاسوسی کروں۔ پھر وہاں سے بغیر کسی قسم کی ٹوہ لئے کلب پہنچا۔ جب وعدہ چھ بجے میں اسکے ہاں گیا تو وہ صوفے پر دراز تھی اُٹھی اور میرا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ میں نے وہ رومال جیب سے نکالکر اُسے دینے کو بڑھایا، اور نہایت ہی صبر و سکون کے لہجہ میں کہا کہ آپ اسے "کومرا سٹریٹ" میں گرا آئی تھیں"۔

اُس نے مرتعش ہو کر میری جانب دیکھا لیکن رومال لینے کو ہاتھ نہ بڑھایا۔

میں نے پوچھا کہ "آپ وہاں کس غرض سے گئی تھیں"۔

"آپکو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ آپ مجھ سے اس نوع کا سوال کر سکیں"۔

میں نے جوابدیا کہ "ایک محبت کرنیوالے کو اتنا استحقاق ضرور حاصل ہے۔ میں آپ سے شادی کے متعلق کچھ کہنے سُننے آیا تھا" اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے بے صبر ہو کر پوچھا "مجھے بتائیگا۔ ہاں میری قسمت کا فیصلہ جلد سنائیے"۔ وہ اُٹھی اور مجھ پر نگاہیں جما دیں ——— اُف! لارڈ مرچن سے اب کچھ نہ پوچھ!!

میں نے چلا کر کہا کہ "آپ ضرور کسی سے ملا کرتی ہیں"۔ وہ غصہ سے تمتما اُٹھی اور کہا کہ میں قطعاً کسی سے نہیں ملا کرتی"۔

"کیا آپ سچ سچ اپنا قصہ نہ سنائینگی"۔

"کہہ تو دیا ہے"

خدا معلوم میں جوشِ جنوں میں کیا کیا کچھ بک گیا، پھر بغیر رخصت ہوئے وہاں سے چلا آیا۔ دوسرے روز اس نے مجھے ایک خط لکھا جسے میں نے بغیر کھولے، اور پڑھے اُسے واپس کر دیا۔ پھر میں "ایلن کلویل" کی معیّت میں ناروے چلا گیا۔ ایک ماہ کے بعد واپس آیا۔ تو آتے ہی جریدہ "مارننگ پوسٹ" میں لیڈی الرد کی وفات کی خبر پڑھی۔ لکھا تھا کہ موت انجمادِ خون کے باعث واقع ہوئی ہے میں اس جگر خراش سانحہ سے دیوانہ ہو گیا، اور ایک مدت تک اسی سوگ میں گھر کے اندر محبوس رہا۔ یہاں میں نے قطع کلام کر کے گریڈ سے پوچھا کہ "آپ پھر کبھی اُس طرف گئے ہیں"۔

"جی ہاں، ایک روز میں "کومرا سٹریٹ" پہنچا، تو بے اختیار ہو کر معاملہ کی تہ کو پہنچنے کے لئے وہ دروازہ کھٹکھٹایا ایک معزز عورت دروازے پر آئی، میں نے کرایہ کے کمرے کے متعلق پوچھا، جواب ملا کہ "صرف ڈرائنگ روم ہی کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ ہاں تین ماہ سے وہ لیڈی صاحبہ نہیں آئیں حالانکہ کچھ کرایہ انکے ذمہ واجب الادا ہے"

میں نے تصویر نکال کر دکھائی اور کہا کہ یہی لیڈی صاحبہ"

"جی ہاں، کب آئینگی؟" میں نے ایک آہِ دلدوز کے ساتھ جواب دیا کہ "ان کا انتقال ہوگیا ہے"

"نہیں جناب! خدا ایسا نہ کرے، وہ تین اشرفیاں ہفتہ وار کرایہ دیتی تھیں"

میں نے پوچھا کہ "وہ یہاں آکر کس سے ملا کرتی تھی"

اس نے سٹپٹا کر مطمئن لہجے میں بتایا کہ "آپ اُس مرنے والی عصمت مآب خاتون کو متہم نہ کریں"

میں نے کہا کہ "پھر اسے یہاں کیا کام تھا"

اس نے جواب دیا کہ "وہ یہاں آکر قہوہ، اور چائے پیا کرتی تھی" میں نے جیب سے ایک اشرفی نکال کر اُسے دی۔ یہاں لارڈ مرچن رُکا اور اس نے مستفسرانہ انداز میں مجھ سے پوچھا کہ "آپ یہ افسانہ سُن کر اس سے کیا سمجھے ہیں؟"

میں نے جواب دیا کہ "پیارے گرلیڈ! لیڈی الرو کو یہ خبط تھا کہ وہ کوئی ہیروئن ہے۔ اس جنون میں وہ کمرے کرایہ پر لیتی اور وہاں جاکر خیالات کے جال بُنتی رہتی تھی۔ کیوں یہ سچ ہے نا؟"

گرلیڈ نے جواب دیا کہ "ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو" پھر اس نے وہ ڈبیا کھولی اور تصویر دیکھ کر کہا کہ "میں متحیر ضرور ہوں"

(آسکر وائلڈ)　　　　　　　　صادق۔ ایوبی

پہل گام (کشمیر)

حُسن کے جلوے ہیں تیری وادیوں میں پہل گام
عشق کی سطوت ہے تیری چوٹیوں میں پہل گام

یاد آجاتی ہے کوئی زندگی بھُولی ہُوئی
کیسی موسیقی ہے تیرے پانیوں میں پہل گام

بھاگ کر ہنگامۂ دُنیا سے رُوحِ عافیت
ہوگئی رُوپوش تیری گھاٹیوں میں پہل گام

گُلشنِ فردوس کے نغمہ سرا رنگیں طیور
ہیں نوا پرداز تیری ڈالیوں میں پہل گام

برفِ زریں جوئے سیمیں قوسِ رنگیں حُورِ عیس
لُطفِ جنّت ہے تری رعنائیوں میں پہل گام

اِس چمن میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو جا بجا
چھُپ رہا ہے کون تیری پتّیوں میں پہل گام

خُفتگانِ خاک کو دیتی ہے پیغامِ حیات
نعرہ زن ہے برق تیری وادیوں میں پہل گام

رہ گیا تھا اک بشیرِ خستہ تن آشفتہ جاں
وہ بھی شامل ہے ترے شیدائیوں میں پہل گام

بشیر احمد

محفلِ ادب

دانتے کی شہرۂ آفاق نظم - معارف کے ایک گذشتہ شذرہ میں میڈرد یونیورسٹی کے لائق پروفیسر مسٹر آسن کی ایک کتاب کے حوالہ سے بتایا جاچکا ہے کہ اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کی مشہور نظم جس میں جنت و دوزخ وغیرہ کا سماں دکھایا گیا ہے، وہ تمامتر واقعۂ معراج نبوی سے ماخوذ ہے۔ لیکن ہمارے مغرب پسند احباب کو یہ سن کر اور زیادہ حیرت ہوگی کہ یورپ کے اس مایۂ ناز شاعر نے صرف واقعۂ معراج نبوی سے مدد نہیں لی جو کتبِ احادیث میں مذکور ہے، بلکہ اس کے تخیل و شاعری کی تمامتر بنیاد اور اس کا اصل ماخذ ایک عرب نابینا شاعر کا کلام ہے، شام کے شبلی علامہ سید کرد علی نے ۱۹۲۵ء کے مجلۃ المجمع العلمی العربی میں ایک مقالہ "عربی علم ادب اور ادبا" پر لکھا تھا، اسی مقالہ میں ابو العلاء معری کے متعلق لکھتے ہیں :-

> "اس کا رسالہ "رسالۃ الغفران" جسکو اس نے ابن قارح کے جواب میں لکھا تھا، (دونوں رسائل طبع ہو چکے ہیں) اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کے فسانہ سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری اور تخیل میں معرہ کا ایک نابینا اٹلی کے ایک ماہر فن شاعر کا رہبر ہے، اس پر یورپ کے بعض مستشرقین کے مباحث موجود ہیں کہ دانتے نے اپنے حکایاتِ الٰہیہ میں سے تین حکایتوں "جہنم" "جنت" اور "مطہرہ" کو جو ۱۳۰۰ء سے ۱۳۱۸ء تک شائع ہوئیں اور خصوصاً حکایت "دوزخ" کو معری کے رسالۃ الغفران سے اخذ کیا ہے، اور اس نے اپنی ان حکایتوں میں اپنے تمام تخیلات و تصورات اسی انداز پر قائم کئے ہیں"

دانتے عربی شاعری کا وہ باکمال متبع ہے جسکو یورپ نے اپنے یہاں ہومر کے بعد جگہ دی ہے +

(معارف)

غزل

شامِ فراق ذکرِ جوانی میں کٹ گئی ۔۔۔ کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

اب انتظار کیا ہے تجھے اے حریصِ عیش ۔۔۔ پیری بھی انتظارِ جوانی میں کٹ گئی

دلچسپ و دلفریب ہے کیا عیشِ بے ثبات ۔۔۔ دنیا کی عمر ایک کہانی میں کٹ گئی

آنکھوں کو شغلِ گریۂ ہمیشہ ہا عزیز ۔۔۔ دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

(عزیز لکھنوی) (زمانہ)

فطرت شناسی۔ جب تم ایک شخص سے گفتگو کر رہے ہو اور وہ خاموش سُن رہا ہے لیکن تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اسکی پیشانی پُر شکن ہوجاتی ہے تو سمجھ لو کہ تمہاری گفتگو اس پر دو قسم کا اثر کر رہی ہے یا تمہارے بعض فقروں سے اُسے ناگواری پیدا ہو رہی ہے اور یا تمہارے بعض فقرے وہ غور طلب سمجھتا ہے۔ اگر کوئی شخص تنہا بیٹھا ہو یا خاموش بیٹھا ہو اور اسکی پیشانی پُرشکن نظر آئے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ ضرور اس وقت کسی خاص معاملہ پر غور کر رہا ہے اور ضرور اس وقت اسکے دماغ میں کوئی اُلجھن موجود ہے اور ضرور اس وقت وہ دل میں کسی شخص پر ناخوش ہو رہا ہے اور غصہ و انتقام کی آگ اُسکے دل میں بھڑک رہی ہے۔ جب تم دیکھو کہ کسی شخص کی پیشانی پُرشکن ہے تو ایک دم اُس سے اظہار مدعا نہ کرو۔ ورنہ نتیجہ خاطر خواہ نہ ہوگا۔ اگر وقت نہ ہو تو واپس چلے جاؤ۔ اگر وقت ہو تو پہلے گھنٹہ آدھ گھنٹہ تک اسکے دماغ کو اپنے مطلب کا بناؤ۔ اسکے موجودہ جذبات و خیالات محو کردو اور جب اسکی گفتگو اور چہرے کی سادگی سے ثابت ہونے لگے کہ اسکی دماغی حالت میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے تو بتدریج اپنا مدعا ظاہر کرو۔ کامیابی یقینی ہے +

بعض لوگوں میں آنکھ مارنے کی عادت ہوتی ہے اپنی آنکھوں کو مختلف انداز سے گردش دیتے ہیں۔ آنکھ کے گوشوں کو دبا لیتے ہیں۔ باتیں کرتے کرتے زور دینے کے موقع پر آواز کے ساتھ آنکھ میں تبدیلی پیدا کرلیتے ہیں اگر مخاطب کے سوا کوئی اور شخص بھی بیٹھا ہو تو آنکھ سے اس طرح مخاطب کو اشارہ کرتے ہیں کہ اس تیسرے شخص کو خبر نہیں ہوتی اور اسکی کانی غیبت ہوجاتی ہے۔ ایسے اشخاص عموماً ناقابل اعتماد ہیں۔ مکار ہیں۔ عیار ہیں۔ دغا باز ہیں۔ غیر متدین ہیں۔ منافق ہیں۔ عیاش ہیں۔ بدچلن ہیں ناخداترس ہیں۔ چالباز ہیں۔ اگر تم کسی ایسے شخص سے ملو جس کی آنکھ میں مذکورہ بالا صفات موجود ہوں تو ہمیشہ اس سے ہوشیار رہو۔ اُسے کبھی اپنا دوست نہ سمجھو خواہ کیسے ہی زبردست تعلقات ہوں کبھی اسکی دیانت پر بھروسہ نہ کرو۔ کبھی اسکے قول کو سچا نہ سمجھو۔ کبھی اسکے وعدے کا یقین نہ کرو۔ وہ تمہارے لئے بہت دلفریب ثابت ہوگا لیکن اگر تم اُس سے تعلقات بڑھاؤ گے تو نقصان اُٹھاؤ گے اور اس پر اعتماد کرو گے تو دھوکا کھاؤ گے کیونکہ یہ معاملہ بلا استثنا صحیح ثابت ہوتا ہے اور ایسے اشخاص کے لئے اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کم و بیش ان میں ضرور پایا جاتا ہے +

(تجلی)



کھانا خود بخود پک رہا ہے۔ دیکھنا بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے

ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے برتن صندوق پہ چنے ہیں۔ تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔
ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے کسی میں آٹا۔ کسی میں چوہے۔ پھکنی اور
پانی کا لوٹا پاس ہے۔ تاکہ جب چاہے آگ جلالے۔ جب چاہے پانی ڈال کر بجھالے۔ آٹا گندھا رکھا
ہے۔ چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اُتار کر رکھے ہیں۔ دال چولھے پر چڑھی ہے۔ غرضکہ سب کام
ہو چکا ہے۔ لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے۔ تو کھانا لاکر سامنے رکھتی ہے۔
پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھا چکتا ہے تو کھانا اُٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے
ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے۔ تو کبھی سینا لے
بیٹھتی ہے۔ کبھی چرخا کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو؟ مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی
ہیں۔ آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ڈاکٹر سے علاج کرانا پڑے۔

پطرس　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　نیرنگ خیال

علم ہیئت سے تاریخ کی تحقیق۔ ہومر کے قصیدہ کی کتاب ۲۰ میں ایک جگہ آتا ہے کہ آفتاب
یکایک غائب ہوگیا اور تمام دنیا تاریک ہوگئی، اب اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اس زمانہ
میں ایسا پورا سورج گرہن پڑا تھا کہ سورج کی ایک کرن بھی چھن کر باہر نہ آسکی، اب اس نظریہ کو
پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر سکوتش نے علم ہیئت کے رُو سے یہ دریافت کر لیا ہے کہ وہ سورج گرہن ۱۶ اپریل
۱۱۷۸ ق م کو ظہر کے قبل ۱۱ بج کر ۴۱ منٹ پر واقع ہوا تھا۔

(معارف)

مصنوعی جزیرے، امریکہ کے مہندس آرمسٹرنگ نے سمندروں میں مصنوعی جزیرے قائم کرنے کا
ایک طریقہ معلوم کر لیا ہے، تاکہ ان جزیروں میں وہ ہوائی جہاز اُتر سکیں جو سمندروں کے اوپر پرواز
کرتے ہوئے گذرتے ہیں، یہ جزائر فولاد اور سمنٹ سے بنائے جائیں گے، ان کا طول ۱۲۰۰ اینچ اور
عرض ۴۰۰ اینچ تک ہوگا، اور یہ سمندر کی سطح سے ۷۰ [illegible] بلند ہونگے، اور ان کے وزن کا ۵۰ فیصدی
حصّہ پانی کے اندر ہوگا۔

معارف

تبصرہ

آئینۂ حقیقت نما ۔ مصنفہ جناب مولانا اکبر شاہ خانصاحب ایڈیٹر عبرت نجیب آباد ۔ یہ کتاب جو اسلامی ہندوستان کی تاریخ کے پہلے حصہ پر مشتمل ہے محمد بن قاسم کے وقت سے لیکر خاندان خلجی کے خاتمے تک ہندو مسلمانوں کے قدیم تعلقات کا آئینہ ہے اسکے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ کیسا منصفانہ سلوک روا رکھا۔ شروع میں ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں مفصلہ ذیل عنوانات کے تحت میں دلچسپ مباحث ہیں (۱) اسلام اور احکام جنگ (۲)۔ اخوت و مساوات و رواداری (۳)۔ اسلامی نظام حکومت (۴) غیر مسلموں کی ضروری شہادتیں (۵) ایک غلط فہمی کا ازالہ (۶) ہندوستان میں اسلام کا پہلا قدم (۷)۔ اسلام کی آمد کے وقت ہندوستان میں کونسا مذہب رائج تھا ۔ لکھائی چھپائی عمدہ ۔ قیمت فی جلد عہ ۔ ذیل کے پتے سے طلب فرمائیے:۔

مولانا اکبر شاہ خانصاحب ایڈیٹر عبرت ۔ نجیب آباد ۔

براؤننگ ۔ مترجمہ سید وقار احمد صاحب بی ۔ اے (عثمانیہ) براؤننگ انگریزی کا مشہور وقت پسند شاعر ہے وہ انسانی جذبات کی اُن گہرائیوں تک پہنچتا ہے جہاں کے رازہائے سربستہ عوام تو کجا خواص کی نظروں سے بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ سید صاحب موصوف نے براؤننگ کی شہرۂ آفاق اور گرانمایہ نظم ربی بن عذرا کا ترجمہ اردو میں خوبی سے کیا ہے اسکے لئے وہ مستحق مبارکباد ہیں یہ نظم فلسفیانہ خیالات اور انسانی جذبات کا ایک نہایت گرانقدر اور دلچسپ مرقع ہے اور اس قابل ہے کہ شائقین ادب اسکی قدر کریں لکھائی چھپائی اور کاغذ نفیس قیمت عہ رسید عبدالقادر تاجر کتب چار مینار حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

رُوحِ تنقید ۔ ابو الحسنات جناب سید غلام محی الدین صاحب زور بی ۔ اے کی یہ کتاب اسوقت تک بہت مقبول ہو چکی ہے اس میں ادب کی تنقید کے اصول نہایت جامع طور پر بیان کئے گئے ہیں ۔ تاریخ کی روشنی میں نہایت دلکش تنقیدی تبصرے اہل نظر کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف ممالک کے ادب کے ارتقاء پر نہایت باہرہ افروز روشنی ڈالی گئی ہے اردو زبان میں یہ اپنی وضع کی پہلی کتاب ہے اور شائقین ادب کو اس کی قدر کرنی چاہیئے ۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ سکہ عثمانیہ ۔ مصنف ممدوح سے نظامت منزل کنگ کوٹھی روڈ حیدرآباد دکن کے پتے سے طلب فرمائیے ۔

سب ایڈیٹر کی ضرورت

"ریاست" دہلی کیلئے ایک سب ایڈیٹر
کی ضرورت ہے۔ جو ہندی اور انگریزی
سے بے تکان ترجمہ کرنے کے علاوہ
اوریجنل لکھ سکتا ہو۔ اِس پتہ پر خط و کتابت کیجئے

دیوان سنگھ "مفتون"
ایڈیٹر "ریاست" دہلی

فہرستِ مضامین

نمبر۱۰	بابت ماہ نومبر ۱۹۲۶ء	جلد۹

تصویر:۔ گرو بابا نانک

جہاں نُما

حکومتِ جرمنی اور ملکی تجارت کی سرپرستی۔ رسالۂ ماڈرن ریویو نے امریکا کے ایک اخبار سے ذیل کا اقتباس نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمن حکومت اپنی صنعت و حرفت کی ترقی اور بے روزگاری کے علاج کیلئے غیر معمولی وسائل اختیار کر رہی ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ جرمنی کی حکومت یورپ بھر کی سب سے بڑی صاحبِ سرمایہ اور کارخانہ دار حکومت بن جائیگی۔ وہ اس طرح کہ حکومت جس جس صنعت کو مناسب سمجھیگی مدد کیلئے قرض کے طور پر بڑی بڑی رقمیں دیگی۔

اسکے علاوہ حکومت ۲,۵۰۰,۰۰۰ پاؤنڈ ریلوے کی وسعت اور مرمت وغیرہ کے لئے علیحدہ کر دیگی۔ ۷,۵۰۰,۰۰۰ پاؤنڈ کی ایک اور رقم آلات سازی کے لئے اور دس کو تجارتی سامان کی بہم رسانی کے لئے علیحدہ کی جائیگی۔

اس کے علاوہ کان کنی کے لئے بھی حکومت بہت سی آسانیاں بہم پہنچائیگی۔

تمام آزاد حکومتیں اسی طرح اپنی صنعت و تجارت کی مدد کرتی ہیں اور ناممکن ہے کہ حکومت کی مدد کے بغیر کسی ملک کی تجارت پنپنے پائے کاش حکومتِ ہند بھی کبھی اس مسئلے پر فکر کا ایک لمحہ صرف کرے۔

دنیا کی عظیم ترین کھوپری۔ دنیا میں عظیم ترین انسانی کھوپری حال ہی میں جنوبی افریقہ میں برآمد ہوئی ہے یہ ایک دیسی شخص کی کھوپری ہے جسکو مرے ہوئے بہت تھوڑا عرصہ گذرا ہے۔ اس کھوپری کا طول ½۸ انچ اور کل جسامت ۱۲۲ انچ ہے اس کھوپری کو دیکھ کر بعض ڈاکٹروں نے یہ نتیجہ مترتب کیا ہے کہ افریقہ طاقتور انسانی نسلوں کا گہوارہ تھا۔

امریکا میں سیر و سیاحت کا شوق۔ امریکا کے زندہ دل لوگ سیاحت کے بہت دلدادہ واقع ہوئے ہیں۔ اس سال ۱۲ کروڑ آدمیوں میں سے تین لاکھ امریکن ممالک غیر کو سیاحت کیلئے

روانہ ہوئے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکن سیاحوں نے اس موسمِ گرما میں سات کروڑ بیس لاکھ پونڈ سیاحت پر صرف کئے ہیں۔

وہ لوگ جو امریکا سے باہر نہیں گئے وہ اپنی تعطیلات کا زمانہ موٹر کاروں میں سفر کرکے بسر کررہے ہیں۔ امریکن آٹو موبائیل ایسوسی ایشن کا تخمینہ ہے کہ اس وقت ۹۰۰۰۰۰۰ موٹروں پر انکے مالک۔ اپنے عیال و اطفال و اعزا و اقارب سمیت سیر و تفریح میں وقت گزار رہے ہیں موسمِ گرما کے آخر تک ۳۶۰۰۰۰۰ اشخاص نے ان موٹروں پر سفر کیا ہے ۱۳۶۰۰۰۰۰ اشخاص کی سیر و سیاحت کا خرچ ۲۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ تھا جو امریکا جیسے ملک کو دیکھتے ہُوئے بہت کم معلوم ہوتا ہے ان موٹر کے سیاحوں کے ساتھ اپنے کمپ ہوتے تھے تاکہ شب کو جس مقام پر قیام کرنا چاہیں وہاں قیام کرسکیں۔ یہ لوگ میدانوں اور کھُلی ہوا میں قیام کرتے اور اپنی خوراک خود تیار کرتے تاکہ دستِ خود دہانِ خود پر عمل کرتے ہوئے، ان کی صحت میں ترقی ہوتی رہے یہ طریقہ امریکا میں مقبول ہوتا جارہا ہے کہ کھُلی ہوا میں سونا چاہیئے۔ مشکل ہی سے ممالک متحدہ امریکا کا کوئی قصبہ یا شہر ایسا ہوگا کہ جس کے باشندوں نے موٹر کے سفر میں تعطیلات نہ گزاری ہوں ملک بھر میں پانچ اور چھ ہزار کے درمیان ایسے کھُلے مقامات ہیں جہاں پر مذکورہ بالا سیاح شب کو قیام کرتے ہیں یہ سیاح مختلف اطراف و جوانب میں پھیل جاتے ہیں اپنے خیمے خود نصب کرتے ہیں اور قانونِ قدرت کے مطابق کھُلی ہوا میں سوتے ہیں۔ امریکا والے یوں تو ہر موسم میں اور ہر وقت سیر و تفریح کرتے رہتے ہیں لیکن بالخصوص موسم گرما میں تو ہر امریکن تفریحی تعطیلات ضرور مناتا ہے۔

راوٹری کلب۔ کسی بڑے شہر میں بغیر دوستوں کے زندگی بسر کرنا نہ صرف ایک لعنت ہے بلکہ تنہائی کی ایک بدترین شکل ہے۔ یہی حالت ایک وکیل پال۔پی۔ہیرس نامی کی تھی ۱۹۰۵ء میں یہ شخص شکاگو میں بالکل اجنبی تھا۔ اور سوائے اپنے چند موکلوں کے کسی کو نہ جانتا تھا ان میں سے ایک کان کن۔ ایک کوئلے کا سوداگر اور ایک درزی تھا اور چاروں کی حالت یکساں

تھی۔ ان چاروں نے یہ تجویز کی کہ اپنی اپنی تجارت کو ترقی دینے اور اضافہ معلومات کیلئے ایک مجلس امدادِ باہمی بنانی چاہیئے۔ جو ہم لوگوں کیلئے بہت مفید اور بہ کار آمد ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے مجلس مذکورہ قائم کر لی۔ اور اس مجلس کے متعدد اجلاس منعقد کرنیکا فیصلہ کیا۔ جو اول اول ہر ایک رکن کے مکان پر انعقاد پذیر ہوتے رہے۔ جس میں وہ اپنی تجارتی ترقیوں اور دیگر باتوں کے لئے متعدد تجاویز دوسائل سوچتے اور اُن پر کاربند ہوتے انکی مجلس کو سیاسی اور مذہبی معاملات سے سروکار نہ ہوتا تھا۔

یہی مجلس رفتہ رفتہ مشہور تحریک راوٹری کے نام سے شہرت پکڑتی گئی۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جس مجلس کے اجلاس اول اول گھروں پر منعقد ہوتے تھے آج اسکی شاخیں تیئس ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ۲۲۰۳ کلب انکے ماتحت چل رہے ہیں۔ اور ہر سال ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے پرنس آف ویلز راوٹری کلب کے آنریری ممبر ہیں۔ متعدد بڑی بڑی شخصیتوں کی تائید اس تحریک کو حاصل ہے۔ ڈین آف برسٹل۔ مسٹر برلنس بائی دلیم رائٹ آنریبل جے ایچ ٹامس کلب کے خاص سرپرستوں میں ہیں۔

ابتدائی سال میں اس کلب کے پچاس ممبر تھے۔ اسکے بعد اس مجلس کے اجلاس اور ضیافتیں شکاگو کے ایک ہوٹل میں منعقد ہوتی رہیں۔ ہر راوٹری کلب ہفتہ میں ایک مرتبہ اپنے ارکان کی ضیافت کرتا ہے جس میں بعدِ ضیافت کلب کا کوئی رکن کسی مضمون پر جس میں اسکو خاص دسترس ہوتی ہے لکچر دیتا ہے۔

دوسرے سال سان فرانسسکو میں کلب قائم ہوگیا۔ ۱۹۱۱ء میں انگلینڈ کے بڑے بڑے شہروں میں اسکی شاخیں قائم ہوگئیں۔ ۱۹۲۱ء میں راؤٹری کلب کا بارھواں اجلاس ایڈنبرا میں منعقد ہُوا تھا جس کی شرکت کیلئے امریکہ سے ایک ہزار تجار آئے تھے۔

اسکے بعد برطانیہ میں کلبوں کی تعداد ۳۱ ہوگئی اور آج برطانیہ عظمیٰ میں راوٹری کلبوں کی تعداد پندرہ ہزار ہے یہ ٹھیک طور پر کہنا مشکل ہے کہ تحریک راوٹری کیا چیز ہے؟ لیکن ۲۱ سال سے جب سے کہ یہ شروع ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ ترقی پذیر ہوتی جارہی ہے۔ راوٹری میں فریمیسنوں کے مانند رازداری یا قدیم تر مجالس کی رسوم کی پابندی نہیں کی جاتی۔ کسی کلب کا

رکن تمام کلبوں میں شریک ہو سکتا ہے اگر وہ کسی غیر ملک میں جائیگا تو راوٹری کلب کی جانب سے اس کا خیر مقدم کیا جائیگا۔ اسکی خاطر مدارات اس قدر ہوگی کہ وہ پردیس اور سفر کی تمام کلفتیں بھول جائیگا +

کلب کے ارکان نے ملک کے مختلف حصص میں Babies' Home (بچوں کے لئے آسائش خانے) کھول رکھے ہیں۔ کلب کے ماتحت ایسی کمیٹیاں قائم ہیں جو قدیم ملازمین کی امداد کرتی ہیں۔ اکثر امور طے کرنیکی غرض سے کلب کے اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ برسٹل میں انکا ایک تھیئٹر ہے۔ جس میں واقعات عالم کو کھیل کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے "افضل الاشغالِ خدمت الناس" ان کا اصول ہے اس میں ہر فرقہ اور ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں +

یلدیز کوشک ناچ گھر میں تبدیل کیا گیا۔ قسطنطنیہ کا مشہور تاریخی محل یلدیز کوشک۔ جو باسفورس کے کنارے ایک دلاویز مقام پر واقع ہے اور جہاں سلطان عبدالحمید خاں اقامت فرماتے تھے۔ گذشتہ ۲۶ ستمبر کو اس میں میونسپل ناچ گھر کی افتتاحی رسم ادا کیگئی اس میں تفریحی کھیلوں اور رقص کے لئے متعدد کمرے ہیں +

افتتاحی رقص اُس کوشک میں انعقاد پذیر ہُوا جو سلطان موصوف نے قیصر کی آمد کے وقت خاص طور پر رقص کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ یہ بہت وسیع اور خوبصورت بنا ہُوا ہے تقریباً سو ترکی خواتین نے افتتاحی رقص میں شرکت کی اس رقص کے دیکھنے کے لئے یہ تعداد کثیر دعوتی کارڈ جاری کئے گئے تھے +

سوڈے کی جھیل۔ اگرچہ ہر گھر میں سوڈا استعمال ہوتا ہے مگر صرف چند لوگ ہی یہ بات جانتے ہیں کہ یہ قیمتی شے کہاں سے آتی ہے +

سوڈے کی ایک کثیر تعداد جو ہمارے وطن میں آتی ہے یہ جھیل ماگڈی سے جو نو آبادی کینیا میں واقع ہے۔ حاصل کی جاتی ہے۔ اس جھیل کا طول پندرہ میل اور عرض چار میل ہے اور یہ انتہائی موسم گرما میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک منجمد ہو جاتی ہے کیونکہ جھیل کے

اندر کاربونیٹ آف سوڈا کے ریزے بہ تعدادِ کثیر موجود ہیں جو جھیل کی سطح کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ انجماد کئی انچ موٹا ہوتا ہے اور اسکے نیچے پانی ہوتا ہے جس میں سوڈیم کاربونیٹ ملا ہؤا ہے یہ جھیل بالکل بحیرہ مردار کے مانند ہے جس کی سطح پر نمک منجمد ہوتا ہے۔ اسکی منجمد سطح اس قدر موٹی ہوتی ہے کہ ایک آدمی اس پر بلاخوف وخطر چل پھر سکتا ہے ۔

ہوائی موٹر۔ مسٹر لی۔ ہارٹن ولیمس آف پٹس برگ نے ایک ایسی موٹر کار ایجاد کی ہے جسکے متعلق ان کا دعوےٰ ہے کہ وہ ہوا کے ذریعہ سے پرواز کریگی ۔

یہ موٹر پہلے تو پٹرول کی طاقت سے چلیگی۔ اسکے بعد اسکی رفتار جب دس میل فی گھنٹہ ہوجائیگی تو پٹرول کا خزانہ بند کردیا جائیگا۔ اسکے بعد ہوائی قوت سے پرواز کرتی جائیگی۔ اسکے لئے عجیب غریب پہیئے حاصل کرلئے گئے ہیں جنکی رفتار ۶۲ میل فی گھنٹہ ہوگی۔ ہزاروں مالکانِ موٹر اس موٹر کی تیاری کے لئے ایک معقول رقم ہر ہفتہ مسٹر موصوف کو ادا کرتے ہیں اُن کو امید ہے کہ بہت جلد یہ پُراسرار موٹر انکے مالی منافع میں ایک معتد بہ اضافہ کا باعث ہوگی ۔

ایک عظیم الشان گھڑی۔ یسٹر (انگلینڈ) میں ایک ایسا clock ، گھڑیال بنایا جارہا ہے جس کی ایک سوئی نصف ٹن وزنی ہوگی اور جس کی منٹ کی سوئی ۵ انٹ طویل ہوگی ۔

لنڈن کا کوڑا کرکٹ۔ اگر لنڈن کا تمام کوڑا کرکٹ جدید طریقہ سے جلایا جائے تو اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سے ہر سال .... ۲۰۰ پاؤنڈ کی برقی قوت مہیا کی جا سکتی ہے ۔

چور شوہر۔ سنڈنی کی ایک بیوہ نے حال ہی میں ایک ایسے شخص سے شادی کی ہے جسکی ملاقات اس سے اس وقت ہوئی جبکہ وہ ٹرام میں جارہی تھی اور شخصِ مذکور نے اسکے کیسہ میں ہاتھ ڈال کر اس کا بٹوا چھین لیا تھا۔ جسکی وجہ سے پولیس نے اسے گرفتار بھی کرلیا ۔

نانک

(علامۂ اقبال)

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی　　قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی!

آہ! بد قسمت رہے آوازِ حق سے بیخبر　　غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا　　ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی　　بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی!

آہ! شودر کے لئے ہندوستان غمخانہ ہے　　دردِ انسانی سے اس بستی کا دِل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے ابتک مئے پندار میں　　شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہُوا　　نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہُوا

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے

ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے!

(بانگِ درا)

گرُو نانک

نیک کام کرو اور خدا کو یاد رکھو کہ سب سے اچھا مذہب یہی ہے (گرو نانک)

گرو نانک کو اس عالم فانی سے رخصت ہوئے چار سو سال سے زاید عرصہ منقضی ہو چکا ہے لیکن صداقت کا جو پائدار نقش انہوں نے صفحۂ ہستی پر ثبت کیا وہ آجتک اُسی طرح قائم ہے دنیا کو رشد و ہدایت کا جو حقیقت آموز پیغام انہوں نے دیا اسکے الفاظ آج تک ہمارے کانوں میں اس طرح گونج رہے ہیں:۔

"اے فانی انسان کوئی کام کرنے سے پہلے یہ سوچ کہ تو کیا کر رہا ہے۔ ظاہر پرستی سے گمراہ نہ ہو بلکہ ہر چیز میں حقیقت کی جستجو کر، اس ایک لازوال حقیقت کی جستجو، جو ازل سے ایک ہے اور ابد تک ایک رہیگی"

گرو نانک نے جس وقت وحدت کا یہ پیغام ہندوستان کو دیا، اس وقت مُلک کی حالت نہایت ابتر تھی وہ شمع ہدایت جو گرُو نانک نے روشن کی اس ظلمت سوز انوار گستری جہالت اور گمراہی کی اس شب تاریک کے لئے جو ملک بھر پر چھا رہی تھی صبح سعادت کا حیات افروز پیغام لائی۔

گرو نانک ۱۴۶۹ء میں بمقام تلونڈی (پنجاب) پیدا ہوئے، بچپن ہی میں انکی غیر معمولی شخصیت کا جوہر آشکار ہونے لگا۔ انکی باتیں انکے والد کو تعجب میں ڈالدیتی تھیں۔ لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ قدرت کو انکے بیٹے سے کیا کام لینا منظور رہے۔

ابتدا میں نانک کو انکے باپ نے ہل جوتنے کے کام میں لگانا چاہا لیکن جو دماغ اور دل ایک عظیم الشان اور اہم مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہو اس کو کلبہ رانی سے کیا تسکین ہو سکتی تھی۔ آخر کار وہ مدرسہ میں داخل کئے گئے لیکن یہاں کی تعلیم بھی انکے لئے سرمایۂ تسکین بہم نہ پہنچا سکی وہ اپنے استاد سے پیہم اس قسم کے سوال کیا کرتے تھے کہ "گرُو جی! کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کائنات کی کل کس عظیم الشان قانون کے ماتحت چل رہی ہے" اُستاد اس قسم کے سوالوں سے حیران ہوتا اور سمجھتا کہ یہ بچہ بالکل غیر متعلق باتیں کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مدرسہ کی تعلیم گرو نانک کے قلب کے لئے جو اسرار فطرت کو سمجھنے کے لئے بیتاب تھا۔ باعث اطمینان ہو ہی نہ سکتی تھی۔


گرو بابا نانک

جب گرو نانک نے بچپن سے نکل کر لڑکپن میں قدم رکھا۔ انکی زنار بندی کی رسم کی تیاری شروع ہوئی لیکن یہ لڑکا رسم و رواج کی قیود سے بالاتر تھا۔ بازار سے خریدا ہُوا دھاگا کہاں، اور کہاں وہ رشتہ جو مخلوق کو خالق سے ملائے ہوئے ہے۔ وہ پنڈت جو زنار بندی کی رسم ادا کرنے پر متعین ہُوا تھا۔ گرو نانک کا یہ جواب سُن کر ششدر رہ گیا کہ "محبت اور ہمدردی کی روئی سے قناعت کا دھاگا تیار کرو اور اسے صداقت اور ضبطِ نفس کے بل دیکر بٹو، اور اگر تمہارے امکان میں ہے تو میرے لئے اس طرح کا زنار لاؤ، کیونکہ اسی سے انسان کی روح تسکین پا سکتی ہے، اور اسی کی اُس کو ضرورت ہے۔ یہ دھاگا نہ کبھی ٹوٹتا ہے، اور نہ غلیظ ہوتا ہے نہ جل سکتا ہے اور نہ پرانا ہو کر بیکار ہو جاتا ہے۔ مبارک ہے وہ شخص جسے ایسا زنار میسّر ہو۔ سنسکرت کے ایک شاعر نے اسی قسم کے خیالات یوں ظاہر کئے ہیں،

"جب روح جسم کو چھوڑ دیتی ہے تو مُردے کے عزیز اس کی لاش اپنے سے جدا کر دیتے ہیں اور اسے مٹی کا ایک بیکار ڈھیر سمجھ کر اس سے اور اس کی ہر چیز (زنار وغیرہ) سے منہ موڑ لیتے ہیں اس وقت صرف ایک چیز اس کا ساتھ دیتی ہے اور وہ اس کا دھرم ہے یعنی اپنے خالق کے ساتھ تعلق"

گرو نانک کے والدین کی انتہائی کوششوں کے باوجود انہیں دُنیا کے کاروبار سے کوئی دلبستگی پیدا نہ ہو سکی۔ انہیں روپیہ کمانے اور جمع کرنے کی مطلق حرص نہ تھی، بلکہ روپیہ انکے ہاتھوں میں ٹھہر ہی نہ سکتا تھا۔ ان کا دل قناعت کے راز کو سمجھ چکا تھا۔ اور سونے کے کوہ وقار انبار بھی انکے سامنے ایک ذرّہ بے مقدار کی سی حقیقت رکھتے تھے۔ لیکن اسکے باوجود وہ دنیا سے راہبوں کی طرح یکسر روگرداں نہ تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے، جو دنیا سے منہ موڑ کر جنگلوں میں اپنا ٹھکانا بنا لیتے ہیں۔ وہ دنیا کی جدوجہد سے گھبرانا نہیں جانتے تھے بلکہ اس دُنیا کے ہنگاموں کا مقابلہ کرکے اس پر غلبہ پانا چاہتے تھے۔ وہ اس دنیا میں رہتے تھے، لیکن ایک اَور دنیا کا خیال انکے دل میں سما رہا تھا۔

گرو نانک دُنیاوی تعلقات اور متاہلانہ زندگی کو مذہب کے راستے میں کسی طرح حائل نہ سمجھتے تھے اُنکا قول ہے کہ دُنیا کو اپنا بناؤ اور اپنا بنانے کی کوشش کرو۔ تمہیں اس میں بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ لیکن بالآخر تم اُن پر غلبہ پالو گے۔ وہ انسان نہایت ہی بزدل ہے، جو دُنیا کی تکلیفوں کو دیکھ کر اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

گرو نانک کا اپنے ان اقوال پر پورا عمل تھا۔ وہ اس جہالت سے جو اس وقت ملک میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، مطلق ہراساں نہ ہوئے حکومت کا تشدد، ملک کا معاشرتی انحطاط، اور مذہبی فسادات جو ان کی پیدائش کے وقت سے پہلے ہی ملک میں برپا ہو گئے تھے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی انکے عزم وسیع پر غالب نہ آسکی بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہی وقت اُنکی تبلیغ ہدایت کے لئے بہترین ہے اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ مختلف جگہ کے سفر میں گزارا۔ انہوں نے اس زمانے میں جب ریل وغیرہ کا نام ونشان نہ تھا، نہ صرف پنجاب بھر کا چکر لگایا بلکہ مکہ اور مدینہ کا دور و دراز سفر بھی اختیار کیا۔ اسکے علاوہ وہ ہندوستان میں جگن ناتھ، ہردوار اور ہندوؤں کے دوسرے مقدس مقامات میں بھی پہنچے اسی طرح جنوب میں دکن سے ہوتے ہوئے وہ لنکا تک گئے۔ ان موقعوں پر بعض دفعہ فرط عقیدت سے لوگ انہیں سجدے کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے ہر موقعہ پر لوگوں کو ان باتوں سے روکا۔ ایک دفعہ جب رائے بلار انکے سامنے سر جھکانے لگا۔ انہوں نے اس کو اس سے منع کیا۔ پھر اس نے کہا مجھے کوئی خدمت بتائیے، انہوں نے یہ بات سُن کر اس سے چاندی اور سونا طلب نہ کیا، انہوں نے اسکا جو جواب دیا، وہ تاریخ کے صفحات پر آج بھی سنہرے حروف میں جگمگا رہا ہے :-

"وہ ایک خدمت میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔ بشرطیکہ تجھے منظور ہو۔ وہ یہ کہ جہاں تیری طاقت تیرے کام نہ آسکے تو اپنی عبادت اپنے خالق کے حضور میں پیش کیا کر"

یہی وہ سب سے بڑی خدمت تھی، جو گرو نانک اپنے ہمجنسوں سے چاہتے تھے۔ انہیں دنیوی مال و متاع کی ضرورت نہ تھی +

کہتے ہیں کہ ابراہیم لودھی کے عہد میں گرو نانک کو قید و بند کی تکلیفیں جھیلنی پڑیں اور انہوں نے یہ تکالیف اسی صبر و رضا کے ساتھ برداشت کیں جو اس مرتبہ کے انسانوں کا شیوۂ خاص ہے۔ بابر نے اپنے زمانے میں انہیں آزاد کیا اور ان سے سوال کیا کہ وہ انکی خدمت میں کس قسم کا ہدیہ پیش کرسکتا ہے۔ گرو نانک نے جواب دیا :-

"وہ داتا ایک ہی ہے اور یہ سارا جگ بھکاری، اسی پر بھروسا رکھنا اچھا ہے۔ راجے اور مہاراجے سب اسی نے بنائے ہیں۔ کوئی اس سا نہیں اے بابر! سُن نانک کیا کہتا ہے۔

جو تیرے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے وہ انجان ہے" +

قید سے رہائی پاتے ہی گرو نانک نے تبلیغ ہدایت کا کام شروع کر دیا۔ انہیں بہت سے مخلص پیرو مل گئے۔ اُن سب کے دلوں میں گرو نانک کے خلوص اور صداقت کی روح دوڑ رہی تھی انتقال سے چند دن پہلے گرو نانک نے اپنا جانشیں خود ہی مقرر کیا۔ اور ان کے جانشین اور متبعین خلوص کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے رہے جس کی بنیاد انہوں نے رکھی تھی۔ آج کل سکھوں کی قوم میں جو روح سرگرم عمل ہے، یہ گرو نانک ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ انہوں نے ہر قسم کے مصائب کا مقابلہ نہایت صبر و تحمل سے کیا اور آخر وہ اپنے محبوب مقصد میں کامیاب ہوئے سکھوں کی قوم گورو نانک کی کامیابی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے +

(ملخص) حامد علی خاں

شاید

تجھے کن لفظوں سے یاد کروں؟ میری عبارت میں نہ تیرے بالوں کی بغاوت نہ تیری آنکھوں کا جادو نہ تیری آواز کا رس۔ کاش تو اپنے تخیل سے کام لے اور بن میرے کہے وہ سب کچھ دیکھ لے سب کچھ سمجھ لے۔ جو میں دکھانے اور سمجھانے سے معذور ہوں۔

میری آرزوئیں کیونکہ وہ سب تیرے متعلق ہیں، زندۂ جاوید ہیں آرزو کے مرنے کا امکان تب ہوتا جب اسکے بر آنے کی کوئی صورت ہو۔ اب تو خیر چھ ہزار میل کا فاصلہ ہے مگر جب یہ دوری نہ بھی تھی تب بھی تو میں کچھ کہہ سکا نہ تو کچھ سمجھ سکی۔

تو نے کبھی خواب دیکھے ہیں؟ کاش ایک خواب تو دیکھے۔ ایسا کہ تو لاکھ یاد کرے مگر وہ خواب ہی رہے، اور اس خواب میں وہ دامنِ کوہ، وہ چشمہ، وہ سیر، تیرے دل میں گدگدی کر کے سوتے سوتے تجھے محوِ تبسم کر دیں +

اور کاش میں ایک خواب دیکھوں یہ سودائی سر ہو وہ نازک پاؤں ہوں اور آنسوؤں کی قطار۔ تیرا خواب فضائے عالم میں خوشنما شفق بن کر پھیلے اور میرا خواب ایک سیاہ مست بادل کا ٹکڑا بنکر اُڑے۔ اس دنیا جہان سے بہت دور جہاں نہ تجھے نہ مجھے نہ کسی اور کو کچھ بھی پتہ چل سکے یہ دونوں خواب شاید ہونٹ سے ہونٹ لگا لیں +

فلک پیما از لندن

طاؤس

یہ کیف گہِ دشت یہ برسات کا موسم — یہ وجد کا عالم
ہے رقص میں طاؤس کہ اک "رنگِ مجسم" — رقصیدہ پیہم

سینائے کلیمی ہے کہ ہے سینۂ زرّیں — یا چشمۂ سیمیں
جنبش میں ہے اعجاز سے اک وادیٔ رنگیں — یا گردنِ پرخم

نیلوفری دم پر ہیں یہ پاشیدہ جواہر — یا چرخ پہ اختر
یا نیند سے جاگے ہوئے سبزے کی جبیں پہ — ہے رقص میں شبنم

موسیقیٔ صحرا تو نہیں وجد میں رقصاں — صد رنگ بداماں
یا نغمہ سرا ہے کوئی طاؤسِ خراماں — برہم زنِ عالم

ہے جانِ ترنم یہ تیری زمزمہ سازی — جذبات نوازی
یہ سلسلہ مستیٔ الحانِ حجازی — یہ نغمۂ پیہم

مدہوشیٔ "محویتِ کامل" سے جو جھوما — طاؤس نہیں تھا
میں نے ہی نہیں آج تو "فطرت" نے بھی دیکھا — "نغمے کو مجسم"

روش صدیقی

اُسوۂ حسنہ

۲

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ — قرآن حکیم

اُس جاہلیت نے جو کئی صدیاں گزریں عرب قدیم کے آغوش میں پرورش پا رہی تھی اب پھر یورپ کی سرزمین سے سر نکالا ہے اور اسکے علم بردار حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض و عداوت کا اظہار کر کے اپنے قدیم عربی پیشروؤں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ "باٹومیٹ" اور "ماٹوم" کی نیرنگ نواز افسانہ طرازیوں کا وقت تو گزر چکا کہ اربابِ جاہلیت جدیدہ کسی زمانہ میں حضور رحمتِ دوجہاںؐ کو اسی نام سے یاد کر کے حضورؐ کو معاذ اللہ ایک خون آشام اور انسان خور دیوتا قرار دیتے تھے لیکن اب متعصبین فرنگ کے اعتراضات حکمت و فلسفہ کا طرّۂ فضیلت لگا کر ایک مضحکہ انگیز ادائے ثقاہت کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ جنگ ایک وحشیانہ فعل ہے جسکو کوئی روحانی تعلیم جائز نہیں قرار دے سکتی اور اسلام کی اشاعت تمام تر شمشیر و خنجر کی شرمندۂ احسان ہے۔ ان اعتراضات کی تردید بجائے خود اس قدر اہم اور اشاعتِ اسلام کا اُسوۂ نبوت بحیثیت جناب رسالتمآبؐ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہونے کے اس قدر عظیم الشان ہے کہ میں اسکی تشریح و توضیح کے لئے یہاں زیادہ گنجائش نکالوں گا ۔

زندگی ایک رزمگاہ ہے جس کی تمام ہنگامہ آرائیاں ایک اور صرف ایک مقصد کے حصول کیلئے جاری ہیں اور یہ مقصدِ وحید انسان کی تطہیر اور خدا کے نام کی تقدیس کے سوا کچھ نہیں۔ اس عالمِ وجود میں بدی نے ہمیشہ نیکی کو مٹانے کی کوشش کی ہے اور نیکی نے ہمیشہ بدی کو نابود کرنا چاہا ہے ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ۔۔۔ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

جو لوگ جنگ کو بیکار اور بے سود خیال کرتے ہیں اُنہیں خود اپنی ذات پر غور کرنا چاہیئے کہ کیا اُن کی روح خیر و شر کی دو متضاد قوتوں کے تعارض و تصادم کا منظر پیش نہیں کرتی؟ یہی تعارض جب وسیع تر صورت اختیار کرتا ہے تو افراد سے گزر کر اقوام و ملل تک جا پہنچتا ہے اور یہ کشمکش وہاں بھی جاری رہتی ہے ۔

اِسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام ۔۔۔ یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی

بلاشبہ جنگ بذاتِ خود کوئی ایسی خوش آئند چیز نہیں کہ انسان اسکا آرزومند ہو کیونکہ یہ بہرحال اُس المناک

حقیقت کی یاد تازہ کرتی ہے کہ انسان اگر فرشتہ ہے تو شیطان بھی ہے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ درشت صداقت کہ دنیا میں بدی موجود ہے جو آدمی قوتوں کو تصرف میں لا کر نیکی کو مٹا دینے پر تلی ہوئی ہے، پکار پکار کر ہم سے کہہ رہی ہے کہ اگر تم نے نیکی کی مدافعت اور محافظت نہ کی تو اس کا نام دنیا سے اُٹھ جائیگا۔ رحم و کرم اور محبت و شفقت نہایت مستحسن جذبات ہیں لیکن ہر جذبہ کے استعمال کا کوئی خاص موقع اور محل ہوتا ہے اور اسی موقع و محل کی اضافت سے اُس جذبہ کے خیر یا شر ہونیکا فیصلہ کیا جا سکتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص ازراہ غائیت محبت سانپوں اور بچھوؤں کو پالنے اور اُنکی افزائشِ نسل کا باعث ہو تو اُس کا یہ فعل دنیا کے کسی صحیح الدماغ اور سلیم العقل انسان کے نزدیک سزاوارِ ستائش نہ ہوگا۔ مسلمان خدا کی عطا کی ہوئی تمام قوتوں سے مستفید ہوتا ہے لیکن اُنکے اخلاقی مواقع استعمال سے بے نیاز ہو کر، کورانہ طور پر اُن سے کام نہیں لیتا۔ اُس کا رحم و محبت صرف نیکی کے لئے اور اُس کا غیظ و غضب محض بدی کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن اس باب میں شاید استدلال کی زیادہ ضرورت نہیں کیونکہ خدا کی عنایت سے انسان کو جنگ کے جواز کے لئے کبھی فلسفۂ فرنگ کی تائید کا محتاج نہیں ہونا پڑا اور دنیا کے واقعات یوروپ کے قیاسی اجتہادات کی مدد کے بغیر ظہور میں آتے رہے ہیں۔ جنگ ہمیشہ سے تھی اور آجتک ہے اور دنیا کی تمام سابقہ و موجودہ حکومتوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس نے بعض نہایت سنگین جرائم کیلئے قتل کی سزا مقرر کر کے یہ ثابت نہ کر دیا ہو کہ امن و صلح کے قیام کیلئے طاقت کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ حیاتِ انسانی کے ایسے اہم شعبہ کے متعلق شارعِ اسلام علیہ الصلوٰۃ و السلام کا اُسوۂ حسنہ خاموش ہوتا۔ آنحضرتؐ نے جہاں ہر موقع پر تا بحدِ امکان معرکۂ حرب و قتال سے احتراز کیا ہے وہاں اٹل اور ناگزیر ضرورت پر کبھی اپنے فطری رحم و رفق اور حلم و بردباری کو غالب نہیں آنے دیا کیونکہ آپؐ کے تمام محاربات ذاتی اغراض کی آلائش سے پاک اور خالصتہً فی سبیل اللہ تھے۔

با ایں ہمہ حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اشرار کی تباہی کی بجائے ہمیشہ اُنکی اصلاح کے لئے جد و جہد کی۔ طائف سے انتہائی مظلومی کی حالت میں مراجعت کرتے وقت بھی آپؐ نے یہ نکتہ آموز حقیقت ارشاد فرمائی "میں ان لوگوں کی ہلاکت کے لئے کیوں دُعا کروں؟ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو انکی آئندہ نسلیں ضرور خدائے واحد کی پرستش کرینگی"[1] مسلمانوں کے لئے یہ ارشادِ نبوی بہ غائیت نتیجہ خیز اور بصیرت افروز ہے اور آنحضرتؐ کے غزوات بھی اسی حقیقت کی توضیح کرتے ہیں کہ کفار کی ہلاکت سے اُن کا ایمان لانا اسلام کو زیادہ عزیز ہے۔ اسکے متعلق آگے چل کر میں نظائر و امثال پیش کرونگا لیکن یہاں ایک جرمن نومسلم ڈاکٹر ہیوگو مارکس کا قول نقل کرنا چاہتا ہوں جو میرے

---

[1] صحیح مسلم عن عائشہ رضی اللہ عنہا۔

نزدیک آنحضرتؐ کے جہاد بالسیف کے صحیح اسلامی مفہوم کی نہایت عُمدہ تشریح کرتا ہے: "آپؐ ہاتھ میں تلوار لیتے ہیں اور دشمنوں سے اُس وقت تک جنگ کرتے ہیں جبتک وہ حق وصداقت کے لئے سدِراہ ثابت ہوں لیکن جونہی فتح حاصل ہوتی ہے اور دشمن ہتھیار ڈالدیتا ہے آپؐ کے طرزِعمل میں تغیر واقع ہوتا ہے شکست خوردہ اور کمزور حریف اب دشمن نہیں رہتا۔ اُس کا خیر مقدم عفو و درگزر سے کیا جاتا ہے، نہیں بلکہ فاتح خود مفتوح کی دوستی کا خواہاں ہوتا ہے" فتح مکّہ کے بعد جب اسلام کا دُنیوی اقتدار اور کُفر کی طاقت کا قطعی زوال تمام عرب کو صاف نظر آنے لگا، اُس وقت عکرمہ بن ابوجہل جیسا زبردست دشمنِ اسلام جو بارہا مُسلمانوں کے خلاف معرکہ آرا ہُوا تھا، جس نے فتحِ مکّہ سے کچُھ ہی عرصہ قبل بنوخزاعہ کو جو مُسلمانوں کے حلیف تھے تباہ کرنے میں نمایاں حصّہ لیا تھا اور اب اپنی غلط کاریوں کی پشیمانی اور خوف سے دشتِ غربت میں مارا مارا پھر رہا تھا حضورؐ کی رحمت کے بھروسے پر آپؐ کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ آپؐ اس کو دیکھ کر فوراً اُٹھے اور نہایت تپاک سے اُس کی طرف بڑھے۔ اپنے شدید ترین اور شاید سب سے زیادہ خوفناک دشمن کے بیٹے کے لئے کسی کلمۂ ملامت کی بجائے خیر مقدم کے یہ الفاظ آپؐ کی زبان پر تھے: "اے مسافر سوار! تمہارا آنا مبارک ہو"۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد قرآنِ حکیم نے مُسلمانوں کو حسبِ ذیل الفاظ میں غزا و جہاد کی اجازت دی اور جنگ کے اسلامی نقطۂ نظر کو کُھلے کُھلے الفاظ میں بیان کردیا:-

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ؕ

مُسلمان جن سے (بلا سبب) جنگ کی جاتی ہے، اب اُنکو بھی جنگ کی اجازت دی گئی کہ وہ مظلوم ہیں اور خدا اُنکی مدد پر قادر ہے، وہ جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دئے گئے، سوا اسکے اُنکا کوئی اور قصور نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار ہی ہمارا خدا ہے، اگر دُنیا میں ایک قوم کو دوسری قوم سے بچایا نہ جائے تو بہت سی خانقاہیں کلیسا، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں اکثر خدا کا نام لیا جاتا ہے برباد کردی جائیں۔ (سیرت شبلی)

قرآن مجید کا محوّلۂ بالا اقتباس صاف بتارہا ہے کہ جہاد بالسیف کا یہ اذن عام اُس وقت ہُوا جب مُسلمان ایک عرصۂ دراز کی مظلومی و ستم کشی کے بعد بھی تسلیم و رضا کی زندہ تصویر بنے ہوئے، اپنے وطن اور گھر بار کو چھوڑ کر تین سو میل دُور کے ایک شہر میں جا بسے تھے مگر کفّار نے جن کے جذبۂ بغض و عداوت کی پیاس ابھی نہیں بُجھی

تھی، اپنی گرگ وارخون آشامی کے ساتھ یہاں بھی اُن کا پیچھا کیا تھا۔ جنگ کی ابتداء ہمیشہ قریش کی طرف سے ہوئی، پہلا معرکہ غزوۂ بدر تھا، اس میں بھی سبقت قریش نے کی۔ چنانچہ ہجرت کے دوسرے ہی سال ایک قریشی رئیس کرز بن جابر الفہری انتہائے بے باکی سے مدینہ والوں کے مویشی لوٹ کر لے گیا۔ اسکے علاوہ مدینہ کی یہودی جماعت سے مُسلمانوں کے خلاف سازشیں کی گئیں، مُسلمانوں کو تباہی و بربادی کی دھمکیاں دی گئیں اور بالآخر ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ابوجہل نے وسیع پیمانہ پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں، اسی طرح سویق اور اُحد کے غزوات میں بھی جارحانہ اقدام کفار ہی کی طرف سے ہُوا۔ اس صورتِ حالات میں اگر آنحضرتؐ کی پیغمبرانہ اولوالعزمی دفاعی تدابیر اختیار نہ کرتی تو مومنین کے قلیل گروہ کا نابود ہو جانا صاف نظر آرہا تھا اور اسکے ساتھ ہی آپؐ کا عظیم الشان مقصدِ حیات بھی شاید تباہ ہو جاتا جس کی تکمیل کا احساس آپؐ کو اپنی زندگی کی ایک ایک سانس کے ساتھ رہتا تھا۔ چنانچہ غزوۂ بدر سے پہلے آپؐ نے خدا سے بہ خضوع و خشوع دعا کی کہ اگر تو نے آج اپنے ان مجاہدین کی حفاظت نہ کی تو دُنیا میں تیری توحید کی منادی کرنے والا کوئی نہ رہیگا۔ عام مؤرخین نے شائد کبھی اس نکتہ پر غور نہیں کیا کہ مُسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ رزمیہ روایات کیوں اس کثرت کے ساتھ اس قسم کے دل آرا مناظر پیش کرتی ہیں کہ عین اُس وقت جب ہنگامۂ کارزار گرم ہے اور دونوں طرف کے سورما داد تہوّر دے رہے ہیں، عساکرِ اسلام کا سالار، نشۂ شجاعت کی سرشاری میں فخر و غرور کا اظہار کرنیکی بجائے، اپنی نیاز کیش پیشانی کو خاکِ تذلّل پر رکھے ہُوئے، فتح و نصرت کے لئے خدائے قدیر سے تائید و اعانت کی التجا کر رہا ہے۔ حقیقت میں یہ سب اُس عظیم رُوحانی قوت کے کرشمے ہیں جس کا سراغ شارعِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی جبینِ اقدس کے سجدوں کی تڑپ بدر، اُحد، خندق، خیبر اور تبوک کے میدانوں میں چھوڑ گئی تھی۔ خود ہندوستان کے دو بہت بڑے تاریخی معرکوں یعنی حملۂ سومنات اور پانی پت کی پہلی لڑائی میں قشونِ قاہرۂ اسلام کے قائد اُسوۂ نبوی کا اتباع کرکے اہل نظر کے لئے فکر و بصیرت کا سامان بہم پہنچا چکے ہیں ۔

خدا کے دستِ قدرت کی کارفرمائیاں بعض دفعہ ایسے اَن دیکھے اور اَن بُوجھے طریقوں پر ظاہر ہوتی ہیں کہ انسان کو بالعموم ان کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ ۶ھ میں صلحِ حدیبیّہ کے موقع پر جو معاہدہ قریش اور آنحضرتؐ کے درمیان ہُوا، اُسے متعدد صحابۂ کرام یہانتک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے مقربِ بارگاہِ رسالت بھی اہلِ کفر کے غلبہ اور سربلندی سے تعبیر کر رہے تھے لیکن پردۂ غیب کے پیچھے بساطِ تقدیر کسی اَور قرینہ سے بچھائی جا چکی تھی، اور یہی معاہدہ آخر کار مُسلمانوں کے لئے ابراہیم خلیل اللہ کے شہر کے دروازے

کھول دینے والا تھا۔ صلح حدیبیہ کو ابھی پورے دو برس بھی نہ گزرے تھے کہ قریش نے شرائطِ معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، بنو بکر کے ساتھ مل کر بنو خزاعہ پر جو مسلمانوں کے حلیف تھے حملہ کیا۔ بنو خزاعہ تابِ مقاومت نہ لاکر کعبۂ مکرمہ میں پناہ گزیں ہوئے لیکن بیت اللہ الحرام کی حدودِ مقدسہ کی عظمت بھی ظالموں کی خونریز خون آلود تلواروں کو نیام میں نہ کرسکی۔ بنو خزاعہ نے اُن سے، خود اُن کے خدا کے نام پر امان مانگی مگر اُن سفاکوں کے ہلاکت بار خنجر، کوندتی ہوئی بجلیوں کی طرح، بے دریغ اپنا کام کرنے لگے۔ "الٰہک! الٰہک!!" کی مظلومانہ التجاؤں کے جواب میں خدا کے گھر کے اندر "لا الہ الیوم" کے فرعونی نعرے بلند ہوئے لیکن ان سرگشتگانِ ضلالت کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ خدا اُس روز بھی تھا اور دس ہزار قدوسیوں کا لشکرِ جرار بھیجکر مظلوموں کی دادرسی کرسکتا تھا۔ بنو خزاعہ میں سے چالیس ستم رسیدہ جان بچاکر دربارِ رسولؐ میں پہنچے اور انصاف کے طلبگار ہوئے۔ قریش نے علیٰ رغم شرائطِ صلح، اسلام کے ایک دوست قبیلہ پر قاتلانہ حملہ کرکے گویا مسلمانوں کو دعوتِ جنگ دی تھی کہ "آؤ، اگر ہمت ہے تو مقابلہ کے لئے نکلو"۔ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس تحدّی کو قبول کیا کہ اعانتِ حق اور تائیدِ انصاف کا تقاضا بھی یہی تھا۔ مزید براں یہ کیونکر ممکن تھا کہ صادق و امین نبیؐ ایسے حق معاملہ کے متعلق ایک معاہد قبیلہ سے ایفائے عہد نہ کرتا +

فتح مکہ کا دن بھی عجیب دن تھا۔ آج خدا نے اپنے ہاتھ سے پیغمبر کے سر پر سطوتِ کبریٰ کا تاج رکھ کر اُسے دینی و دُنیوی کامرانی کی اعلیٰ ترین معراج پر فائز کردیا۔ اُسی شہر نے جہاں اُسے گالیاں دی جاتی تھیں، جہاں اُسکے سر پر نجاستیں ڈالی جاتی تھیں، جہاں اُسکے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے، ہاں اُسی دار الکفر نے جو اَب دار الاسلام بننے والا تھا آج اپنے دروازے اُسکے لئے کھول دیئے تھے۔ دنیا کہیگی کہ آج ناز و غرور کے اظہار کا دن تھا، آج اُسؐ کا سر، جوشِ تفاخر میں ہفت افلاک سے بلند ہوتا تو بجا تھا اور کسی ساز و یراق سے مرصّع راہوار کی پشت پر بیٹھے ہوئے اُس کی پُرجلال آنکھوں کو قدم قدم پر اپنے دشمنوں کی رسوائی و نگونساری کا منظر دیکھنا چاہیئے تھا کیونکہ بظاہر اُسیؐ کی حکمت و تدبّر، اُسیؐ کے ایثار و استقامت نے یہ دن دکھایا تھا کہ آج مکہ کی فضا نعرہ ہائے تکبیر کے غلغلہ سے لرز رہی تھی۔ اسلام کی فوج تا بحدِ نگاہ ایک طوفان خیز سمندر کی طرح پھیلتی چلی گئی تھی جس کی اُبلتی اور اُبھرتی ہوئی موجیں ہر طرف سے بہتی اور اُمنڈتی آرہی تھیں۔ ایک ایک سپاہی نشۂ شجاعت میں چُور، سینہ تانے ہوئے بلد الامین میں داخل ہو رہا تھا اور آفتابِ صبح کی نورانی کرنوں میں مجاہدین کی کفر سوز تلواروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کررہی تھی۔ ہزارہا جاں نثار غلام جنکے قدموں کی دھمک سے زمین متزلزل ہورہی تھی اس وقت پیغمبرؐ کے گرد حلقہ زن تھے مگر وہ جو عجز و فروتنی کی زندہ تصویر بنا ہوا اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا تھا، اُس کا دل فتح و کامرانی کی اس ساعت میں

کسی اور جذبہ سے سرشار تھا۔ ایک آزاد شدہ غلام کا بیٹا[1] جسے اسلام کی مساوات نے سر آنکھوں پر جگہ دی تھی، اس سواری میں اُس کا ردیف تھا اور فرطِ انکسار سے اُس کا سر اتنا جُھکا ہُوا تھا کہ اونٹ کے کجاوہ کے سامنے کے حصّہ سے لگا جاتا تھا۔ اس عبرت آموز منظر کی علت نقط اتنی تھی کہ کوئی فاتح اپنے مفتوح شہر میں داخل نہیں ہو رہا تھا بلکہ خدا کا پیغمبر خدا کے گھر میں حاضر ہو رہا تھا۔ کعبہ کے اندر پہنچ کر بھی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی شانِ نیاز دکھائی اور اس عظیم الشان کامیابی کے لئے اپنی عقل و تدبیر یا عزم و استقلال پر ناز کرنے کی بجائے خدائے قادر و توانا کے سامنے نہایت عجز و انکسار سے پیشانی کو خاک پر رکھدیا۔

شاید غیر مسلم مؤرخین کو حیرت ہو کہ کس نامعلوم قوت کا تصرف قرونِ وسطیٰ کے خود مختار اور مطلق العنان مُسلمان سلاطین کو جادۂ عدل و اتقا سے منحرف نہ ہونے دیتا تھا۔ مگر ہم مُسلمانوں کے لئے جو اپنے پیغمبر کے سوانحِ حیات سے واقف ہیں اس سوال کا جواب دینا کچھ مشکل نہیں۔ عجز و نیاز کا جو گرانمایہ سبق رسُولؐ نے فتح مکّہ میں اور خدا نے حنین کے دن اسلام کو دیا اُسے مُسلمانوں نے کبھی فراموش نہیں کیا اور تاریخ اسلام کے تقریباً ہر دَور میں کوئی نہ کوئی مُسلمان تاجدار کسی نہ کسی رنگ میں اپنے ہادیٔ برحق حضور شہنشاہ کونین علیہ افضل التحیاۃ کی اس سنّتِ حسنہ کے معجزانہ ثبات و قیام کا ثبوت دے چکا ہے۔ مثال کے لئے میں ایک ایسے اسلامی حکمران کا انتخاب کرتا ہوں جس کی قوم قبولِ اسلام سے پہلے بجز اپنی وحشت و جہالت کے اور کوئی مایۂ امتیاز نہ رکھتی تھی۔ لیکن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز دیکھو کہ صدیوں کا فصلِ زمانی بیچ میں حائل ہونے کے باوجود، حضورؐ کے اُسوۂ مقدسہ کی مقناطیسی کشش نے سلجوقیوں کے ایک ذی جبروت فرماں فرما سے، اُن آخری تاریک ساعتوں میں بھی جب موت کا سایہ اُسکے ستارۂ حیات کو گہنا رہا تھا، وہ الفاظ کہلوائے جن سے زیادہ عبرت انگیز کلمہ دنیا نے شاید کبھی کسی مرنے والے کی زبان سے نہیں سنا۔ الپ ارسلاں کتنا بڑا سُلطان تھا! اس کی وسیع سلطنت شمال میں ترکستان سے لیکر ایشیائے کوچک تک پھیلی ہُوئی تھی اور جنوب میں سارا ایران اور سارا عرب اس کے زیر نگیں تھا۔ اُس کے شکوہ و جلال نے شرق و غرب میں خاندانِ سلجوق کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ آرمینیا میں اُس کے اقبال نے تائیدِ ایزدی سے بازنطینی افواج کو شکست دی اور قیصرِ روم رومانس دیوجانس کو گرفتار کیا۔ اس معرکہ کے بعد الپ ارسلاں دولاکھ کے لشکر کے ساتھ بجانب ترکستان روانہ ہُوا لیکن قضا نے دریائے جیحوں سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی اور یہاں اپنے ہی ایک قیدی کے ہاتھوں

[1] حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ۔

شہید ہُوا اگر اس سے پہلے کہ موت اسے ہمیشہ کے لئے سرزمین غیب کو لے جاتی، اسکی زبان سے یہ قابلِ یادگار کلمات نکلے:۔"میں جب کبھی کسی ملک کی طرف لشکرکشی کے ارادہ سے بڑھا ہوں، میں نے بارگاہِ کبریا سے مدد کی التجا ضرور کی ہے لیکن کل جب میں ایک پہاڑی پر کھڑا تھا تو میری نظر اپنے صف بہ صف اور قطار اندر قطار عساکر پر پڑی اور میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں دنیا بھر کا فرماں روا ہوں اور کوئی طاقت مجھے زیر نہیں کر سکتی - آج خدا نے اپنے ایک نہایت ہی کمزور بندے کے ہاتھوں میرے غرور سر بلندی کو توڑ دیا۔ میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں اور خدائے پاک سے اپنے اس گنہگارانہ خیال کی معافی مانگتا ہوں"۔ الپ ارسلاں آج مرو میں سو رہا ہے اور اُسکے مقبرہ کا کتابہ ہمیں ان الفاظ میں اسلام کے اس فرزندِ جلیل کی داستانِ عبرت سُناتا ہے:۔

سرِ الپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں؟ بہ مرو آ، تا بخاک اندر سرِ الپ ارسلاں بینی!

فتحِ مکّہ ایک اور لحاظ سے بھی اسلام بلکہ دنیا کی تاریخ کشورکُشائی میں شہرتِ ابدی کی سزاوار ہے "لاالٰہ الیوم" کی طاغوتی صدائیں اس شہر میں اسلام کی آمد آمد کی نقیب بنی تھیں لیکن خود اسلام نے آکر سرکشوں کو بھی اپنے دامانِ رحمت میں چھُپا لیا اور شارعِ اسلام نے "الیوم یوم البرّ والوفا" کے اُصولِ عام کا نفاذ فرمایا۔ قریش سے جن کے تشدّد و تعذیب کے باعث اُمتِ مسلمہ کو جلاوطن ہونا پڑا تھا، جب حضور نے پوچھا کہ "تم لوگ مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟" تو ان گمراہوں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ کیسا صحیح جواب دیا:۔"نیک سلوک کی کیونکہ آپ مہربان بھائی اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں"۔ طبری لکھتا ہے کہ قریش کے اس طرزِ کلام پر رسولِ اطہرؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آپ نے فرمایا "آج میں بھی تم سے وہی کہوں گا، جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا:

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ

(آج تم پر کوئی الزام نہیں، خدا تمہیں معاف کرے کہ وہ بڑا ہی رحم کرنے والا مہربان ہے)۔

اگر ایک اتفاقی حادثہ سے، جسے خود قریش کی شرارتِ نفس نے پیدا کیا تھا، قطع نظر کیا جائے تو خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر کسی شہر کو فتح کرنے کی یہ مثال اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ غیور قبائل جن کی آتشِ غضب بات بات پر بھڑک اٹھتی تھی، صرف ایک انسانؐ کے روحانی تصرف کی بدولت، کس صلح و سکون کے ساتھ اپنے دشمنوں کے جمّ غفیر کو چیرتے ہُوئے، قریۂ مقدسۂ ابراہیمؑ میں داخل ہو رہے تھے! چند ہی سال بعد

چشم فلک نے ایک اور محترم شہر میں ایسے ہی پُرامن داخلہ کا نظارہ دیکھا۔ بیت المقدس میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ اُسی شان کے ساتھ داخل ہوئے جس کا اوّلیں جلوہ فتح مکّہ کے دن دُنیا دیکھ چکی تھی۔ اب بھی وہی ادائے انکسار دلوں کو لُبھا رہی تھی، اب بھی فاتح اسی طرح ایک اونٹ لئے ہوئے، جسکی سواری میں وہ اور اُس کا غلام برابر کے حصہ دار تھے، اپنے مفتوح شہر کے اندر حلم و تواضع کی تصویر بنا ہُوا داخل ہُوا۔ نہ کوئی خونریزی ہوئی اور نہ ہنگامہ و فساد۔ فقط اتنا ہُوا کہ خلیفۂ اسلام مسیحی بطریق سوفرونیس کے ساتھ باتیں کرتا ہُوا اندر چلا آیا، اور شہر خدا کے ہاتھوں میں تھا! لیکن حروبِ صلیبیہ کے زمانہ میں جب شہزادۂ امن کے پرستار جو آج ہمیں تشدّد کا الزام دیتے ہیں اِس بلد الانبیا کے اندر داخل ہوئے تو اُنکے چند روزہ تسلط کے دَوران میں یہاں میں ایک عیسائی اہلِ قلم کے الفاظ نقل کرتا ہوں "خوردسال بچّوں کو دیواروں کے ساتھ پٹک کر اُنکے مغز پاش پاش کئے گئے۔ شیر خوار معصوم، فصیلوں کے اوپر سے نیچے پھینک دئیے گئے لوگ آگ کے شعلوں میں کبابِ سیخ کی طرح بھون ڈالے گئے۔ بعض آدمیوں کا پیٹ یہ دیکھنے کے لئے چاک کیا گیا کہ شاید انہوں نے سونا نگل رکھا ہو۔ یہودیوں کو اپنے معبد میں گھُسنا پڑا جہاں سب کے سب جلا دیئے گئے۔ تقریباً ستّر ہزار آدمیوں کا قتلِ عام ہُوا اور خود جنابِ پاپائے اعظم کے نمائندہ نے اس جشن میں حصّہ لیا"[1] یہ صرف اس لئے کہ اِن لوگوں کی رہنمائی کے لئے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی زندگی میں کوئی حربی نمونہ نہ تھا اور خالص دُنیوی معاملات اور مقتضیاتِ حکومت کے لئے انہیں رومتہ الکبریٰ کی مشرک سلطنت کے نقشِ قدم پر چلنا پڑا کہ یوروپ کے تمام ممالک کا سیاسی شجرۂ نسب اسی بُت پرست حکومت سے ملتا ہے مگر جب رسول غازی اور نبی مجاہد علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا نمائندہ صلاح الدین ایّوبی دوبارہ مدینۃ الرسل میں خدا کی رحمتوں کا پیغام لایا تو اس نے تمام مسیحیوں کو آزاد کر دیا اور اُنہیں نقدی اور خوراک دیکر امن و عافیت سے رخصت ہو جانے کی اجازت دی، کیونکہ اسلام اپنے مفتوحوں کے ساتھ ہمیشہ سے ایسے ہی حسن سلوک کا خُوگر رہا تھا۔

فتح مکّہ کے بعد آنحضرت نے مہاجرینِ مظلومین کو اُنکی غصب شدہ جائدادیں بھی واپس نہ دلائیں[2]۔ خود حضورؐ کے پدری مکان پر عقیل ابن ابی طالب نے جو ہنوز نا مسلمان تھے، قبضہ کر رکھا تھا مگر جب لوگوں نے پوچھا "کیا حضورؐ اپنے دولتخانہ پر قیام نہ فرمائینگے؟" تو آپ نے فرمایا "عقیل نے ہمارے لئے مکان کہاں چھوڑا!"[3] تمام صحیح اسلامی

---

[1] یورپ کی تاریخ ارتقائے ذہنی" مصنفہ ڈاکٹر ڈریپر۔ [2] زاد المعاد۔ [3] سیرت شبلی ؛

فتوح و محاربات میں عساکرِ اسلام نے یہی پاک اُصول پیش نظر رکھا۔ مسلمانوں کی تاریخ کشورکشائی خلافتِ راشدہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے اور عرب سے باہر پہلا قابلِ ذکر مقام جو اسلام کے قبضۂ اقتدار میں آیا، حیرہ تھا حضرت خالد ابن ولیدؓ نے جو فتح مکہ کے بعد کے نظاروں سے درسِ بصیرت لے چکے تھے، اہلِ حیرہ کو ہر طرح کی سیاسی و مذہبی آزادی عطا کی اور شہر کی عنانِ حکومت بدستور رُؤسائے شہر کے ہاتھ میں رہنے دی گویا اُس مثال کا اتباع کیا کہ حضور شارعِ اسلامؐ نے مکہ پر قابض ہونے کے بعد بیت اللہ کے موروثی کلید برداروں کو اُن کی معزز خدمت سے بے دخل نہیں کیا تھا۔ باوصف حضرت خالد ابن ولیدؓ کی اس سالمت و رواداری کے خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تاکید تھی کہ وادیٔ فرات کے کاشتکار اپنی زمینوں سے محروم نہ کئے جائیں۔ جنگ کے مروج مفہوم اور جہاد فی سبیل اللہ میں یہی فرق ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض نہایت سیاہ دل اور گمراہ کفار کو سخت سزائیں ضرور دی ہیں لیکن صرف اُس حالت میں جب اُن کی شقاوت حکم وارشادِ الٰہی کی بقا و استحکام کے لئے موجبِ خطر بن گئی آپ کی صُلح اور جنگ، آپ کا حُب اور بُغض حقیقی معنوں میں خدا کے لئے تھا، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول بالکل سچ ہے کہ حضورؐ نے بجز تحفظِ محارم الٰہی کی نیت کے، کبھی کسی کو ذاتی ایذا آزار یا مظلومی و ستم کشی کی سزا دینے کے لئے، دامانِ رحم کے سایۂ عطوفت سے نکال کر انصاف کی عدالت میں کھڑا نہیں کیا[۱]۔ نہ صرف ذاتی اشتدادات معاف کر دیئے جاتے تھے بلکہ حضور رحمۃ للعٰلمینؐ کا کرم ہر اُس خطا کا پردہ پوش ہوجاتا تھا جو اسلام اور خدا کے پیغام کے لئے مستقل طور پر خطرناک نہ ثابت ہونے والی ہو۔ حدیبیہ کا واقعہ ہے کہ اسّی آدمیوں نے علی الصبح کوہ تنعیم سے اُتر کر نماز پڑھتے ہوئے مسلمانوں کو قتل کر ڈالنا چاہا لیکن سب کے سب خود گرفتار ہو گئے۔ حضور نے انہیں کسی قسم کی سزا دئے بغیر رہا کر دیا کیونکہ ان لوگوں سے اسلام کو، بحیثیت ایک دین و ملت کے مٹ جانے کا کوئی قائم و ثابت اندیشہ نہ تھا۔ ہندہ اور وحشی کی قساوتِ قلب سے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی دردناک شہادت کی یاد وابستہ تھی لیکن فتح مکہ کے بعد مکہ کے خطا پوش فاتح کی رحمت نے ان دونوں شرمسار مجرموں کی خطا کاریوں کو ڈھونڈ نکالا اور ہبار بن الاسود کے ساتھ جو ایک لحاظ سے حضورؐ کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کا قاتل تھا، یہ دونوں بھی معاف کر دئے گئے اور بس کہ آپؐ جیسے فنا فی اللہ انسان کے لئے ذاتی ایذا کا انتقام کلیتہً خارج از تصور تھا۔ میں نے اس مضمون کے آغاز میں ایک مقام پر لکھا تھا کہ ہر پیغمبر اپنے ساتھ ایک عظیم الشان روحانی قوت لاتا ہے جو اُسکے

[۱] بخاری از مشکوٰۃ صفحہ ۴۴۲

ابنائے جنس کے دلوں پر ایک آسمانی لرزش طاری کر دیتی ہے۔ عرب میں یہ قوت اب کرشمہ سنج ہو چکی تھی۔ اس کا ایک جلوہ دنیا نے اُس وقت دیکھا جب ذوالفقارِ حیدری ایک یہودی کی گردن تک پہنچتے پہنچتے رُک گئی جس نے یہ سمجھ کر کہ اب آخری ساعت آ پہنچی۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے روئے مُبارک پر تھوک دیا۔ وہی شمشیرِ جوہردار جسے اِس مزید تحریکِ اشتعال پر برقِ خاطف کی طرح گرنا چاہیئے تھا، اب نیام کے اندر تھی۔ کیونکہ وہ جذبۂ حقہ جو شمشیر زنؓ کے مقدس دل میں بسا ہُوا تھا، اب شاید ذاتی تکلیف کے خیال سے آلودۂ غیظ و غضب ہو چکا تھا اور یہ محال تھا کہ رسُولِ اطہرؐ کا ایسا سچا عقیدتمند نورِ ایمان کو شائبۂ نفسانیت سے ملّوث کرے۔ یہودی زندہ رہا، مگر یہودیّت کے لئے نہیں بلکہ اسلام کے لئے

وصلّی اللہ علیٰ نورٍ کزو شد نورہا پیدا

باقی — حمید احمد خاں

اقوالِ زرّیں

ہر چیز اپنی نوع کے بموجب زندہ رہتی ہے۔ دل محبت سے عقل صداقت سے اور انسان کی اعلےٰ فطرت خدا کے ساتھ اک گہرے تعلّق سے زندہ رہتی ہے۔

زندگی دنیا کے قید خانہ کا داروغہ ہے اور موت ایک فرشتہ جو ہماری مرضی کے خلاف اُسکے مضبوط دروازوں کی آہنی زنجیریں توڑ کر ہمیں آزاد کر دیتا ہے۔

زندگی کی تکمیل موت سے ہوتی ہے۔

ہمارے اردگرد ہزاروں لاکھوں راستے ہیں اور وہ سبھی قبر کی طرف جاتے ہیں۔

خمخانۂ ہست

حُسنِ مہ نوجواں ہے پُرکیف — تاروں بھرا آسماں ہے پُرکیف
زہرہ کی تجلّیوں میں مستی — نظّارۂ کہکشاں ہے پُرکیف
مے ریز ہے صُبح کا ستارہ — اور مطلعِ ارغواں ہے پُرکیف
ہنگامِ طلُوع کی صبوحی — پُرلُطف ہے بیگماں ہے پُرکیف

خورشید کی ہر کرن ہے مینا
اور جام بدست چشمِ بینا

میخانہ بدوش خود صبا ہے — گلُشن میں سرور بٹ رہا ہے
مُرغانِ چمن کی بذلہ سنجی — غارتگرِ ہوش برملا ہے
جنگل کا نظارہ بیخودی خیز — ساقی نہیں ہر شجر تو کیا ہے؟
گرتے ہُوئے آبشار کا شور — خمّارِ الست کی صلا ہے

چشموں سے شراب بہ رہی ہے
بے کیف نہیں یہاں کوئی شئے

امینِ حزیں

بمبئی سے وینس

لائڈ ٹرسٹینو کمپنی کا جہاز کراکو دیا بمبئی سے یکم جون کو تقریباً ساڑھے دس بجے صبح روانہ ہُوا اور وینس ۱۷ جون کو شام کے ساڑھے پانچ بجے آ لگا۔ اگر نہر سویز میں اتفاقیہ طور پر چھ گھنٹے ضائع نہ ہو جاتے تو ۱۶ جون کو صبح ہی وینس آ پہنچتا۔ جہاز کی زندگی کسی پہلو سے بھی خاص طور پر قابلِ ذکر نہیں۔ جہاز نہایت آرام دہ تھا اور گو وزن میں صرف آٹھ ہزار ٹن ہے مگر اس کی رفتار میں کچھ بلا کی ثقاہت ہے۔ لغزشِ رندانہ کا تو موقع ہی نہ ملا کیونکہ کسی نازک ادا کے صدقے سمندر کو تیور پر بل لانے کی جرأت نہ ہوئی۔ سب سے بڑی لہر وہی تھی جو خود اسی جہاز کے چلنے سے پیدا ہوتی اور جس کے سفید پُر پیچ و خم طرّے پر پانی کے موتیوں میں دھوپ ثانئے ثانئے میں ننھّی ننھّی توسِ قزح پیدا کرتی۔ جہاز سے دُور سطح بحر پر بالکل معمولی سی جنبش تھی۔ چھوٹی چھوٹی لہریں ننھّی ننھّی سفید کلغیاں شکاتی تھیں گویا کہہ رہی تھیں "آؤ اور کھیلو"۔ ایسے بھولے بھالے سمندر سے گلے ملنے کی امنگ جس دل میں پیدا نہ ہو وہ دل نہیں پتھر ہے شاید اسی اُمنگ کے پُورا کرنے کے لئے جہاز میں اسکی بساط کے مطابق چھ فٹ گہرا تالاب بھی تھا۔ یورپین اقوام کی ہر چیز کی طرح یہ تالاب بھی تہ ہو سکتا تھا۔ جب چاہو بھر لو جب چاہو خالی کر کے دیوار میں اُٹھا کر تہ کر کے رکھ دو۔ پیکنگ کا ہنر خداداد ہے اور کرسی، میز، آئینہ، پلنگ، تالاب، مذہب کوئی بھی استعمال کی چیز ہو یورپین ایسی نفاست سے اسے تہ کر کے الگ کر دیتا ہے کہ مشرقی حیوان اسے باور نہیں کر سکتا۔ اس تالاب میں یورپین کیا جوان کیا سن رسیدہ اور کیا لیڈیاں ایک دوسرے سے بڑھ کر جستیں لگاتے۔ آٹھ دس ہندوستانی بھی پیراک تھے اور گرمی کی تلخی سے بچنے کے لئے یہ بھی موقع بے موقع آن کُودتے مگر کیا تالاب کیا میز اور کیا عرشۂ جہاز کالے اور گورے کے درمیان جو خدائی لکیر ہے وہ نہ مٹی پر نہ مٹی۔ درجۂ اوّل کے ڈیڑھ سو مسافر تھے جن میں سے (اگر پارسی ہندوستانی ہیں) پچاس اہلِ ہند تھے اور ان میں سے صرف ایک مُسلمان پارسیوں کے بعد پنجابیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ دو امرتسر کے تاجر دو لاہور کے۔ ایک جالندھر کا۔ ایک کشمیر کا۔ ایک طالب علم کل پنجابی آٹھ تھے۔ پانچ پارسی لیڈیوں کے علاوہ دو بمبئی کی ہندو لیڈیاں تھیں ایک مدراس کی اور ایک الٰہ آباد کی مجموعی حیثیت سے حُسن کا پرچم ہندوستانی کرسیوں پر لہرایا۔ چنانچہ دل مچلتے دیکھے، آنکھیں بچھتی دیکھیں +

میں دیکھتا چلا گیا

ہلکا سا گلابی رنگ کا جُو اجہاز کی جان ہے۔ ادر پہلے تین دن اس بات پر بازی لگتی رہی کہ کون صحیح بوجھتا ہے کہ جہاز نے بارہ بجے سے بارہ بجے تک کتنے میل طے کئے۔ اسکے بعد ایک دن قرعہ اندازی کے طور پر جوا ہوا یعنے ایک تھیلے میں سے جس نمبر کا پرچہ پہلے نکلا اس نمبر کے ٹکٹ والے کو اول درجہ کا انعام ملا۔ چند منٹ جیتنے والے کی خوش قسمتی پر رشک ہوتا تھا۔ جن کا ایک ایک شلنگ جاتا تھا انکے چہرے کہتے تھے دل میں آتا ہے کہ وہ شخص ہمیں کیوں نہ ہُوئے

سولھویں دن یہ چہل پہل ختم ہوئی ا درمحصول گھر سے اسباب نکلتے ہی مسافر اس طرح تتر بتر ہو گئے کہ گویا کبھی ملے ہی نہ تھے۔ اٹلی کے مشہور شہروں میں سے وینس ہی وہ شہر ہے جو رومن شاہنشاہی کے زوال کے بعد بلکہ اسی زوال کے باعث ظہور میں آیا۔ جب شمالی اطالیہ کو وحشی جرمنوں کی ترکتازیوں نے حد سے زیادہ روند ڈالا تو کچھ لوگ بھاگ کر اڈریاٹک ساحل کے قریب کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں پناہ گزیں ہوئے اور ماہی گیری اور کشتی رانی سے بسر اوقات کرنے لگے۔ "مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے"۔ اگر کہیں صادق ہے تو وینس میں۔

یہ جو فوجوں سے بھاگے تھے خود فوج والے ہوئے۔ ادر بحری بیڑے تو وینس میں وہ عظیم الشان تیار ہوئے کہ سولھویں صدی عیسوی میں (جب ترکوں کی سلطنت بحیرۂ روم میں سب سے زیادہ با اقتدار تھی) وینس کے امیر البحر نے ترکوں کے بیڑے کو شکست دیکر ترکوں کا مشہور علم ان سے چھینا اور وہ جھنڈا جس پر لا الہ . . . محمد رسول اللہ ابتک صاف پڑھا جاتا ہے اس وقت تک وینس کے سابق حکمرانوں کے محل کی سقف میں فخریہ لٹک رہا ہے۔ پورے گیارہ سو سال وینس خود مختار رہا ڈیوک (DUKE یا DOGE) عمر بھر کے لئے منتخب کر لیا جاتا اور وہ کونسل کے مشورہ سے کام کرتا تھا۔ سب سے بڑی کونسل وہ تھی جس کے رکن تمام وہ امرا تھے جن کی عمر پچیس سال سے متجاوز ہو۔ پھر ایک دس ارکان کی کونسل تھی اور ایک اور بھی خاص الخاص تین ارکان کی کونسل۔ یہ سب ڈیوک کے مشیر ہوتے تھے اور بسا اوقات اصل حکومت انہی دس کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ گیارہ سو سال میں ۱۲۰ ڈیوک ہُوئے جن میں سے ۱۱۹ کی تصاویر موجود ہیں اور جس کی نہیں وہ اس لئے کہ وہ اس جرم میں قتل کیا گیا کہ وہ غداری کرکے جمہوری سلطنت کی بجائے شخصی مطلق العنانی چاہتا تھا۔ ایکسو تیس سال ہُوئے کہ نپولین اعظم کے ہاتھوں وینس کی

آزادی کا خاتمہ ہوا۔ گو اس سے پہلے بھی بسا اوقات یہ آزادی برائے نام ہوتی تھی مگر اس میں کلام نہیں کہ یہ شہر گیارہ سو سال کی خود اپنی حکومت کا نہایت ہی شاندار نمونہ ہے ؛

سارے وینس میں ایک بھی موٹر کار یا گاڑی یا چھکڑا نہیں۔ نہریں یہاں گلیاں ہیں اور ایک بڑی نہر یہاں کی ٹھنڈی سڑک، بلکہ شہر بھر میں گھوڑے پر بھی کوئی سوار نہیں ہوتا۔ اب بڑی نہر پر موٹر کشتیاں چلتی ہیں شہر میں گاڑی گھوڑا اسٹرکیں نہ ہونے کے باعث شور بہت ہی کم ہے۔ صرف موٹر کشتیوں سے موٹر بائیسکلوں کی طرح ناگوار سا شور پیدا ہوتا ہے۔ ریل بھی اس شہر میں بہت سا سمندر عبور کر کے پہنچتی ہے اور سٹیشن پر جانے کے لئے بھی کشتی کی ضرورت ہے۔ خاص شہر ایک بڑے جزیرے پر واقع ہے مگر اِدھر اُدھر کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن میں ہسپتال ہوٹل کارخانے وغیرہ موجود ہیں۔ وینس کی سب سے بڑی دلفریبی ایک چوک ہے جس میں شام کو باجا ہوتا ہے اور جس کے تین طرف نہایت شاندار دکانیں ہیں اور ایک طرف گرجا سینٹ مارک جو دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس چوک میں رات کے نو دس بجے کے درمیان کم از کم پانچ چھ ہزار مرد و عورت نہایت لطف سے سیر کرتے ہیں یا بیٹھ کر آئیسکریم کھاتے ہیں۔ دکانیں اس قسم کی ہیں کہ اگر شملہ والی لُک اینڈ کیلوی جیسی دو سو دکانیں پہلو بہ پہلو لاہور کے منٹگمری ہال سے تین گنا بلند عمارت کی نچلی منزل میں لگا دی جائیں اور شملہ اور لاہور سے دس گنا زیادہ بجلی کی روشنی کا انتظام ہو تو شاید کچھ اندازہ ہو سکے گو عمارت کی خوبصورتی پھر بھی وہ نہ ہوگی جو یہاں ہے۔ اور نہ وہ خوش قطع لباس اور بےفکری کا نقشہ ہوگا جو ایک کامیاب خودمختار ترقی کرنے والی قوم کا خاصہ ہے ؛

گرجا کئی وجوہ سے بے نظیر ہے یہ وینس کی سابق عظمت و دولت کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور گرجا کیا ہے دنیا بھر کا تصویر خانہ ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جس میں ٹوپی اُتارنے کی ضرورت نہیں۔ گو عمارت کے اندر ہے۔ اس میں بائبل کو تصویروں میں پیش کیا گیا ہے۔ یعنی حضرت آدم کی پیدائش سے حضرت مسیح تک حضرت حوا کا بہشت سے نکلنا۔ ہابیل کا قابیل کو مارنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر تصویریں کس چیز کی ہیں؟ سونے کی۔ شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں سونے کے ورق کو خاص کاریگری سے بند کر دیا ہے۔ اور پھر اسی پچی کاری سے ہزارہا تصاویر کیا گرجے کے اندر کیا باہر بنائی ہیں۔ عمارت کی شان الگ۔ تصویروں کی شان الگ۔ ساٹھ قسم کے سنگ مرمر کی دلآویزیاں علیحدہ اور سومناتھ کی طرح بیش بہا

جواہرات کا مجموعہ طُرہ برآں۔ لاہور یا دہلی کی طلائی مسجد یا امرتسر کا طلائی دربار نہیں کہ سونے کے پترے تھوپ دئیے سونا ہے مگر "عقل" کے ساتھ۔ اس گرجا کے ساتھ ملتا ہُوا پرانا نوابی محل ہے جس میں بعض لاجواب تصاویر ہیں۔ یوں تو اس محل کے در و دیوار ہی نگار خانہ ہیں مگر بعض تصویریں وہ ہیں جن پر کتابوں کی الماریاں لکھی جا چکی ہیں۔ اور ابھی تک دنیا کی تحسین کا خراج برابر جاری ہے۔ ایک تصویر میں ایک ستم ظریف نقاش نے اپنی گھروالی کو دُو دفعہ دکھایا ہے۔ بہت بڑی تصویر ہے تقریباً سولہ گز لمبی اور آٹھ گز چوڑی اور نقاش کا منشا بہشت و دوزخ کا نمونہ پیش کرنیکا ہے۔ چنانچہ اسکی گھروالی ایک طرف تو بہشت میں ہے اور ایک طرف دوزخ میں بیٹھی کلیجہ مسوس رہی ہے۔ خدا جانے میاں بیوی کے درمیان کیا واردات ہوئی کہ یہاں تک نوبت پہنچی ؞

آئنہ سازی، اور لیس کی تیاری یہاں کی مشہور صنعتیں ہیں۔ آئنہ سازی کا کارخانہ دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے شیشے کے گلاسوں اور قدحوں میں وہ باریک سے باریک لیس تیار کر دیتے ہیں اور وہ رنگ بھر دیتے ہیں کہ طلسم سے کم نہیں۔ ایک جگہ شیشہ کا تاگا تیار ہو رہا تھا نرم سے نرم بالوں سے بھی زیادہ نرم۔ زیادہ باریک۔ زیادہ چمکدار۔ اس سے کپڑے بنتے ہیں ؞

(عبدالعزیز)

اقوالِ زریں

جب خوش قسمتی تمہارے دروازہ پر دستک دے تو اُسے اندر بُلالو اور پھر جانے نہ دو ؞

حرص اور عشرت! ان دو وباؤں نے ہر عظیم الشان حکومت کی بیخ کنی کی ؞

جھوٹ ملیامیٹ ہونے کے لئے ہیں ؞

بڑھاپے تک کوئی جھوٹ زندہ نہیں رہ سکتا ؞

(گلچیں)

تخلیات

منزل مری کہاں ہے، نہیں کچھ خبر مجھے
ذوقِ سفر ہی رکھتا ہے گرمِ سفر مجھے

جھک جھک کے دیکھتا ہوں میں طوبیٰ کو عرش کو
کچھ اِس قدر بلند ملی ہے نظر مجھے

زندانِ کائنات میں گھبرا گیا ہوں میں
طوقِ گلو ہے حلقۂ شام و سحر مجھے

نا آشنائے لذتِ حیرانیٔ نگاہ!
کیوں دی ہے آشنائے حقیقت نظر مجھے

پروازِ شوق کی نہ رکیگی، نہ رک سکی
گو آسماں نے کر دیا بے بال و پر مجھے

دیکھو تو میں بھی کس کا ہوں آئینہ دارِ حسن
کہتا ہے ذرہ ذرہ یہی روک کر مجھے

وہ برق رو ہوں وادیٔ ہستی میں اے اثر
رہبر سمجھ رہا ہے مرا راہبر مجھے

"اثر صہبائی"

محمد تغلق

محمد تغلق کے حالاتِ زندگی بالکل ظلمت و تاریکی میں ہیں مؤرخین نے اسکے صفاتِ حمیدہ کی طرف توجہ تک نہ کی بلکہ جب کبھی انہوں نے اسکے زمانے کی تاریخ پر قلم اُٹھایا تو اسے متضاد صفات کا مجموعہ بنایا ظالم اور بیرحم ٹھہرایا پاگل بتایا اور دماغ میں عیوب نکالے مُورخین میں بہت ہی تھوڑے ہیں جو اس شریف انسان کو انصاف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

محمد تغلق پر اسکے مہربان مُورخین نے جو الزامات لگائے ہیں جی یہ چاہتا ہے کہ اُنکی تشریح سے پہلے میں اس راز کا انکشاف کروں جس کی بنا پر مُورخین کو اسکی شکایت کرنیکا اچھا موقع ہاتھ آگیا جس طرح سترھویں صدی میں انگلستان میں وگ (Whig) اور ٹوری (Tory) کے نام سے مُلک میں دو جماعتیں قائم تھیں جن کے اختلاف نے مُلک میں شور و شر برپا کر رکھا تھا بعینہ اُسی طرح محمد تغلق کے دَورانِ حکومت میں ہندوستان میں بھی دو جماعتیں تھیں جو سلطنت کی باگ ڈور کو دو متضاد سمتوں میں کھینچ رہی تھیں ایک جماعت اُن لوگوں کی تھی جنکا خیال تھا کہ ہندو یا مُسلمان، پارسی یا یہودی، جو بھی حکومت کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو اچھے سے اچھے عہدہ پر جسکو وہ بخوبی نباہ سکتا ہو مقرر کیا جائے اسی جماعت کا سب سے بڑا رُکن یا صدر خود محمد تغلق تھا وہ نہ ہندوؤں کا پرستار تھا نہ مُسلمانوں کا غلام نہ مُلکیوں کا طرفدار نہ ولائیتیوں کا دُشمن۔ کابل و ایران کے ولائیتی اور ہندو دکن کے مُلکی خواہ کسی مِلت کے پیرو ہوں اسکی نگاہ میں بالکل برابر تھے ہر شخص کو اسکی استعداد کے مطابق کاروبارِ سلطنت میں حِصّہ دیا جاتا اور اس سے سرکاری خدمت لی جاتی تھی دوسری جماعت ان ولائیتیوں کی تھی جو چاہتے تھے کہ جتنی طرفداری ممکن ہو پردیسی مُسلمانوں کے ساتھ برتی جائے "خطرناک ہندیوں" کو مُلک کے کسی انتظام میں حِصّہ نہ دیا جائے اسی جماعت کے نمک خواروں میں سے برنی بھی تھا جو اپنے وقت کا سب سے معتبر مُورخ مانا جاتا ہے ظاہر ہے کہ محمد تغلق کا انتظامِ سلطنت برنی کی خواہش کے مطابق نہ تھا اور یہ محمد تغلق کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ اس کے عہد کا معتبر ترین مُورخ برنی ہے ؎ "ولیکن قلم درکفِ دشمن است"

یہ انصاف پرست مُورخ اُسکو ظالم و بے رحم بتاتا ہے کیونکہ اس نے خراج میں اضافہ کیا دارالخلافہ کی جگہ بدل دی۔ تانبے کے سکے جاری کئے اور ظلم تو یہ ہے کہ وہ اسکو سخی بھی کہتا ہے مگر اسی سخاوت کو عنوان بنا کر

جس قدر اس کی بُرائی کر سکتا ہے نہایت صفائی کے ساتھ بیان کر جاتا ہے اسکی انصاف پرستی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ وہ کسی قدر منصف مزاج یا کسی قدر جویائے علم و عمل بھی تھا۔ اس کے یک طرفہ فیصلے کا یہ نتیجہ ہُوا اور یہی ہونا بھی چاہیئے کہ بہت سے مورخین کو سونے میں سہاگہ ملانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا +

اس سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ محمدؐ تغلق کے سر الزاموں کا جو طومار ہے وہ صرف چند باتوں کی وجہ سے ہے اور یہی باتیں کوتاہ بین مؤرخین کی نگاہوں میں کھٹک رہی ہیں +

محمدؐ تغلق پر سب سے بڑے چار الزامات ہیں (۱) خراج کا بڑھانا۔ (۲) دار السلطنت کو دہلی سے دیوگری یا دولت آباد لے جانا۔ (۳) تانبے کے سکّے رائج کرنا۔ (۴) حد سے زیادہ سخاوت کرنا +

۱۔ محمدؐ تغلق نے صرف دوآبِ بنارس اور دوآب دریائے سندھ و گنگا ہی میں خراج کا اضافہ کیا تھا، اور کہیں اس تغیّر کا اثر نہ ہُوا، اس موقع پر سوال یہ ہے کہ کیا محمدؐ تغلق کی حکومت ان تمام ضروریات سے بے نیاز تھی جن سے مجبور ہو کر آج کی متمدن سے متمدن حکومت آئے دن رعایا کی جیبیں ٹٹولتی ہے اگر وہ بے نیاز نہ تھا اور یقیناً نہ تھا تو یہ بتاؤ کہ علاقۂ دوآب سے نہیں تو اور کہاں کے لوگوں سے یہ زیادہ خراج لیا جاتا کیا چٹیل میدانوں اور ریگستانی علاقوں سے؟ اگر یہ سچ ہے کہ ٹیکس زیادہ تر زرخیز مقامات ہی کے لوگوں پر بڑھایا جاتا ہے تو اب اس سوال کی گنجائش ہی نہیں کہ دوسری جگہ خراج کیوں نہیں بڑھا۔ سب سے اہم بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیئے یہ ہے کہ اتنا خراج نہیں بڑھایا گیا تھا۔ کہ رعایا کسی حالت میں ادا نہ کر سکتی لیکن بادشاہ و رعایا دونوں کی بدقسمتی سے اسی سال قحط بھی پڑ گیا رعایا غریب مجبور ہو گئی اور خراج کے ادا کرنے میں دشواریاں پیش آئیں، ورنہ بذاتِ خود خراج میں اضافہ کرنا جبکہ حکومت کو اسکی ضرورت ہو نہ تو کوئی عیب ہے اور نہ کوئی ظلم۔ ٹھنڈے دل سے غور کرو اور بتاؤ کہ کیا موجودہ صدی میں ٹیکس نہیں لیا جاتا اور کیا یہ ٹیکس پہلے کی بہ نسبت زیادہ نہیں ہے اور اس پر بھی آئے دن سرکاری مطالبات میں اضافہ نہیں ہُوا کرتا جس سے کہ دنیا کی کوئی آبادی محفوظ نہیں۔ یہ تو ایک منحوس موقع تھا جو کہ آخر الذکر جماعت کو خوش قسمتی سے مل گیا جس کی بنا پر انہوں نے ملک میں جا بجا بغاوتیں پھیلانے کی کوشش کی اور جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو جنگل کو بھاگ کھڑے ہُوئے مگر محمدؐ تغلق نے ان مفسدوں کو گھیر لیا اور شاہی "تعزیرات" کے مطابق سزائیں دیں۔ غالباً یہ بعض مورخین کی دانستہ غلط فہمی ہے کہ محمدؐ تغلق نے اپنی بھاگی ہُوئی معصوم رعایا کو تباہ و برباد کرنیکی غرض سے یہ فوج بھیجی تھی۔ بادشاہ کو اپنی مصیبت زدہ

بیگناہ، اور امن پسند رعایا کا اتنا خیال تھا کہ اس نے چار مہینے تک خیرات کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس کے باعث غربا اور مفلسوں کا طبقہ زمانۂ قحط کو قحط نہ سمجھ سکا۔ رہے کسان جو خیرات نہ لے سکتے تھے انکو آئندہ فصل کی ترقی اور عمدہ کاشت کرنیکی غرض سے سلطنت نے تقاوی تقسیم کی اس سے ہم تو یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس نے فوج بھیجی تو مفسدین کے خلاف اور پرامن رعایا کی ہرطرح مدد کی لیکن برنی اور برنی کے غیر متعصب بے لوث اور انصاف پرست شاگرد بتاتے ہیں کہ یہ محمد تغلق کے متضاد کیرکٹر کا نتیجہ ہے ۔

۲۔ ہمکو اقرار ہے کہ محمد تغلق اپنا تاج و تخت دہلی سے دیوگری یا دولت آباد لایا، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ کسی ملک کا جغرافیہ جانے بغیر اسکا تاریخی انقلاب سمجھنا مشکل ہے، جبتک کہ ایک شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ محمد تغلق کی حکومت کن کن میدانوں پر کن کن صحراؤں میں اور کن کن پہاڑوں پر تھی، وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ دارالخلافہ کا ہٹانا اچھا تھا یا برا۔ اس سے تو ایک بیوقوف بھی منکر نہیں ہے بلکہ ہر شخص یہی کہیگا کہ اسکا تمام آبادی کو دہلی سے دولت آباد لے جانا نہ محض ظلم تھا بلکہ انتہا درجہ کی حماقت تھی۔ لیکن ایک جگہ سے دوسری جگہ تخت و تاج کا منتقل کرنا نہ تو ظلم تھا نہ جنون۔ اس موقع پر یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ اسکی سلطنت تین بڑے حصّوں میں منقسم تھی (۱) دوآبہ بنارس و دوآبہ دریائے سندھ و گنگا (۲) گجرات (۳) مدراس کی موجودہ کمشنری کا کچھ حصّہ جو زمانۂ قدیم سے جزوِ سلطنت تھا اور علاوہ اسکے وہ جدید مفتوحہ علاقہ جو دکن سے چھینا گیا تھا ۔

یہ زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان میں سفر کرنیکا نہ تو کوئی معقول انتظام آج سا تھا اور نہ خط و کتابت کرنیکا کوئی زود کار نظام کرنا ممکن تھا ضرورت یہ تھی کہ ایسی حالت میں دارالخلافہ ایسی ہی جگہ پر قرار دیا جائے کہ جہاں سے ہرطرف کا فاصلہ برابر ہو اور ہرطرف جانے میں آسانی ہو۔ شمالی ممالک کی حالت جنوبی سے بہتر تھی کیونکہ وہاں کی حکومت ایک زمانے سے قائم اور مستحکم تھی اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے محمد تغلق نے اپنے وزیر کو شمال میں چھوڑا اور خود جنوب میں جاکر ملک کا دارالسلطنت دولت آباد یا دوگری کو بنایا۔

چونکہ یہاں پر نئے سرے سے حکومت قائم کرنا تھا، پہلے تو اس نے صرف سرکاری دفاتر منگائے پھر تین سال بعد جب اس نے یقین کرلیا کہ یہ جگہ سیاسی اغراض کے لئے دہلی سے زیادہ مناسب ہے تو اس نے دہلی کے تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں سے آنے کی خواہش ظاہر کی اور وہ بہت خوشی سے دہلی سے دولت آباد اپنا مالی فائدہ سوچ کر آئے۔ کیونکہ اس زمانے کا اصول تھا کہ جہاں کہیں سرکاری دفاتر ہوتے یا بادشاہ اور اسکے گورنر ہوتے۔ وہیں کی آبادی ہمیشہ بڑھتی رہتی اور تجار کو اپنی تجارت کا فروغ بھی

وہیں نظر آتا۔ یاقوتِ ہمدانی موجب البلدان میں ایک موقع پر آبادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے اور کتنا سچ لکھتا ہے کہ شہر وہیں آباد ہوتے ہیں جہاں بادشاہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تجار اور دوسرے پیشہ ور بہت خوشی سے دلی کو خیرباد کہنے کو تیار ہو گئے ۔

پرانے زمانے میں سلاطین کا یہ دستور تھا کہ جب کبھی کوئی نیا شہر بساتے لوگوں کو بلانے سے پہلے اُنکے رہنے سہنے، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے غرضکہ تمام ضروریات کے سامان مہیا کر لیتے۔ پھر لوگوں سے شہر بسانے کی خواہش کرتے۔ محمد تغلق نے بھی یہی کیا، یہ ہمیشہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔ محمد تغلق بھی ناکام نہ رہ سکتا۔ کیونکہ عوام یہاں پر خوشی سے بسنے کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ لیکن آخر میں ان کی ہمتیں آب و ہوا کی خرابی نے پست کر دیں اور وہ تجارتی مفاد کو امیدِ صحت پر قربان کر کے بادلِ ناخواستہ واپس چلے گئے۔ یہ کہنا ظلم نہیں بلکہ جہالت ہے کہ جب بادشاہ نے دہلی کی حالت خراب دیکھی تو اس کا دل بھر آیا اور اُس کو دوبارہ آباد کرنے کی سوجھی جیسا کہ مورخین کا خیال ہے ۔

۳۔ اس مجنون کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ اُس نے تانبے کے سکّے جاری کئے اِس کے متعلق ہمکو صرف اس قدر کہنا ہے کہ اُس زمانے میں نہ تو ہندوستان کی بے شمار کانوں کا پتہ چلا تھا اور نہ غیر ممالک سے سونا، چاندی آنا بہت آسان تھا کیونکہ ہر ملک اس کی کمی محسوس کر رہا تھا تو بتاؤ یہ مجنوں بادشاہ اتنی مقدار میں سونا چاندی کہاں سے لاتا کہ سارے ہندوستان کے کاروبار میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوتی۔ آج بیسویں صدی میں اگر کوئی شخص تانبے۔ نِکل اور کاغذ کے سکّوں پر اعتراض کرے تو اُسے احمق کہدیا جائیگا لیکن محمد تغلق کے زمانے کے مورخ تانبے کا سکّہ چلانے کو جنون کی علامت کہتے ہیں۔ تجارتی کاروبار کو عروج دینے کے لئے ضرورت تھی کہ ایسی چیز کے سکّے رائج کئے جائیں جو آسانی سے مہیا ہو سکتی ہو۔ تانبا ہندوستان میں بکثرت پایا جاتا تھا اور گویا اُس نے ایک بے کار چیز سکّوں کی صورت میں ڈھال کر ایک باکار چیز بنا دی۔ اور اس طرح مُلک کی دولت میں ایک خاص اضافہ کر دیا۔ اکثر مورخین کاغذ کے سکّے کو تانبے پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کاغذ اس سے کہیں اچھا ہوتا۔ مگر یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اسی زمانے میں مُلک فارس میں بہت بڑا انقصان محض کاغذ کے سکّوں کی وجہ سے ہو چکا تھا۔ ایک غلطی جسکا اعتراف ہر منصف مزاج کریگا صرف یہ تھی کہ اُس نے سکّوں پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا۔ جس کی وجہ سے ہر گھر خزانہ ہو گیا۔ لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں اس زمانے میں سکّوں کی قیمت اُسی قدر ہوتی تھی جتنی کہ مالیت سکّے میں ہوتی تھی

آجکل نقد نام ہے سکّوں کا۔ اُس زمانے میں نقد سونے چاندی کو کہتے تھے +

۴ - ہمارے انصاف پسند مؤرخ جہاں اس پر اور بہت سے الزامات لگاتے ہیں وہاں ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ نہایت سخی تھا۔ اسکی سخاوت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُس نے عوام پر ظلم (اُنکے الفاظ ہیں) ڈھائے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ سخاوت بُری چیز ہے یا اچھی اگر بُری ہے تو ایشیا کا کوئی بادشاہ اس جُرم سے پاک نہیں۔ اگر سخاوت جُرم ہے اور سلاطینِ ایشیا اسکے مُجرم ہیں تو محمّد تغلق کو بھی مجرم کہنا بیجا نہیں لیکن اگر سلاطینِ ایشیا اس جُرم سے بے نیاز ہیں تو محمّد تغلق کو اس جرم کا مرتکب ٹھہرانا تعصب کو راہ دینا ہے +

ایشیا کے بادشاہوں کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ جب کبھی کسی سے خوش ہُوئے۔ اُسے جس قدر خلعت اور انعام ہوسکا دیا۔ یہ بات نہ صرف پرانے زمانے ہی میں پائی جاتی تھی بلکہ اس کی مثال اب بھی پائی جاتی ہے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے جبکہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم قسطنطنیہ گئے وہاں انہیں سلطان المعظم نے انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا۔ اب یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر یہ انکا جرم تھا تو محمّد تغلق بھی مجرم ہے ورنہ یہ مؤرخین کا ظلم ہے جو اُسکو ظالم بیان کرتے ہیں +

حامد حسین اعظمی

اقوالِ زرّیں

محبت اک پرانی داستان ہے پھر بھی ہر گھڑی نئی ہے

محبت آپ اپنا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔

محبت میں ہم سب برابر کے بیوقوف ہیں۔

ہم نصیحت چاہتے ہیں لیکن دراصل ہماری مراد تعریف ہوتی ہے

تصویر نظم ہے بغیر الفاظ کے۔

مصوّر اور شاعر دونوں اپنے فن میں شتر بے مہار ہیں۔

فن حاسد ہے وہ انسان کی ساری توجہ چاہتا ہے۔

گلچیں

ایثار

فطرتِ نسوانی کے ایک روشن پہلو کا مطالعہ

"لیکن کوکب تمہیں اپنے فیصلہ پر مُصر نہ رہنا چاہیئے"

ان الفاظ کی متکلمہ شیشے کے مشہور پارسی سوداگر سیٹھ بومن جی کی بیوی رتن بائی تھی جو اپنے بنگلہ کے آراستہ کمرہ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھی اپنی خوبصورت لڑکی مس کوکب سے اُسکی شادی کے متعلق گفتگو کر رہی تھی۔ کوکب بیس سال کی نوجوان لڑکی، اعلیٰ تعلیمیافتہ، نئے خیالات کی پرستار اور بالخصوص روشن خیال نسوانی جماعت کے اُس طبقہ سے تعلق رکھتی تھی جس نے جنس قوی کی اصلاح کو اپنا منتہائے نظر بنا رکھا تھا۔ سیٹھ بومن جی کے والد ۱۸۷۳ء میں بمبئی سے بغرض تجارت لاہور آئے تھے اور یہیں کے ہو رہے، نہ صرف پارسی سوسائٹی میں وہ اپنی شخصیت اور تمول کے لحاظ سے ممتاز تھے بلکہ عام طبقۂ تجار میں بھی اُنہیں اُصولِ تجارت کی پابندی اور لین دین کے معاملہ کی صفائی کے باعث ایک امتیازی درجۂ عزت حاصل تھا۔ سیٹھ بومن جی کے صرف دو اولادیں تھیں ایک لڑکا کیکاؤس جی۔ جو عنفوانِ شباب ہی میں راہئ ملکِ عدم ہُوا اور ۵ سال کی ایک ننھی سی لڑکی اپنی نشانی چھوڑ گیا اور دوسری کوکب جو اس وقت اپنی عمر کے بیسویں سال میں تھی۔ کوکب کی تعلیم زیادہ تر بمبئی میں ہُوئی تھی مگر انٹرنس کا امتحان اُس نے لاہور ہی کے ایک سرکاری مدرسہ میں اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ کوکب نہ صرف دلاویزئ حُسن کے باعث اپنی محدود برادری کے تمام افراد میں عزت و محبت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی بلکہ وہ اپنے لحنِ خداداد کی بدولت ہر معاشرتی و مذہبی مجلس کے لئے وجہِ زینت تصوّر کی جاتی تھی۔ کوکب نا کتخدا تھی اور چاہتی تھی کہ اگر اُسکے والدین اجازت دیں تو وہ سیٹھ ڈنشا کوپر کے لڑکے جہانگیر سے شادی کرلے لیکن سیٹھ بومن اور اُسکی بیوی دونوں کو اس رشتہ پر اعتراض تھا۔ جہانگیر اگرچہ متمول باپ کا لڑکا تھا مگر اپنی بُری عادات کی بدولت تمام برادری میں بدنام و رسوا ہو چکا تھا۔ سخت شرابی۔ جوئے کا رسیا اور طرہ یہ کہ بیکار۔ لیکن تھا نہایت وجیہہ و خوبصورت۔ اُس کی رسیلی آنکھوں میں عشق و محبت کا وہ کیف تھا کہ ایک ہی نگاہ میں دیکھنے والے کو سرشار و بیخود بنا دے۔ کوکب کو اُس سے محبت ضرور تھی لیکن سب سے زیادہ خیال اس بات کا تھا کہ وہ اپنے پاکیزہ چلن اور قوت ارادی سے جہانگیر جیسے بدچلن آدمی کو شریف النفس اور فرشتہ خو انسان کے سانچے میں ڈھال کر دیگر مستورات کے سامنے ایک

قابل تقلید مثال قائم کرے کہ کس طرح عورت کا کمزور و نازک ہاتھ جنسِ قوی کی درستی و اصلاح کی قابلیت رکھتا ہے جہانگیر میں گو سینکڑوں بُرائیاں تھیں مگر وہ بھی کوکب کو سچے دل سے چاہتا تھا بایں ہمہ کوکب کے والدین کو یہ رشتہ سخت ناگوار تھا سیٹھ بومن نے کئی دفعہ سمجھایا۔ ماں نے کئی کئی گھنٹے تک تلخی و نرمی سے کہا مگر بے سود کوکب پر جہانگیر کے عشق کا جادو چل چکا تھا۔ وہ ماں کے ہر فلسفیانہ فقرہ کا یہ جواب دیتی "امی جان مجھے جہانگیر کی نسبت سب باتوں کا علم ہے لیکن میں آپکو یقین دلاتی ہوں کہ میرے ساتھ رہنے کے بعد وہ بالکل درست ہو جائیگا"۔

کوکب کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر تجربہ کار عورت کا ممتا بھرا دل جل جاتا اور وہ محسوس کرتی کہ جوانی کے نشہ نے بھولی بھالی معصوم لڑکی کو از خود رفتہ بنا رکھا ہے۔ کوکب اگرچہ اس شادی کے نتائج سے آنکھیں بند کئے ہُوئے تھی لیکن اُسکی جہاندیدہ ماں کے سامنے ایسی محبت آمیز شادیوں کی کئی پُر مذلت مثالیں موجود تھیں جہاں شرافتِ مجسم لڑکیاں ایسے اوباش مزاج انسانوں کے ہاتھوں میں اپنی قسمت کی باگ دیکر عمر بھر کیلئے نصیبوں کو رو رہی تھیں۔ ایک شام کھانے سے فارغ ہو کر ماں بیٹیاں گول کمرہ میں بیٹھی اسی مبحث پر گفتگو کر رہی تھیں کہ ادھیڑ عمر کی عورت نے اپنی آنکھوں پر چشمہ درست کر کے کہا "لیکن کوکب تمہیں اپنے فیصلہ پر مُصر نہ رہنا چاہیئے"۔

یہ کہہ کر وہ ایک منٹ کے لئے خاموش ہو گئی معاً دوسرے لمحہ میں اپنی نشست درست کر کے بولی "کیا والدین کا حقیقی اولاد پر کوئی حق نہیں ہوتا کہ وہ اُنکی مرضی کے خلاف عمر بھر میں ایک بات بھی منوا سکیں اور بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہ اُنہیں کی بہتری کے لئے ہو۔ عزیز من ہمیں تمہارے ساتھ کوئی عداوت تو ہے نہیں جو تم یوں ضد کئے جاتی ہو۔ . . . . . کیا تم انکار کر سکتی ہو کہ ایسی بے جوڑ شادیاں ہمیشہ ناکام رہی ہیں اور طرفین کے لئے باعثِ رنج و الم؟"

ماں کے ترش لہجہ سے متاثر ہو کر کوکب کرسی پر سیدھی بیٹھ گئی اور اخبار کو ایک تپائی پر رکھکر حیرت و استعجاب سے اُسکے تمتمائے ہُوئے چہرہ کی طرف دیکھنے لگی۔ پیشتر اسکے کہ وہ اپنی زبان سے کوئی کلمہ نکالتی بوڑھی عورت نے بلند آواز میں کہا "اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ والدین کی نافرمانی کا ایک نتیجہ تو ابدی مصائب میں مبتلا رہنا ہے اور دوسرے . . . . دوسرے باپ کی ریاست سے بھی محروم ہو گی جو ورا ثتاً تمہیں پہنچتی ہے"۔

گویہ الفاظ کوکب کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے کے لئے کافی تھے مگر وہ ایسے اوچھے ظرف کی عورت نہ تھی کہ اتنی سی گفتگو سے مشتعل ہو کر اپنے پائے ثبات میں لغزش پیدا کر لیتی۔ اُسکے پیشِ نظر ایک کام تھا۔ ایک شریف ترین کام یعنی ایک شخص کی زندگی بنانے کے لئے اپنی زندگی تباہ و برباد کر دینا۔ لیکن اس قسم کی معمولی دھمکیاں غالباً ایسے اشخاص کے لئے ہمیشہ بیکار سمجھی گئی ہیں جنکا منتہائے نظر جان بیچ کر کسی محبوب مقصد کا حاصل کرنا ہو۔ اور کوکب کے معاملہ میں بھی ایسا ہُوا اور ایسا ہونا چاہیئے تھا۔ جب ہر نوع کی دھمکیوں کا منتر کوکب کے سحرِ عزم و ثبات کو باطل نہ کر سکا اور ہر ایسا حربہ جو اس جنگ میں استعمال ہو سکتا تھا ناکام ثابت ہُوا تو سیٹھ بومن اور اُس کی بیوی نے چار و ناچار کوکب کو اجازت دے دی کہ وہ جس سے چاہے شادی کر لے۔

اس فیصلہ کے تین ماہ بعد جب کوکب کا عروسی جوڑا بالکل تیار ہو چکا تھا اور اُسکی سہیلیوں نے مراسمِ نکاح کے بعد کا گانا بھی اچھی طرح یاد کر لیا تھا اور اُس وقت کہ دعوت کے تمام خطوط بھی تقسیم ہو چکے تھے رات کے دس بجے کے قریب ایک منحوس خبر نے جامِ آرزو کو ٹھکرا کر مسرت و شادمانی کی ساری مے بہادی اور سازِ محبت کے سرور انگیز نغمے موت کی بھیانک چیخوں میں تبدیل ہو گئے ـــــــ جہانگیر نے نشہ کی حالت میں اپنے ایک دوست کے منہ سے کوکب کے خلاف کوئی ناشائستہ فقرہ سُن کر اُسے پستول سے ہلاک کر دیا تھا۔

اس خبرِ وحشت اثر نے سیٹھ بومن کے تمام گھرانے کو وقفِ رنج و الم کر دیا اور کوکب کی تو پوچھیئے ہی نہ کہ کن خیالوں میں غرق تھی۔ سیٹھ بومن اُسی وقت سوار ہو کر ڈنشا کوپر کی کوٹھی پر گئے تو معلوم ہوا کہ جہانگیر پولیس کی حراست میں ہے اور یہ سُن کر اور بھی رنج ہُوا کہ ڈاکٹر اُردشیر کی بجائے، جسکے منہ سے اشتعال انگیز الفاظ نکلے تھے، گولی رستم جی کے سینے میں لگی جو بمبئی کے مشہور سوداگر خان بہادر سیٹھ سہراب جی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اور چندروز کے لئے تجارتی اغراض کی خاطر لاہور آیا تھا۔ رات کے دو بجے کے قریب سیٹھ بومن اپنی کوٹھی کو واپس ہوئے اور بیوی اور لڑکی کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ رات تو جوں توں آنکھوں میں کٹی اور صبح سویرے ہی سے مقدمہ کی تیاریاں ہونے لگیں مگر قسمت کی بدنصیبی دیکھئے کہ اس واقعہ کے دو ماہ بعد جب سشن جج کی عدالت سے جہانگیر کے لئے موت کی سزا تجویز ہوئی تو سیٹھ ڈنشا کوپر کا دیوالہ نکل گیا اور مقدمہ لڑنے والوں کے حوصلے اور زیادہ پست ہو گئے۔ بالآخر ۱ مارچ ۱۹۰۴ء

کو جمعرات کے روز دو بجے کے قریب لنچ سے فارغ ہو کر عدالتِ عالیہ چیفکورٹ پنجاب کے فاضل ججوں نے نوجوان قاتل کی جوانی پر رحم کھا کر اُسے صرف بیس سال کی قید بامشقت کا حکم سُنلیا ۔

اُس وقت جبکہ جہانگیر حسرت و حرماں کی ایک دنیا پہلو میں لئے۔ آنکھیں جھکائے، ایک مردانہ ثبات و استقلال کے ساتھ جیل کی آہنی گاڑی میں سوار ہونے کو تھا، کوکب اشکبار آنکھوں کے ساتھ اُسکے قریب آئی اور بھرائی ہُوئی آواز میں ہچکی لے کر بولی "خدا ـــــ حافظ"

جہانگیر نے اشکہائے ندامت سے بھیگی ہُوئی پلکیں اُٹھا کر اُس انبوہِ کثیر کی طرف دیکھا جو ہمدردانہ طور سے اُسکے اردگرد ہجوم کئے تھا اور اُسکی دوسری نظر اپنے والد کے متین و باوقار چہرہ کی طرف گئی لیکن اُسے جرأت نہ ہوسکی کہ وہ اُن شفیق آنکھوں کی طرف ایک لمحہ کے لئے بھی دیکھ سکے جو اشکہائے غم کا ایک سیلاب روکے کھڑی تھیں، دنیا اُسکی آنکھوں میں اندھیر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی آستین سے آنسو پونچھ کر کوکب کے کملائے ہُوئے چہرہ کی طرف دیکھنے لگا جو گردن جُھکائے اُن آہنی کڑیوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو جہانگیر کے ہاتھوں کی بجائے اُسکے کسی دشمن کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے تھیں۔ "کوکب" جہانگیر کے پھڑکتے ہُوئے ہونٹوں سے نکلا "میں تم سے معافی چاہتا ہوں کہ تمہاری اس قدر رسوائی کا باعث ہُوا"

کوکب نے بادیدۂ نم اُسکے چہرہ کی طرف دیکھا بلوری آنسو اُسکی خوبصورت آنکھوں میں یوں دکھائی دیتے تھے جس طرح چودھویں رات کا مکمل چاند خاموش جھیل کی پُرسکون لہروں میں چمک رہا ہو۔ وہ اپنے سر سے ڈھلکی ہوئی ساڑھی درست کرکے بولی "میں شرمندہ ہوں کہ میری نحوست نے تمہیں یہ روزِ بد دکھایا، لیکن جہانگیر اگر میں زندہ رہی تو ان تہمت تراشیوں سے تمہارے دامنِ شہرت کو ملوث نہ ہونے دونگی جن کی پاداش میں ہم اتنے سالوں کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو رہے ہیں"

کوکب کے ان الفاظ سے جہانگیر کا ملول و غمگین دل بدرجہ اتم متاثر ہُوا اور اُس مجسّمۂ وفا کو راہِ محبت میں یوں سربکف پاکر کہنے لگا کوکب' میری پیاری۔ میں کس طرح تمہیں اپنا دل چیر کر دکھاؤں کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے مگر جب قضا و قدر کو ہماری کامرانی ہی منظور نہیں تو میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم جس سے چاہو شادی کر لینا"

ان الفاظ کے ساتھ آنسوؤں کی ایک رَو تھی کہ اُسکی آنکھوں سے بہہ نکلی۔ اس وقت کوکب خود بھی اُس آتشِ محبت کی تپش کو محسوس کر رہی تھی جو جہانگیر کے او باش دل میں شعلہ زن تھی بالآخر وہ

اپنے برانگیختہ جذباتِ عشق کو سینے میں سنبھال کر بولی "نہیں۔ اگر تمہیں مجھ سے اتنی ہی محبت ہے تو میں بیس سال تک تمہارا انتظار کرونگی" ۔

کہنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا فقرہ تھا مگر اسکی تہ میں دُنیادی مصائب اور جذباتِ جاں نثاری کا طوفانِ عظیم پنہاں تھا۔ کوکب کے خون کا ہر قطرہ اس وقت سیماب وار تڑپ رہا تھا۔ اُسکی بے پناہ آنکھوں کی چمک ناقابلِ برداشت تھی اور اُسکی حسین پیشانی نورِ عفت سے تابندہ اور اُسکے چمپئی رُخسار جذبۂ وفاداری سے کُندن کی طرح چمک رہے تھے۔ ان الفاظ کے سنتے ہی چند لمحوں کے لئے جہانگیر کا سارا تردد و اضطراب ایسے جاتا رہا جس طرح کسی مجروح دل کو نغمۂ جانفزا کی لطافتیں احساسِ الم سے بیگانہ بنا دیتی ہیں۔ وہ کوکب کی عادات سے اچھی طرح واقف تھا کہ ایسے عزمِ صمیم کی عورت کن جذباتِ عالیہ کی مالک ہوتی ہے اور اُسکی ڈبڈبائی ہُوئی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ ان الفاظ کے ساتھ کوکب کا دل اُسکے لبوں پر اور اُسکی رُوح سمٹ کر رسیلی آنکھوں میں مجتمع ہو رہی تھی۔ جہانگیر کو یقین تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے بالکل سچ تھا اور اس سے پیشتر کہ وہ زمانۂ آئندہ کی زرّیں اُمیدوں اور سنہری خوابوں سے معمور دل و دماغ کو سنبھال کر گاڑی میں سوار ہوتا اُس نے کوکب کے ہونٹوں پر بوسہ دیا اور باپ سے گناہوں کی معافی مانگ کر سب کو خدا حافظ کہتا ہُوا بیس سال کیلئے علٰحدہ ہو گیا۔

انتظار کے ان طویل سالوں کا بسر ہونا ہر ذی عقل انسان کے نزدیک غیر ممکن تھا۔ بیس سال . . . . .
اور خود کوکب کی عمر اُس وقت بیس سال کے قریب تھی۔ انتظار کے پہلے چند مہینوں ہی میں اُس پامالِ یاس کو معلوم ہو گیا کہ نہ گذرنے والا وقت ایک تیز تلوار کے مانند دن رات کے چوبیس گھنٹے اُسکے دل و دماغ کو زخمی اور اُس کی بے لوث رُوح کو گھائل کئے دیتا تھا۔ ہر ایسے نہ گذرنے والے دن کی لمبی ساعتیں عنکبوت کی طرح اُس کے بدن پر رینگتی نظر آتی تھیں اور سعیٔ بلیغ کے باوجود وہ اپنے جسم سے اُنہیں علٰحدہ نہ کر سکتی تھی اور بجائے اسکے کہ وہ اُسکے بدن سے رینگ کر گزر جاتیں کوکب ایسا محسوس کرتی تھی کہ اُسکے گوشت کے ساتھ مرنے کے بعد بھی چمٹی ہوئی ہیں۔ سو گوار تاثرات کے ابتدائی ایام میں وہ اپنی روح کو "انتظار" کے تشدد سے محفوظ رکھنے کی خاطر ایسے کٹھن کاموں میں مشغول رہنے لگی جنکے لئے اس سانحۂ رُوح فرسا کے چند روز پہلے تھوڑے سے منٹ وقف کر دینا اُسکے نزدیک تضیعِ اوقات کا مماثل تھا۔ اُسکے نازک ہاتھ نہ تو باغ کی روشوں کے درست کرنے کے قابل تھے نہ پانی سے لبریز ٹین کا برتن اُٹھا کر پھولوں کے گملوں میں پانی دینے کے لائق وہی گلہائے رنگ رنگ جو اُسکے لئے ہزاروں دلچسپیوں کا سامان مہیا

کرتے تھے اُس مقصودِ زندگی کی غیر حاضری میں کاغذ کے پھُول معلوم ہوتے تھے، خوشبو سے معرا اور اپنی رنگین لطافتوں سے بیگانہ۔ لیکن ان لاحاصل مشقتوں کو برداشت کرنیکے بعد جب اُسے خیال آتا کہ ابھی مصائب و آلام کے بیس سال اَور ہیں تو اُسکی رُوح لرز جاتی اور غیر محسوس طور پر اُسکی پلکیں نمدار ہوجاتیں، وہ سوچتی کہ کس گناہ کی پاداش میں اتنے طویل عرصے کے لئے وہ آتشِ فراق کے دہکتے ہوُئے جہنم میں جھونک دی گئی ہے +

بالآخر جوں جوں وقت کٹتا گیا اُسی قدر دردِ فراق کی شدت میں کمی ہوتی گئی اگرچہ آخری وقت تک کشاکشِ انتظار نے لذتِ خلش کو کم نہ ہونے دیا۔ خدا خدا کر کے پانچ سال بسر ہوئے مگر پچاس بنکر ــ ابھی پندرہ برس باقی تھے اَور وہ بھی انتظار کے پندرہ۔ اُس قیدِ تنہائی کے پندرہ سال جن کے اختتام پر اُس کی بہارِ حسُن کا خاتمہ اَور گلستانِ جوانی کی بربادی لازمی تھی۔ پچیس برس کی عمر میں اُسکا قیامت خیز شباب انتہائی عروج پر تھا اور ہر شخص کو اسکا علم ہونے کے باوجود کہ وہ اپنی زندگی اَور اپنے حسن و شباب کو "وفاداری" اور "عشق و محبت" کے دیوتا کی نذر کر چکی ہے بیسیوں نوجوانوں نے اُسے رام کرنیکی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک کی ہو چکی تھی اور مرتے دم تک اُسی کے لئے جینا اپنا مقصدِ حیات تصوّر کرتی تھی +

سال میں چار دفعہ وہ منٹگمری کے سنٹرل جیل میں اُسے دیکھنے جاتی اَور سال میں چار دفعہ وہ اُسکے چہرہ کے مدہم نقوش کو ڈبڈبائی ہوُئی آنکھوں سے اس طرح دیکھتی گویا جہانگیر کسی تیز بہنے والی پہاڑی ندی کے صاف ستھرے پانی کی گہرائیوں میں مصروفِ کلام ہے۔ پانچ سال کی جبری مشقت نے اُس کے چہرہ کی جاذبیت اور مردانہ حسُن کو فنا کر دیا تھا۔ اُسکی مسحور کرنے والی آنکھیں جو عورتوں کے دلوں کو زخمی کرنے کے لئے تیر و نشتر کا کام دیتی تھیں اپنی تمام صفات سے معرا ہو چکی تھیں اور اُسکے پھُول جیسے رخساروں پر بکثرت موٹے موٹے بال اُگ رہے تھے +

اس واقعہ کے دس سال بعد جب کوکب کا باپ بسترِ مرگ پر تھا تو اُس نے کئی بار اس سے کہا "کوکب، کیوں زندگی کی عزیز ترین گھڑیاں ایک موہوم اُمید کی خاطر برباد کر رہی ہو اس ضد اور ہٹ کو چھوڑ دو۔ میں نے اتنے سال تک تمہارے "غم" کا احترام کیا ہے اور یہ میری آخری خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے تمہیں کسی ایسے شریف انسان کے رشتۂ مناکحت میں دیکھوں جو میرے بعد تمہاری نگہداشت کر سکے"

کوکب اگرچہ نہایت شریف طبیعت اَور پاکیزہ مزاج کی عورت تھی اَور اپنے والد کی خواہشات

کو احکامِ سماوی سے کم نہ سمجھتی تھی مگر اس معاملہ میں وہ کسی مداخلت کو پسند نہ کرتی تھی اور آج سے دس سال پہلے جس طرح سیٹھ بومن نے معذور ہو کر اسکی شادی کے خیال کو دل سے محو کر دیا تھا اُسی طرح وہ اس ارمان کو سینے میں لئے ہمیشہ کے لئے اس دارِ فانی سے رحلت کر گیا ۔

اب بھی حسبِ دستور وہ سال میں چار دفعہ اُس سے ملنے جاتی مگر اب دونوں کے سینوں میں محبت کی وہ پہلی سی گرمی نہ تھی البتہ "وضعداری" کی راکھ کے نیچے سچے عشق کی چنگاری ضرور سُلگ رہی تھی۔ دس سال کے عرصہ میں دونوں کی مضطرب روحوں کو بہت کچھ سکون و قرار حاصل ہو چکا تھا مگر یہ قرار، محسوس طور پر جہانگیر کی سرد مہری میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اب محبت کی شعلہ نوائیوں کی بجائے وہ ایکدوسرے کا مُنہ دیکھتے رہتے کیونکہ اُنکے پاس گفتگو کے لئے کوئی نیا موضوع ہی نہ تھا۔ بالآخر یہ "خاموشی" آہستہ آہستہ اُنکے درمیان اُس ندی کی طرح پھیل گئی جو کوکب کے عہدِ شباب کی وسعتوں میں بڑھتے بڑھتے متلاطم دریا کی صورت اختیار کر چکی تھی اور جوں جوں وہ تیزیٔ روانی سے بہے چلی جا رہی تھی اُسی قدر کوکب اپنا ہاتھ جہانگیر کی جانب بڑھانے سے معذور تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُس نے ملاقات کے مقررہ اوقات میں ایک پل کی تبدیلی بھی گوارا نہ کی۔ یہانتک کہ جب اُسکی آخری دلچسپی ـــــــ اُسکی ماں، بسترِ مرگ پر پڑی ہمیشہ کے لئے اُسے داغِ جدائی دینے والی تھی اور یہانتک کہ جب وہ خود کسی جسمانی عارضہ سے شفا پا کر ہسپتال سے رخصت ہو رہی تھی تو ڈاکٹروں نے منع کیا کہ جہانگیر کے ساتھ کسی قسم کی ملاقات بھی اُسکی زندگی کو خطرہ میں ڈالدیگی، اُس وقت بھی وہ نہ رُکی اور منٹگمری تک کا پُر صعوبت سفر کرنے سے باز نہ رہ سکی ۔

کوکب کی زندگی کے دن یکے بعد دیگرے یوں خاموشی کے ساتھ گزرے جا رہے تھے جس طرح درخت کے پتّے موسمِ خزاں میں یکے بعد دیگرے گر گر کر آبجو میں بہے چلے جاتے ہیں۔ انتظار کے پندرہ سال پورے ہو چکے تھے اور اس عرصہ میں دُنیا گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدل چکی تھی۔ بیٹیاں مائیں بن چکی تھیں اور مائیں قبروں میں آرام کی نیند سو رہی تھیں۔ اقوام کی محشر خیز جنگ شروع ہو کر ختم ہو چکی تھی اور کئی جھوٹے مذہبی و سیاسی دیوتا آکر واپس جا چکے تھے، راعی کا تشدد، رعایا کی بغاوتیں، آزادی کی کوششیں غرضکہ ہنگامہ زارِ دُنیا کی ہر شورش شروع ہو کر ختم ہو چکی تھی لیکن کوکب کے مشاغل اور اُسکی طبیعت کی سادگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ البتہ شباب کی دوپہر ڈھل رہی تھی لیکن نہایت رنج و تاسف کے ساتھ ـــــــ کل کی بات ہے کہ کوکب کی بھتیجی فیروزہ پانچ سال کی چھوٹی سی لڑکی تھی مگر "اُس وقت" نے جس نے کوکب کے شباب میں انحطاط پیدا

کر دیا تھا اس چھوٹی سی لڑکی کے نہال طفلی میں حسن و جوانی کے شگوفے پیدا کر دئے تھے۔ بے سمجھ معصوم لڑکی اب اچھے تن و توش کی خوبصورت عورت تھی اُسے بھی اس بات کا احساس تھا کہ اُسکی خالہ کسی شخص کے لئے اپنی زندگی تباہ کر چکی ہے اور اپنی دادی کے یہ الفاظ اُسکے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے کہ کوکب بیس سال کے لئے بیوہ ہو چکی ہے اور اس وقت کہ عذابِ قبر سے زیادہ سخت "انتظار" کی طاقت سلب ہو جانی چاہیئے تھی۔ تب بھی وہ اُس کی منتظر تھی۔

زندگی کے پندرہ سالوں کے ساتھ ساتھ ہر چیز نیا پہلو اختیار کرتی گئی اور آج سے صرف پندرہ ہی برس پہلے جب کوکب نے جہانگیر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بیس سال تک اُسکا انتظار کریگی تو مردوں اور عورتوں نے متفقہ طور پر کہا تھا کہ ایسے نیک قماش کی عورتیں دنیا میں بہت کم پیدا ہوتی ہیں لیکن آج نئی تہذیب کی روشنی میں پلی ہوئی فیروزہ اس لامتناہی انتظار کو "حماقت" کے نام سے تعبیر کرتی تھی اور خود کوکب کو بھی بتدریج اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس حیاتِ الم، اس دشمنِ شباب "انتظار" اس خود فراموشی اس ناکامیٔ تمنا کا کیا فائدہ تھا۔ یہی نا کہ ایک ایسے شخص کی خاطر اپنی عزیز زندگی بے فائدہ تباہ و برباد کر دی جسے نہ اُس کا ایثار درست کر سکا اور نہ اُسکی قوتِ ارادی دنیا میں کامیاب انسان بنا سکی۔ اُسے اب ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شیشے کے ایک بہت بڑے گلوب کے نیچے وہ قید کر دی گئی ہے۔ تھوڑے عرصہ کے لئے نہیں، بیس سال کے لئے اور عمر کے بہترین حصہ میں جس سے انسان کی زندگی کے اہم ترین مقاصد وابستہ ہوتے ہیں اور جس پر اُسکی زندگی کا سارا مدار ہوتا ہے۔

اُنیس سال گذر گئے اور کوکب کو ڈھارس بندھنے لگی کہ اب اُسکی آزادی کا وقت قریب ہے اُس وقت وہ اپنی عمر کے اُنتالیسویں سال میں قدم رکھ رہی تھی۔ شدتِ رنج والم اور کاہشِ فراق نے اُسکی خوبصورت آنکھوں کے گرد چھوٹے چھوٹے حلقے پیدا کر دیئے تھے اور اُسکے گلاب جیسے سُرخ رُخسار کپاس کے پھولوں کی طرح زرد ہو چکے تھے۔ فیروزہ اب بالکل جوان تھی اور ایک خوبرو پارسی زادہ سے اُسکی نسبت بھی ہو چکی تھی۔ ۲۹ جون ۱۹۲۳ء کو اُسکی شادی کا دن تھا اور اُسی رات نکاح کے بعد لڑکے کے والدین نے اپنے عزیزوں کو چاندنی رات میں دریائے راوی پر کشتی کی سیر کے لئے مدعو کیا تھا اور یہ بات طے ہوئی تھی کہ ریل کے پُل سے گذر کر دریا کے اُوپر کی طرف ایک میل تک جائیں اور نصف شب تک یہ ہنگامۂ لُطف و نشاط قائم رہے۔

نو بجے کے قریب جب چاند کی سفید و مصفا چاندنی نے دامنِ دنیا سے رات کی سیاہی کو دھو ڈالا تو حُسن و شباب کا یہ مختصر سا مجمع موٹر گاڑیوں میں سوار ہو کر دریا کی طرف چلدیا اور عین اُس وقت جبکہ کوکب اپنی سفید ساڑھی کو ایک متین اور زاہدانہ انداز سے سنبھال کر موٹر کے پائدان پر پیر رکھنا چاہتی تھی۔ تار کے ہرکارہ نے اُسے سلام کر کے اپنے مخصوص انداز میں کہا "حضور کا ایک تار ہے"

کوکب نے تار لیکر ایک لمحہ کے لئے سرنامہ پر نظر ڈالی پھر چپراسی کی رسید بہی پر دستخط کر کے اُسے کھولا تو یہ الفاظ نظر آئے:-

"ایک سال کی قید معاف، میں بذریعہ موٹر کار صبح چار بجے لاہور پہنچونگا۔ جہانگیر"

کوکب چند لمحوں تک مُہر بخود ہو کر تار کے الفاظ کو بار بار پڑھتی رہی اور اس عرصہ میں اُسے یہ معلوم بھی نہ ہُوا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور خدا معلوم وہ اس تذبذب، اس امید و بیم اور اس ذہنی کشمکش کی حالت میں کتنا عرصہ محو رہتی لیکن فیروزہ کی ترنم ریز آواز نے اُسے اپنے خواب سے چونکا دیا جو نہایت بھولی صورت بنا کر کہہ رہی تھی "خالہ کوکب آخر اس تار میں ہے کیا جو آپ اتنی آزردہ خاطر ہو رہی ہیں۔ کس کا تار ہے"؟

کوکب نے تار کے مضمون کو پریشان نگاہوں سے ایک بار پھر پڑھا اور تہ کر کے قمیص کی جیب میں رکھ لیا، پھر منفعل نگاہوں سے اپنی بھتیجی کے ملائک فریب چہرہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "مانک شاہ کا تار تھا۔ تمہاری شادی پر مبارکباد لکھی ہے اور میں حیران ہو کر یہ سوچ رہی تھی کہ اتنے عرصہ کے بگڑے ہُوئے تعلقات کو شاید از سرِ نو استوار کرنا چاہتے ہیں" یہ کہکر وہ گاڑی میں سوار ہو گئی اور یہ دیکھ کر کہ نہ تو دلہن، نہ دُولھا اور نہ اُسکی بہن اس معاملہ میں کسی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں وہ بالکل خاموش ہو کر محسوس کرنے لگی کہ آج ذرا سی بات کے لئے اُس نے عمر بھر میں پہلی دفعہ جھوٹ بولا ہے۔ لیکن وہ اپنے یا جہانگیر کے متعلق کسی راز کے انکشاف کے ساتھ اس قصۂ پارینہ کو جو بہت حد تک لوگوں کے دلوں سے فراموش ہو چکا تھا از سرِ نو تازہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تاسف و رنج اور رسمی ہمدردی کے مخصوص الفاظ وہ سینکڑوں زبانوں سے سُن چکی تھی جو نہ تو اُسکے اندوہِ فراق کا مداوا تھے نہ اُسکے دل کی بیکلی کا علاج۔ اس وقت اگر اُسے کسی بات کی خواہش تھی تو یہ کہ وہ کسی طرح گھر واپس چلی جائے اور اُس شخص کے راحت و آرام کا سامان مہیا کرے جو ایک گمنام فقیر کی طرح اُنیس سال کی قیدِ طویل سے نکل کر آرہا ہے، جس کی عدم موجودگی میں اُسکے باپ کی ساری جائداد دیوالہ کی نذر ہو چکی تھی اور جسکے غمگساروں اور ہمدردوں کا طبقہ صرف اُسی کی ذات تک

محدود تھا۔ اُس تک جو اُسے دل و جان سے چاہتی تھی اور جو اُنیس سال کی پُر ارمان زندگی اُسکے فراق و انتظار میں اسی دن کی موہوم امید کی خاطر قربان کر چکی تھی +

لیکن وہ اب کس شکل و صورت کا ہوگا وہ بار بار دل میں سوچتی اور اس روح فرسا منظر کو بار بار آنکھوں کے سامنے لاتی جب اُس نے آخری دفعہ دنیائے عشق و محبت کی رونق کو زندان خانہ کی آہنیں سلاخوں کے اندر دیکھا تھا ـــــ ایک نحیف و زار انسان، زرد رو، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سالہا سال کا بیمار ہے کہ موت کی گھڑیاں گن رہا ہے اور یہ اُس نوجوان کی حالت کا نقشہ تھا جو میخانۂ حیات کا ساقی اور چمن زارِ دنیا کی بہار تصوّر کیا جاتا تھا۔ لیکن آہ! شراب کی کثرتِ استعمال اور حد سے زیادہ تمباکو نوشی نے اُسے اس حالت تک پہنچا دیا تھا۔ بایں ہمہ کوکب اب بھی اُسے سچے دل سے چاہتی تھی اور اُسکی خمار زا پلکوں کے دامن میں مسرت و شادمانی کے آنسو مچل رہے تھے +

ساڑھے نو بجے کے قریب دولہا کی موٹر راوی پارک کے آہنیں پھاٹک کے اندر داخل ہوئی جہاں دریا کے کنارے چاند کی چاندنی میں مہ طلعت دوشیزہ لڑکیوں کا جمگھٹا ایک طرف مصروف تکلم تھا اور دوسری طرف چند نوجوان مسلمان ملاحوں کے ساتھ مل کر کشتیوں کی تیاری اور صفائی میں مشغول تھے۔ ان سب سے علیحدہ سن رسیدہ مرد اور عورتیں موسم کی حدت، صحت بخش ہوا اور منظرِ کنار دریا کے متعلق گفتگو کر رہے تھے چنانچہ آدھ گھنٹہ کی بحث و تمحیص کے بعد کہ ۴۲ مردوں عورتوں کا مجمع نو کشتیوں میں کس طرح تقسیم ہو کر سوار ہو "دادا ہرمز" کے نعروں اور خوف و انبساط کی طرب انگیز چیخوں کے ساتھ دریا کی پُرسکون لہروں میں حرکت پیدا ہوئی اور تمام کشتیاں ایک خاص اندازِ خرام کے ساتھ روانہ ہو گئیں +

وائیلن اور ہارمونیم کے ترنم ریز نغمے دریا کے سکوتِ مردہ میں حیات مسرت کی لہر پیدا کر رہے تھے اور رُوح فروز گیتوں کی تانیں فضائے بسیط میں گونج کر مد و جزر روح کے لئے باعثِ سکون و قرار بن رہی تھیں۔ ساغرِ قمر سے بادۂ نور کا زریں سیلاب اور ملبوساتِ زرنگار کی عنبر آفریں نکہتیں حساس دلوں کو از خود رفتہ و مدہوش بنا رہی تھیں اور مہوشانِ صبیح کی رنگین ساڑھیوں کا عکس راوی کی سطح ہموار پر عکس فگن ہو کر اُسکی نیلگوں لہروں کو موجہائے بادۂ گلرنگ میں تبدیل کر رہا تھا۔ چنانچہ ایک گھنٹہ کی زور آزما جد و جہد کے بعد موضع جُھگیاں کے قریب ایک کھُلے مقام پر کشتیاں کنارے لگا دی گئیں اور سب مہمان ریگزار پر صاف سُتھری دریاں بچھا کر ماکولات اور مشروباتِ یخ بستہ سے پیاس

بجھانے لگے۔ ایک گھنٹہ کے کھیل کود اور تفریح کے بعد لڑکوں میں کشتی کھینے کے مقابلہ کا سوال پیدا ہوُا اور سب نوجوان اپنے اپنے طرفداروں کو بٹھا کر روانہ ہو گئے۔ اس دفعہ کشتیوں میں چار چار آدمی بیٹھے اور آخری کشتی میں کوکب اور ڈاکٹر اُردشیر کو جگہ ملی۔ اسے اتفاقِ وقت کہئیے یا کوکب کی بدقسمتی کہ اُسے ایسے آدمی کے ساتھ تنہا کشتی میں سوار ہونے کا موقع ملا جسکے سر دو آدمیوں کی زندگی تباہ کرنیکا الزام دھرا جاسکتا تھا۔ آٹھ کشتیاں آن کی آن میں ایک موڑ مُڑکر کوکب کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں اور ہر طرف ایک خامشی سی چھا گئی لیکن اُسکے تصور میں بلند قہقہوں کی آوازیں شہتوت کے گھنے ذخیرہ، شیشم اور کیکر کے مخلوط جھنڈ میں ابھی تک گونج رہی تھیں۔ نورفشاں چاند ایک قسم کے دھندلکے میں منہ لپیٹے اُونگھ رہا تھا۔ جنگل کے گیدڑوں اور مختلف دریائی جانوروں کی آوازیں یا اُردشیر کے چپوؤں کی صدا اس خاموشی اور اداسی کے طلسم کو توڑ رہی تھی۔ ہلکی سی کشتی اُردشیر کے چپوؤں کی بجائے زیادہ تر پانی کی لہروں کے سہارے آہستہ آہستہ جارہی تھی اور کوکب سر جھکائے منفعل نگاہوں سے مضطرب لہروں کے ساتھ چاند کی کشمکش کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ بار بار اُسکے جی میں آتا کہ یہ کتنی بُری بات ہے کہ اتفاقِ وقت نے ایسے شخص کے ساتھ تنہائی کے صبر آزما لمحے گذارنے پر مجبور کیا جس نے جہانگیر کی جوانی اور اُسکے حسن و جمال کو بیکار ضائع کردیا اور جس کے لئے اُسکے دل میں بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ نفرت و کدورت موجود تھی۔ کشتی آہستہ آہستہ جارہی تھی کہ یکایک اُردشیر نے چپو پانی سے کھینچ لئے اور معنی آفریں نگاہوں سے کوکب کے چہرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسکے اپنے چہرہ پر خوف و ہراس کی علامات موجود تھیں اور اُسکے ہاتھ کانپ رہے تھے بالآخر اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سینہ میں سنبھال کر نہایت دھیمی آواز میں کہنے لگا "کوکب"۔

اُردشیر کی آواز میں تخاطب سے زیادہ التجا کا عنصر شامل تھا۔ کوکب ایک مشتعل و مجروح ناگن کی طرح سر اُٹھا کر اُسکی طرف دیکھنے لگی۔ بھویں چڑھی ہوئیں۔ جبیں شکن آمیز اور نگاہوں میں وہ قہر کہ معتوب دیکھنے کی تاب نہ لاسکے۔ وہ اپنے سر سے ڈھلکی ہوئی ساڑھی کو درست کرکے کوئی جواب دئے بغیر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی بیش قیمت گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ اُردشیر کی جہاندیدہ نگاہوں نے ایک پل میں تاڑ لیا کہ اس مجسمۂ وفا کے دل میں کس قسم کے خیالات موجزن تھے۔ صرف چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا "آخر میں نے کیا قصور کیا ہے جو تم مجھے یوں گردن زدنی سمجھ رہی ہو۔ میری نسبت جو کچھ بھی تمہیں بتایا گیا ہے سرتاسر غلط ہے، جب چاہو میں اسکی تصدیق کرانے کو تیار ہوں"۔

مغرب کی جانب سے کسی کسان کے پُرسوز گیتوں کی آواز دریا کی مرطوب ہوا کے ساتھ آرہی تھی جو غالباً اپنے کھیتوں کو گیدڑوں کی بے پناہ لوٹ مار سے بچانیکے لئے پہرہ دے رہا تھا۔ پنجابی گیت کی حلاوت اور اُسکے سروں کے اُتار چڑھاؤ نے کوکب کے مشتعل جذبات میں بہت کچھ سکون پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ سوچنے کے بعد وہ نہایت دھیمے اور شریفانہ انداز میں کہنے لگی "لیکن ڈاکٹر ایسی گفتگو کا کیا فائدہ؟ میں نے تمہاری نسبت کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ مجھے اگر کچھ گلہ ہے تو اپنی قسمت سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہ کہکر وہ خاموش ہوگئی لیکن اُسکی ناتمام گفتگو بتا رہی تھی کہ وہ ابھی کچھ اَور کہنا چاہتی تھی مگر وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے اپنی گفتگو سے چند جملے حذف کر دیئے تھے۔

"بیشک یہ سب قسمت ہی کے کرشمے ہیں لیکن کوکب شاید تم اس بات سے انکار نہ کرو کہ اپنی تمام تکالیف کے لئے "قسمت" سے زیادہ تم خود ذمہ دار ہو۔ اپنی عمر کا بہترین حصہ ایک ایسے شخص کی خاطر وقفِ اندوہ والم کر دینا جو کسی طرح بھی تمہارے لائق نہ تھا، کہاں کی دانشمندی ہے؟"

یہ کہکر ڈاکٹر اُردشیر نے چپّو پانی کی سطح سے اُٹھا کر کشتی میں رکھ لئے۔ انکے ساتھی اپنی کشتیاں لئے غالباً ریلوے پُل تک پہنچ چکے تھے اور اُنکی کشتی شاہدرہ کا جنگل بھی طے نہ کر سکی تھی۔ کوکب اس بات سے گھبرا رہی تھی کہ آج سے اُنیس برس پیشتر اُردشیر کے ساتھ ذراسی رواداری اور مروت برتنے کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ وہ تمام دنیوی عیش و آرام اور زندگی کی جملہ مسرّتوں سے محروم کر دی گئی تھی، اب پھر جبکہ اتنے طویل عرصہ کے بعد اس صبر آزما انتظار کا خاتمہ قریب تھا اور جہانگیر چند گھنٹوں کے بعد واپس آنے والا تھا اُسکی شومیٔ قسمت نے اُسے پھر اُسی بدبخت انسان کے بس میں دیدیا جس کے نام سے وہ کانوں پر ہاتھ رکھتی تھی۔ اُسے سب سے زیادہ یہ فکر لاحق تھی کہ کسی طرح جہانگیر کے آنے سے پیشتر وہ اپنے بنگلہ پر پہنچ جائے اور دُنیا کی انگشت نمائی سے بچ جائے چنانچہ ان تمام باتوں کو مدّنظر رکھ کر وہ لجاتی ہوئی آواز میں بولی "ڈاکٹر صاحب آپ کشتی آگے بڑھائیں۔ ہم لوگ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس قسم کی گفتگو میں وقت ضائع کرنیکا یہ موقع نہیں برائے خدا میری حالت پر رحم کیجئے میں زخم خوردہ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آنسو کوکب کی آنکھوں میں ڈھلک ڈھلک کر اُسکے سفید گالوں پر لڑکھڑا رہے تھے اور یہ بات اُسکے لئے سوہانِ روح بن رہی تھی کہ اُنیس ۱۹ سال کی وفاداری اور نیکی چند گھنٹوں میں تباہ و غارت ہوتی نظر آرہی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ شرافت اور لجاجت کے تمام الفاظ اُردشیر کیلئے ناکافی ثابت ہو رہے ہیں تو وہ چلا کر بولی "اُردشیر بیوقوف نہ بنو کشتی

کنارے کی طرف جارہی ہے ایسا نہ ہو کہ دلدل میں پھنس کر رہ جائے۔ ایسی حالت میں ہم تمام رات یہیں بسر کرنے پر مجبور ہو جائینگے،،

کشتی اس اثناء میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتی ہوئی بائیں کنارے کی طرف جارہی تھی۔ اُردشیر نے چپو اُٹھاکر پانی میں ڈال دیئے اور ایک دو ہاتھ لگاکر کہنے لگا کوکب تم ناراض ہوتی ہو مجھے معاف کرنا مگر میں یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر اسی طرح غصہ اور حسد کے تاثرات سے معذور ہو کر تم کسی عورت کو ہلاک کر دیتیں تو کیا تم باور کرسکتی ہو کہ جہانگیر تمہاری طرح اپنی زندگی کی عزیز ترین گھڑیاں، اُف اتنے طویل سال زندان خانہ کی چار دیواری کے باہر تمہارے انتظار کے لئے وقف کر دیتا۔ ناممکن۔ ناممکن۔ پھر جب ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہ ہوتا تو کیا ایسی حالت میں تم اُسے وفادار کہہ سکتی ہو اور اب بھی کہ اُسکی رہائی میں کامل ایک سال باقی ہے کیا تم اس بات پر غور کرو گی کہ عمر کے بقیہ ایام لطف و مسرت میں بسر کرنے کے لئے اُسکی روح فرسا یاد کو دل سے ہمیشہ کے لئے محو کر دو...... اور ...... اور ...... بالخصوص ایسی حالت میں کہ ایک شخص جہانگیر کی طرح مجبوری سے نہیں بلکہ اپنی خواہش سے اور تمہاری وفاداری و محبت پرستی کے جذبات سے متاثر ہو کر اتنے سال تک تمہارا طلبگار رہا ہے اور اب بھی تمہاری نگاہِ بہار آفرین کا اُمیدوار ہے،،

کوکب سخت پریشان خاطر اور گھبرائی ہوئی تھی جب اُس نے غیر متوقع طور پر گفتگو کا رُخ ایسے مبحث کی طرف پلٹتے دیکھا جس سے وہ عمداً گریز کرنا چاہتی تھی۔ اُردشیر کی نسبت اُسے معلوم تھا کہ کچھ ضدی طبیعت کا آدمی ہے اور اس خیال سے کہ وہ کشتی کو بالکل نہ روک لے اُس نے ہلکی اور شرمائی ہوئی آواز میں جواب دیا ،، ڈاکٹر میں تمہارے ایثار کی قدر کرتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے جہانگیر سے کتنی محبت ہے اور محض اس لئے کہ وہ مجھے سچے دل سے چاہتا تھا۔ سب لڑکوں سے زیادہ وفادار تھا جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے اور شاید ...... شاید ...... اسی وجہ سے میں اتنا عرصہ ......،،

،، ممکن ہے ایسا ہو،، اُردشیر نے بات کاٹ کر جواب دیا ،، لیکن میں اسے باور کرنیکے لئے تیار نہیں اگر فی الحقیقت ایسا ہوتا تو وہ کبھی تمہارے کیریکٹر پر شبہ کرکے ایسی وحشیانہ حرکت کا مرتکب نہ ہوتا۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اُسے نہ تو تم سے محبت تھی نہ تم پر اُسے کسی قسم کا اعتبار تھا۔ تم خود ہی کہو کہ اُس روز میرے ساتھ تھیئٹر جانیکے باعث تمہاری پاکبازی میں اُسے شک کرنیکا کیا اختیار حاصل تھا،،؟

"خیر" کوکب نے حوصلہ مندانہ انداز سے جواب دیا "میں اس بات کے متعلق تمہارے ساتھ بحثنا نہیں چاہتی۔ آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔ میں جہانگیر کو تم سے بہتر جانتی ہوں۔ تم میری خاطر اسے ایک تجربہ خیال کرو۔ ممکن ہے آنے والی نسلیں میری اس "وفاداری" سے کچھ سبق حاصل کرسکیں"۔

ایک تبسم استہزا اردشیر کے لبوں پر نمودار ہوا۔ محبت و وفاداری کے سچے الفاظ سن کر اسکی خوابیدہ حسیات بیدار ہوچکی تھیں لیکن اپنی بات پر اڑے رہنے کی خاطر وہ ذرا بلند آواز میں کہنے لگا "اگر آدمی آدمی میں فرق ہے تو عورت عورت میں بھی فرق ہونا چاہیئے۔ کیا تم اس بات کو محسوس نہیں کرتیں کہ صرف ایک ہی تجربہ کی خاطر اپنی عزیز زندگی کا بہترین حصّہ تلف کردینا کتنی بڑی قیمت ہے"؟

یہ سنتے ہی کوکب کے بدن میں کپکپی پیدا ہونے لگی۔ اردشیر کے الفاظ کتنے بامعنی تھے۔ انیس سال کے صبر آزما مصائب و آلام کا نقشہ اسکی آنکھوں کے سامنے متحرک تصاویر کی طرح پھر گیا اور ان مصائب کے دلدوز منظر نے اسکے بدن کے رونگٹے کھڑے کردئے۔ "لیکن ان باتوں کو یاد کرنیکا اب کیا فائدہ؟" اس نے اپنے دل میں کہا "گذرے ہوئے مصائب کو اس وقت یاد کرنا جب انکے اختتام پر صبح مسرت کا طلوع ہو کتنی حماقت اور غیر مآل اندیشی ہے"۔ یہ کہکر اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا تو ایک بج چکا تھا اور کشتی کا خرام آبی اب بھی بائیں کنارے کی طرف تھا۔ ریت اور کیچڑ میں دھنسے ہوئے شہتوت کے درخت ملی جلی چاندنی اور سایہ میں نہایت ڈراؤنے معلوم ہورہے تھے۔ کوکب یہ دیکھ کر کہ کشتی چند لمحوں میں ریت کے ایک چھوٹے سے ٹیلے کے ساتھ ٹکرا کر پایاب پانی میں دھنس جانے والی ہے۔ ذرا ترشروئی سے اردشیر کو مخاطب کرکے کہنے لگی "اس دلی ہمدردی کا شکریہ، لیکن آپ ذرا کشتی کی طرف متوجہ ہوجیئے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جان بوجھ کر ساتھیوں سے الگ رہنا آپکے لئے باعث افتخار نہیں ہوسکتا"۔

اردشیر نے کوکب کے چبھتے ہوئے الفاظ کا مفہوم سمجھ کر منفعل نگاہوں سے اسکی طرف دیکھا پھر چپّو پانی میں ڈال کر کشتی چلانے لگا۔ ایک ہاتھ۔ دوسرا۔ تیسرا اور کشتی گھسک کی سی آواز کے ساتھ ریت سے چمٹ کر رہ گئی۔ اردشیر نے اپنی انتہائی طاقت صرف کردی لیکن بے سود کشتی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس جدوجہد میں کافی سے زیادہ وقت گذر گیا اور کوکب پر حبس نفس کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسکا تخیّل بار بار جہانگیر کی تصویر اسکی نظروں کے سامنے لارہا تھا جو پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس عالیشان بنگلہ کے برامدے میں سر جھکائے اسکا انتظار کررہا ہوگا اور اسکا دل لرز رہا تھا اس خیال سے کہ جب اسے یہ معلوم ہوگیا کہ

کوکب اُردشیر کے ساتھ رات بھر غائب رہی تو خدا معلوم اُسکا جوش جنوں کیا رنگ لائے۔ یکایک اپنے خیالات کی اُلجھن سے آزاد ہوکر اُس نے مردانہ ثبات و استقلال کے ساتھ کہا "لاؤ، ایک چپو مجھے دو میں بھی کوشش کروں" لیکن بے سود۔ ہر تدبیر ناکام ثابت ہوئی بالآخر کوکب نے گھبرا کر کہا "اپنے ساتھیوں کو مدد کے لئے پکارو ممکن ہے کہ تمہاری آواز اُن تک پہنچ جائے"،

اُردشیر نے اُسکے حکم کی تعمیل میں زور زور سے چلا کر آوازیں دیں لیکن صدائے بازگشت کے علاوہ اُور کوئی آواز نہ تھی حتیٰ کہ پچھلی رات کی خنک ہوا نے بھوکے گیدڑوں کو بھی تھپکیاں دے دے کر نرم گھاس کے بچھونوں پر سلا دیا تھا۔ دونوں کے پیش نظر کشتی کی رہائی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اُردشیر پانی میں کھڑا ہانپ رہا تھا، اور اُنہیں یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کتنی دیر سے اس جدوجہد میں مصروف ہیں لیکن اس عرصہ میں چاند اپنی طویل مسافت طے کرکے کامران کی بارہ دری کے پیچھے کھجور کے گنجان درختوں کی اوٹ سے تبسم زیر لب کے ساتھ انہیں جھانک رہا تھا۔ دریا کے لاتعداد مچھّر منہ، ہاتھ اور پاؤں کو کاٹ کاٹ کر اُنکا حلیہ بگاڑ رہے تھے اور سست رفتار دریا ایک تالاب کی طرح ساکت و جامد معلوم ہوتا تھا*

کوکب نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا تو تین بج چکے تھے اور اُسکے بدن پر رعشہ طاری تھا۔ بدن سرد، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے خون میں حرارتِ غریزی بالکل ختم ہوچکی تھی۔ وہ حیران ہو ہو کر سوچ رہی تھی کہ کیا تمام دنیا کے مصائب و آلام اُسی کے لئے وقف ہوچکے تھے۔ ڈر، پریشانی اور تکان نے اُسے بے دم کر رکھا تھا۔ یکایک اُردشیر کی سعی اور ایک موافق لہر کی مدد سے کشتی رہا ہوگئی۔ اُردشیر نے خوشی کا نعرہ لگایا اور اُسے اپنی انتہائی قوت سے کھینتا ہوا منجدھار میں لے آیا۔ کوکب کی آنکھوں میں مسرت و اطمینان کے آنسو جمع ہو رہے تھے جنہیں وہ ایک رومال میں جذب کرکے گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ تین بج کر پچیس منٹ اور کشتی ابھی پل سے اوپر دھوبی گھاٹ کے قریب تھی اُسے اب بھی اُمید تھی کہ شاید وہ جہانگیر کے آنے سے پیشتر گھر پہنچ جائے لیکن اُسکا دل ڈوب رہا تھا۔ جب تین بج کر پچاس منٹ پر وہ کشتیوں کے مقامِ اتصال پر پہنچے *

ہر چہار طرف ہُو کا عالم تھا البتہ ملاحوں کے دو چار کتے نوواردوں کو دیکھ کر بھونک رہے تھے۔ اُردشیر نے کشتی ملاح کے سپرد کی پھر اُسے مخاطب کرکے کہنے لگا "کیوں علی بخش اِس وقت یہاں کوئی گاڑی مل سکتی ہے"

علی بخش نے ایک جمائی لیکر کشتی کو باندھ دیا پھر اُردشیر اور کوکب کی طرف غیر مطمئن نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا "نہیں صاحب اس وقت تو نہیں البتہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ تک بہت گاڑیاں آجائینگی"

یہ جواب سُنتے ہی کوکب پیدل جانیکے لئے تیار ہوگئی لیکن اُس کا ایک ایک قدم من من بھر کا وزنی معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت وہ بالکل چپ چاپ تیزی سے قدم اُٹھائے راوی پارک کو عبور کر رہے تھے۔ قریب چوتھائی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد گئو شالہ کے احاطہ کے قریب اُنہیں متعدد گاڑیاں مل گئیں چنانچہ یک ٹانگہ میں سوار ہوکر وہ گھر کی طرف چلدیئے اور کوکب تمام راہ یہ سوچتی گئی کہ اس غیر متوقع غیر حاضری کے متعلق لواحقین اور جہانگیر کو وہ کیا بیان دے سکیگی۔ بار بار کے سوچنے سے اُس کا دماغ پراگندہ ہوچکا تھا اور وہ کسی تسلی بخش نتیجہ پر پہنچنے سے یکسر محروم تھی۔

ابھی کوکب اور اُردشیر کا ٹانگہ سیٹھ بومن کی مشہور کوٹھی "چاندنی" سے دو سو گز کے فاصلہ پر تھا کہ کوکب کے توہماتِ باطلہ نے مختلف قسم کے ڈراؤنے منظر اُسکے سامنے پیش کرنے شروع کردئیے۔ شش جہت پر خاموشی ہی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور تمام بنگلوں پر ایک قسم کا سکون طاری تھا لیکن کوکب کے دل میں خوف و ہراس بدنامی اور رسوائی کے جذبات متلاطم تھے۔ ٹانگہ جب بنگلے کے آہنیں پھاٹک کو عبور کرکے اندر پہنچا تو چاند کی آخری شعاعوں کے دھندلکے میں کسی متحرک سایہ کے خیال نے کوکب کی رگوں میں خونِ حیات کو منجمد کردیا اور دوسرے لمحہ میں ایک کرخت آواز نے چلّا کر کہا "کون آتا ہے؟"

"میں ہوں سیتل داس" کوکب نے دبی آواز میں جواب دیا پھر ٹانگہ سے اُتر کر بنگلے کی سیڑھیوں پر کھڑی ہوگئی اور خاموشی کے ساتھ سر جھکائے اردگرد کے گملوں کی طرف بے معنی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اُردشیر کے لبوں سے "خدا حافظ" نکلا اور صرف دو منٹ بعد اُسکا ٹانگہ ایک موڑ مُڑکر کوکب کی نظروں سے غائب ہوگیا لیکن وہ اپنے خیالات اور پریشان تصورات میں غرق دس منٹ کے قریب حیران کھڑی رہی، اُس سے چند قدم کے فاصلہ پر بوڑھا چوکیدار اپنے مضبوط لٹھ پر دونوں ہاتھ رکھے بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

"ایک صاحب کوئی دو بجے سے آپکی راہ تک رہے ہیں" سیتل داس کے مُنہ سے نکلا اور وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔

یہ سنتے ہی کوکب کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے برانڈے کی چھت اُس پر گر پڑی ہو۔ وہ عورت جو عمر عزیز

کا ایک حصّہ مصائب و نوائب میں بسر کرکے پتھر کا کلیجہ بنا چکی تھی ایک تصوّرِ موہوم سے یوں کانپ رہی تھی۔ جس طرح نسیمِ سحر کے خوشگوار جھونکے بلند قامت شاہ بلوط کی ٹہنیوں میں ایک ارتعاش مستقل پیدا کر دیتے ہیں۔ خوف و ہراس نے اُسکے پاؤں زمین میں گاڑ رکھے تھے اور وہ جہانگیر کے سامنے، جسکے فراق میں دن رات کی گھڑیاں گنی جاتی تھیں، اکیلے جاتی ہوئی گھبراتی تھی۔ اُس کا دماغ مُلاقات کے رسمی الفاظ تک سوچنے سے معذور اور دل زخمی کبوتر کی طرح پھڑک رہا تھا۔ یہی بنگلہ جس میں کل تک فیروزہ کے ترنم ریز قہقہے گونجتے تھے اور جس کی موجودگی میں ہر چیز حسین معلوم ہوتی تھی، صبح صادق کے نور میں ملبوس اپنے گہرے سکون اور انتہائی خاموشی کی وجہ سے ایک غیر آباد مقدس مقام معلوم ہوتا تھا اور کوکب اُسکی سیڑھیوں پر یوں کھڑی تھی جیسے سفید کپڑے کا احرام باندھے کوئی حسین زائرہ اپنے جذباتِ نیاز لیکر عشق کے دیوتا کے حضور حاضر ہوئی ہو۔ اتنے میں مشرق کی جانب سے ایک ولایتی مرغ نے اپنے سفید پروں کو جنبش دیکر اور غرور و نخوت سے گردن بلند کرکے طلوعِ سحر کا اعلان کیا اور اُسکی متعدد پے در پے آوازیں کوکب کو ورطۂ خیالات سے باہر کھینچ لانے میں ممد ثابت ہوئیں، اس بات کا احساس ہونیکے بعد کہ وہ کہاں کھڑی تھی کوکب نے بوڑھے چوکیدار سے متعدد سوالات کئے اور یہ معلوم کرکے کہ اُس کا بہرہ اور خادمہ دو دفعہ سیٹھ جمشید کے گھر سے جہاں فیروزہ بیاہی گئی تھی، اُس کا پتہ پوچھ آئے تھے اور جہانگیر کو یہاں تک معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ڈاکٹر اُردشیر کے ساتھ پیچھے رہ گئی تھی تو اُسکے بدن کا تمام خون خشک ہوگیا اور وہ بیدم ہوکر وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی ؛

اتنے عرصہ میں کوکب کے سارے ملازم بیدار ہو کر اپنے اپنے کام میں لگ چکے تھے اور بنگلے کی مختلف اطراف سے مانوس آوازیں اُسکے کانوں میں آرہی تھیں۔ یکایک ایک بغلی دروازہ کُھلا اور ایک نوجوان خادمہ نے جُھک کر اپنی مالکہ کو سلام کیا۔ خادمہ کی آواز سُنتے ہی وہ سیڑھیوں سے اُٹھ بیٹھی اور جُھکی ہُوئی نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھ کر کہنے لگی "دیکھو صابری جو صاحب باہر سے آئے ہُوئے ہیں اُنہیں گول کمرہ میں لے آؤ اور ناشتہ کا فوراً انتظام کرو"

یہ کہکر وہ اپنے سونے کے کمرہ میں چلی گئی اور منہ ہاتھ دھو کر ایک بنفشئی رنگ کی ساڑھی زیبِ تن کی کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ جہانگیر کو یہ رنگ بہت پسند تھا اور غالباً گذشتہ اُنیس برس میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اس رنگ کی ساڑھی پہن رہی تھی منہ ہاتھ دھو کر وہ ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر یہ دیکھنے لگی کہ جہانگیر کی اس طویل غیر حاضری نے اُسکے چہرہ کے خد و خال میں کیا نمایاں فرق پیدا کر دیا تھا۔ اگرچہ آئینہ اس عرصہ کے تمام تغیرات بے کم و کاست لُسے

بتا رہا تھا مگر خود کوکب یہ محسوس کر رہی تھی کہ عمر کے اُنتالیسویں سال میں بھی وہ بوڑھی نہ تھی بلکہ اُسکا دل بدستور جوان تھا۔ وہ جلدی جلدی گول کمرہ میں آکر بیٹھ گئی اور ایک منٹ بعد اُس نے ملحقہ کمرہ سے کسی شخص کے آہستہ آہستہ چلنے کی آواز سُنی اور اُس کا دل دھک سے رہ گیا ٭

دوسرے لمحہ میں کسی شخص نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور آن کی آن میں کوکب کا نرم و نازک ہاتھ نووارد کی مضبوط گرفت میں تھا اور وہ اس کی گفتگو کو یوں سُن رہی تھی جیسے گہری نیند میں کوئی آواز سُنائی دیتی ہے اور خود کو ایک نئی دُنیا، ایک نئے قالب میں تصور کر رہی تھی" میرا تار آپکو مل گیا ہوگا" جہانگیر کے مُنہ سے نکلا" در اصل مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے دو کی بجائے چار بجے کا وقت لکھ دیا تھا" الفاظ اُسکے مُنہ سے اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔ کوکب اُسے دیکھ دیکھ کر گھبرا رہی تھی اور چاہتی تھی کہ ایک چیخ مار کر بھاگ جائے" آہ! آہ!" اُس نے اپنے دل میں کہا" اُس شخص کے لئے میں نے اپنی جوانی برباد کی تھی جو کسی قسم کی بھی مردانہ صفات سے متصف نہ تھا ٭

جہانگیر خلافِ توقع نئے لباس میں ملبوس مُودبانہ انداز سے اُسکے سامنے کھڑا تھا اور اس طرح جیسے کوئی ادنٰے درجہ کا آدمی ہو۔ کوکب اس وقت محسوس کر رہی تھی کہ شیشہ کا وہ گلوب، جس میں وہ اُنیس برس سے قید تنہائی کے ایام کاٹ رہی تھی، ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوچکا ہے۔ یوں تو وہ عرصہ سے یہ تصور کئے بیٹھی تھی کہ جہانگیر اپنی واپسی پر ایک بوڑھا، بدشکل، برگشتہ قسمت اور مظلوم صورت بن کر آئیگا مگر اُسکے ذہن تک یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ اُسکے ساتھ ہی نجابت و شرافت کے جائز اور صحیح غرور سے بھی تہی داماں ہوگا۔ یہ جیل خانہ کی زندگی کے تاثرات تھے اور اس سے بڑھ کر شرابِ گلفام کے، اُس آتش سیال کے نتائج تھے جو عشق و محبت کی آگ سے بھی زیادہ تیزی سے انسان کے دل و دماغ کو جلا کر بیکار کر دیتی ہے ٭

کوکب نے اپنے ہاتھ سے اُسکے لئے ایک کرسی کھینچ دی اور لرزتی ہُوئی آواز میں کہنے لگی" جہانگیر بیٹھ جاؤ۔ سفر کی دُوری اور کوفت نے تمہیں مضمحل بنا رکھا ہے" ان الفاظ کے ساتھ وہ خود بھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ محبت کا وہ پُرارمان خواب جس کی تعبیر کے انتظار میں ایک ایک دن اور دن کا ایک ایک گھنٹہ گنا جاتا تھا۔ پریشاں ثابت ہُوا اور تعبیر سے پہلے سطح آب پر تیرنے والے حباب کے مانند تحلیل ہوکر رہ گیا اتنے میں ایک ملازم نے نہایت خوبصورت اور چمکدار برتنوں میں صبح کا ناشتہ لاکر میز پر رکھ دیا۔ کوکب نے چائے کی ایک لذیذ پیالی تیار

کر کے جہانگیر کے سامنے رکھی اور کیک کے چند ٹکڑے کاٹ کر اُسکی طشتری میں ڈالدیئے اور یہ دیکھ کر حیران ہوگئی کہ اُسکا وہ بے نیاز محبوب جو چائے اور مٹھائی کو بچوں کا دل بہلاؤ کہا کرتا تھا آج "رغبت" سے نہیں بلکہ ہیمانہ خواہش سے کھا رہا تھا ۔

اس عرصہ میں کوکب محسوس کرنے لگی کہ لحظہ بلحظہ جہانگیر کی محبت اُسکے دل میں نفرت و حقارت سے تبدیل ہو رہی ہے اُس نے متعدد بار خود کو نفرین کی کہ کیا وہ اس شخص پر جان نہ چھڑکتی تھی. کیا اُس نے اتنے سال تک وفاداری اور نیک نیتی سے اُسکا انتظار نہیں کیا؟ یہ سوال وہ اپنے دل سے کر رہی تھی اور حیران تھی کہ اسکا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ بیس سال کی وفاداری کس کے لئے؟ اُس انسان نما ہستی کیلئے جس کی شکل سے وحشت، آنکھوں سے پریشانی، حرکات سے گنوارپن اور طرز تکلم سے اجنبیت برستی تھی لیکن اُسکے پاس ایک جواب تھا کہ وہ "وفادار" تھی اور اُس وفاداری کی حامل تھی جو قسام ازل نے عورت ہی کے لئے مخصوص رکھی ہے ۔

جہانگیر ابھی تک کھانے میں مشغول تھا. کوکب چونکہ زیادہ سویرے کھانیکی عادی نہ تھی اسلئے بجائے کھانیکے وہ زیادہ تر کھلانے میں مصروف تھی اور رحم بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی لیکن یہ ترحم ایک عاشق کا جذبہ نہ تھا بلکہ ایک دردمند انسان کا جسکا دل کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر پسیج جائے، اگرچہ کوکب کی برق حسن کی حیات افروز تجلیاں آخری راتوں کے بے نور چاند کی طرح ماند ہو چکی تھیں مگر اُسکے حسن کی کشش و جاذبیت اُس حد تک فنا نہ ہوئی تھی جتنا انقلاب عظیم کہ اُنیس سال کے طویل عرصے نے جہانگیر کی لرباصورت میں پیدا کر دیا تھا اس وقت جہانگیر کچھ کھوئی ہوئی لیکن تشکر آمیز نگاہوں سے کوکب کے سفید چہرہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور اُسکے کرخت ہاتھ جن میں موٹی موٹی رگیں بٹی ہوئی رسیوں کی طرح اُبھر رہی تھیں، چائے کی پیالی ابھی تک تھامے ہوئے تھے۔ آہ! کوکب نے لمبی سانس لیکر اپنے دل میں سوچا، ان ہاتھوں کی خوبصورت اور مردانہ بناوٹ پر وہ کس قدر مغرور تھی اور اُسکا دل بھر آیا جب اُنیس ۱۹ سال پہلے کا نقشہ اُسکی آنکھوں کے سامنے آگیا جس وقت چیفکورٹ کے باہر انہیں خوبصورت ہاتھوں کو بوسہ دے کر اُس نے "خدا حافظ" کہا تھا ۔

"میں کچھ دیر باغ میں بیٹھنا چاہتا ہوں. شاید موتیا کے پھول اب کھل رہے ہوں تمہیں یاد ہے میں انہیں بہت پسند کرتا تھا" یہ کہکر وہ شرمائی ہوئی نگاہوں سے کوکب کی سڈول کلائی کی طرف دیکھنے لگا لیکن اس وقت تک وہ ایک عاشق کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مہمان اور اس سے بھی زیادہ صحیح الفاظ میں ایک محکوم کی طرح کوکب کو مخاطب کر رہا تھا اُف! اس شخص کے ساتھ کیسے نباہ ہوگا" کوکب نے دل میں سوچا اور وہ اپنی ساڑھی سنبھال کر اُٹھ کھڑی ہوئی

پھر اُس کا دروازہ کھولکر اُس نے صابری کو آواز دی پھر جہانگیر کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی "تم باغ کی سیر کرو میں بھی تھوڑی دیر میں تمہارے پاس آؤنگی شاید تم اُن لوگوں کی نسبت کچھ سُننا پسند کرو جنہیں تم جانتے ہو اس میں تمہارے لئے دلچسپی کا سامان ہو گا"

اتنے میں صابری کمرہ کے اندر داخل ہوئی اور کوکب نے ضروری ہدایات دیکر اُسے جہانگیر کے ساتھ کر دیا اور خود اپنی خوابگاہ میں داخل ہو کر ایک آرام کُرسی پر گر پڑی "بس یہی تھی ساری تمنا اور آرزو" کوکب کے مُنہ سے نکلا اور گرم گرم آنسوؤں کی رو اُسکی آنکھوں سے بہہ نکلی اُس نے نگاہ اُٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا، باغ کی خوبصورت روشیں اور اُنکو سیراب کرنیوالی چھوٹی سی آبجو، گلاب اور موتیا کے حسین و رنگین پھول سُورج کی ہلکی اور تمازت سے معرّا کرنوں میں چمک رہے تھے۔ آم کے طوبے قامت درختوں پر پرندوں کے چہچہے اُسے اور زیادہ پامال کر رہے تھے۔

"خیر کوئی مضائقہ نہیں" کچھ دیر سوچنے کے بعد بیساختہ اُسکے منہ سے نکلا "میری جوانی میں بھی تو انحطاط پیدا ہو چکا ہے۔ وہ کچھ عرصہ میرے ساتھ رہنے کے بعد بالکل درست ہو جائیگا" یہ کہکر اُس نے آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے اور ایکبار پھر آئینہ کی طرف دیکھنے لگی، اب اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُسکی پژمردہ رُوح کسی عطر بیز پھول کی طرح کھل رہی ہے اور اُنیس برس کے بعد اُس نے ایک جوان عورت کی طرح انگڑائی لی، بالآخر آج خوشی و مسرت کا دن تھا کیونکہ وہ قیدِ تنہائی سے رہائی پا چکی تھی اور مسرور تھی اس بات سے کہ اُسے اب کبھی بڑے گلوب کے نیچے نہ رینگنا پڑیگا جس سے ابھی ابھی اُس نے نجات حاصل کی تھی، عورت، دنیا کی محبوب ترین شے کتنی قناعت پسند ہے بشرطیکہ وہ قناعت پسند بننا چاہے۔

اب وہ دُنیا کو متبسم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، جوانی اور چہرے کی پھول جیسی رنگت کے سوا اُسکے پاس سب کچھ تھا۔ مٹی ہوئی حیاتِ شباب دوبارہ انگڑائیاں لے رہی تھیں اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ یا تو آج ہی پیدا ہوئی ہے یا کسی گہری نیند سے سو کر اُٹھی ہے، وہ فانی دنیا جسکی کوئی دلچسپی اُسکے لئے کسی قسم کی جاذبیت اپنے اندر پنہاں نہ رکھتی تھی اب اُسکی ہر چیز میں انجذابِ فطری موجود تھا۔ اُسکی فضا نکہت بیز، اُسکی خاک کے ذرّات سونے اور ہاتھی دانت کی طرح درخشاں اور اُسکا اُفق طلوعِ سحر کی سُرخی میں رنگین نظر آ رہا تھا۔ اب وہ آزاد تھی۔ مسرور و شادمان!!

"بائی جی۔ بائی جی" صابری نے دروازہ پر دستک دی لیکن اُسکی بھرائی ہوئی آواز میں سوگوار اضطراب موجود تھا۔

کوکب گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور دروازہ میں کھڑی ہو کر پوچھنے لگی "کیا ہے صابری۔ ہیں تم رو رہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

صابری اپنے دوپٹہ سے آنسو پونچھ کر کہنے لگی "سیٹھ صاحب کو خدا معلوم کیا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مر گئے ہیں۔ مگر ابھی کوئی سانس باقی ہے"

کوکب بدحواس ہو کر باغ کی طرف دوڑی گئی اور ایک چوبی بنچ پر اُس نے جہانگیر کو از خود رفتہ اور بیحس و حرکت لیٹے

دیکھا۔ اُسکا تنفس نہایت تیز تھا اور کھلی ہوئی آنکھیں آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ کوکب نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بوڑھے مالی کی طرف دیکھ کر کہا "ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔ فوراً ڈاکٹر کو لاؤ" اور خود اُسکے کوٹ اور ننگ اسکٹ کے بٹن کھول دیئے اور حیرت زدہ ہوکر سوچنے لگی کہ اُسکے دل کی کلی جو چند منٹ گذرے کھل چکی تھی اب پھر مُردہ ہوکر شاخِ مسرت سے گر جانے والی ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر پہنچ گیا اور مریض کو دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔ لیکن کوکب کے دل پر جو گذر رہی تھی اُس کا پُرسانِ حال کوئی نہ تھا۔

"بائی جی" صابری نے بادیدۂ نم رونی صورت بنا کر کہا "سیٹھ صاحب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ بائی جی ڈاکٹر اُردشیر کے ساتھ ہر روز سیر کیلئے جایا کرتی تھیں یا کبھی کبھی' اور میں جواب بھی دینے نہ پائی تھی کہ اُنکی یہ حالت ہوگئی"

لیکن وہ بُت کی طرح کھڑی تھی ساکت و جامد اور دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ اتنی طویل زندگی میں بس یہی ایک آزادی و فرحت کا لمحہ قسامِ ازل نے اُسکی قسمت میں لکھا تھا اور وہ بھی شکوک سے لبریز۔ وہ چیخ مار کر رونا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر اور ملازمین کی موجودگی کا اُسے احساس پیدا ہوگیا اور وہ ایک لمبا سانس لیکر طوفانِ جذبات کو سینے میں سمیٹ کر رہ گئی۔ اُنتالیس سال کی پاکیزہ زندگی معصیت و عصیاں سے محفوظ۔ آہ کس اُمید پر وہ جذباتِ شباب اور گناہ کی ترغیبات پر ہمیشہ غالب آتی رہی۔ اسی دن کے لئے، اسی ساعت کے لئے، اُسکا دل پھٹا جاتا تھا اور مہیب آوازوں کے ساتھ تمام درخت اُسے اپنے چاروں طرف گھومتے نظر آتے تھے۔

"یہ فالج کی بیماری ہے، اگر کوئی چیز اس شخص کو زندہ رکھ سکتی ہے تو مسس بومن وہ آپکی غیر متزلزل وفاداری ہے اور بس"۔ اُسکا پڑوسی ڈاکٹر مقبول احمد یہ الفاظ کہہ رہا تھا جو اس عدیم النظیر معاشقہ کی پردرد کہانیاں اسوقت بھی سُنا کرتا تھا جبکہ وہ ابھی اسکول کا ایک معمولی طالب علم تھا۔

کوکب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر آنسو بھری آنکھیں جُھکا لیں گویا اثبات میں جواب دے رہی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس کرنے لگی کہ شیشہ کا وہ بڑا ڈھکنا، جس کی قید سے چند منٹ پیشتر آزاد ہوئی تھی اب ساری بقیہ عمر کے لئے اُس پر رکھ دیا گیا تھا۔

(جزواً ماخوذ) محمد ضیاء الدین شمسی

اسرارِ فطرت

۱

نظارگیٔ فطرت یہ حسنِ چمن کیا ہے؟
بربادِ تمنّا یہ افسونِ تمنّا ہے
شیون کدہ سمجھا ہے ناکامیٔ رسوا نے
امید یہ کہتی ہے نغمات کی دنیا ہے
یہ راز ہے فطرت کا فطرت ہی اسے جانے

۲

وہ رقصِ ترنّم ہے یہ نغمۂ رنگیں ہے
وہ محشرِ بیتابی یہ پیکرِ تمکیں ہے
بربادِ تحیّر ہے ہر سعی بصارت کی
اس راز کو وہ جانے جو آنکھ جہاں بیں ہے،
تفریقِ گل و بلبل تضحیک ہے فطرت کی

۳

ہر دل میں امنگوں کا اک جوش سا برپا ہے
جذبات کی باتیں ہیں جذبات کی دنیا ہے
ادراک کی ہر کوشش جویائے حقیقت ہے
میں کہتا ہوں سب کچھ ہے تو کہتا ہے دھوکا ہے
آخر یہ تفاوت کیوں؟ نیرنگِ طبیعت ہے

۴

دھوکا ہے حقیقت ہے افسونِ تمنا ہے
بلبل سے بھی پوچھو تو یہ حسنِ چمن کیا ہے؟

تصدق حسین خالد

انتقاد کا صحیح مفہوم

انتقاد ایجادی یا اصلی تصنیف کا تعارف یعنی تشریح اور توجیہ کرنیکا نام ہے ایک مصنّف ایک کتاب لکھتا ہے یا ایک شاعر کوئی نظم کہتا ہے۔ کتاب یا نظم اصلی یا ایجادی ہوتی ہے یعنی دونوں چیزیں مصنف اور شاعر کے دماغ سے نکلی ہوئی اور خود انکی سوچی ہوئی یعنی کسبی فکری ہوتی ہیں۔ حیات پر اُنکی نظر خاص طور پر پڑتی ہے اور جو منظر وہ اس طرح دیکھتے ہیں اسکو اپنی تصنیف یا نظم میں بیان کر دیتے ہیں۔ شاعری میں آمد سی کا نام ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے "شاعری جزو یست از پیغمبری"۔ مطلب یہ ہے کہ حیات کے متعلق نئے خیالات شاعر کے دماغ میں الہام کی طرح آتے ہیں، تصنیف میں گو خیالات الہام کی طرح نہیں آتے مگر مصنف کا اعلیٰ دماغ جس طریقے سے حیات پر غور کرتا ہے وہ بالکل نیا اور اسکا اپنا ہوتا ہے۔ غرض اس طرح اصلی تصنیف اور شاعری "انکشافِ حیات" ہے انتقاد اس "انکشافِ حیات" کا انکشاف ہے مصنّف یا شاعر نے جس طریقہ پر سوچا اور جس نتیجہ پر پہنچا اور جس طرح اس نے اسکو ادا کیا اسکی فکر، نتیجہ اور بیان کے حسن و قبح عظمت اور پستی پر نظر ڈالنا اور اس سے لوگوں کو آگاہ کرنا انتقاد ہے۔ جو ایجادی کام تصنیف اور شاعری حیات پر کرتی ہے وہی ایجادی کام انتقادؔ تصنیف اور شاعری پر کرتا ہے وہاں حیات کی مصوری ہوتی ہے۔ اور یہاں اس کی مصوری کی تحلیل، تشریح اور توجیہہ تصویر کا کمال اکثر نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے لیکن بعض پر الہام کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ شکسپیئر انگریزوں میں معمولی شاعر تھا لیکن جرمن نقادوں کو وہ دنیا کا یکتا شاعر نظر آیا۔ کالیداس ہماری نظروں میں جیسا ہے وہ ظاہر ہے۔ گیٹے اس کی شکنتلا پر نظم میں تعریف کرنے پر مجبور تھا۔ اسی طرح گیٹے کا ڈراما "فاوسٹ"۔ جہاں اکثروں کے لئے ایک افسانہ ہے بعضوں کیلئے محیّر العقول۔

انتقاد ایجابی اور سلبی دونوں کام کرتا ہے۔ جیسا فن میں عظمت اور حسن پیدا کرنیکا شوق دلاتا ہے ویسا ہی مُخرّب، مغالطہ دہ و بے ثبات فنون کی تردید کرتا ہے۔ اس سے ہیئتِ اجتماعی کی دماغی حالت میں بہت جلد ترقی ہوتی ہے۔ صحیفہ فطرت یا حیات کے رازداروں کے کارناموں کی صحیح معنوں میں توجیہہ یا تشریح کرنے سے ان کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور وہ اپنا کام پہلے سے زیادہ شوق سے انجام دے سکتے ہیں۔ ایسی تصنیفات جو نظر فریب ہوتی ہیں اور جن سے عوام دھوکا کھاتے ہیں، اسکے ذریعہ سے متبذل اور بے حقیقت ہو جاتی ہیں۔ اس طرح قوم ذلیل ادنیٰ اور پستِ ادب کے داغ سے پاک رہتی ہے۔ بعض جھوٹے

مصنفین بلکہ کتاب ساز ادنی کتابیں لکھتے ہیں، قوم کے افراد نہیں پڑھ کر اکثر تو دماغی نقصان اُٹھاتے ہیں اور ان میں بعض کو خود ایسی کتابیں لکھنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ جمہور کا دماغ پستی کی طرف مائل ہوتا ہے اور کسی کے دل میں عالی دماغی کا خیال نہیں پیدا ہوتا۔ انتقاد اس قسم کے ادب کی سختی کے ساتھ مدافعت کرتا ہے اور جھوٹے مصنفوں کو ایسی سزا دیتا ہے کہ پھر وہ اس قسم کی جرأت نہ کرسکیں، افسوس ہے کہ اُردو میں انتقاد ابھی اس حالت کو نہیں پہنچا۔ اُردو مطبوعات میں سینکڑوں نہیں تو بیسیوں کتابیں اسی طرح جھوٹے ادب کی ہیں، صحیح نقادوں کی عدم موجودگی سے انکا کوئی سدِ باب نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکے برعکس چند جھوٹے نقاد ایسے ادب کی سرزنش کرنیکے بجائے مداحی کر کے اسکے لکھنے والوں کی ہمتیں بڑھا دیتے ہیں، برخلاف اسکے انگلستان میں اس زمانہ کا تو کیا ذکر ڈاکٹر جانسن کے زمانہ میں یہ کیفیت تھی کہ جس کتاب کو جانسن کی مجلس ادب پسند کرتی تھی وہ متعدد طباعتوں کے باوجود ہاتھوں ہاتھ خریدی جاتی تھی اور جس کتاب کو وہ رد کر دیتی تھی اسکی جلدیں حلوائیوں کی دکانوں میں نظر آتی تھیں۔

صحیح انتقاد نہ صرف جھوٹے مصنفوں کو سرزنش کر کے دائرۂ ادب سے نکال دیتا ہے بلکہ وہ اصلی مصنفوں کے جوہر کو انکی خامیاں نکالکر اور چمکاتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں حکیم ابوالفتح اور خانخاناں کے ادبی حلقے انکی نقادانہ نظر کی وجہ سے جواہر خیز معدن بنگئے اور جن شاعروں نے ان حلقوں کی نقادانہ تادیب میں تربیت پائی وہ دُنیا میں نظیری اور عرفی بنکر چمکے، بالکل یہی حال غالب کی شاعری کے ساتھ رہا، مولٰنا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ وغیرہ کے دوستانہ انتقاد اور ذوق، مومن صہبائی وغیرہ کے مخالفانہ انتقاد کے خوف نے غالب کو انتہائی غور و فکر پر مجبور کر دیا تھا۔ ان دونوں اثروں سے غالب نے بیدل کا رنگ چھوڑا۔ اس مشکل رنگِ تخیل میں منجھے ہوئے دماغ سے ایجادی قابلیت نے جو کام لیا۔ اسکی نظیر تاریخ ادبِ اردو میں کہیں نہیں ملتی۔ ورنہ ممکن تھا کہ وہی ایجادی قابلیت خیال بندی میں صرف ہوتی اور غالب کی شاعری بیدل کا مثنیٰ بنکر رہ جاتی اور اس کو اس اوج کمال پر نہ پہنچنے دیتی۔

انتقاد کے متعلق یہ ایک مغالطہ پیدا کرنیوالا اور غلط خیال ہے کہ یہ دماغی ورزش ہے یا یہ کہ قوم کے دماغی جمود کی حالت کا مشغلہ ہے یا بیکار لوگوں کا کام ہے یعنی متوسط علمی طبقے کے لوگوں کی تفریح ہے گویا انتقاد کیلئے قابلیت کی ضرورت ہی نہیں۔ انگلستان کا مشہور و معروف نقاد متھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ انتقاد کا یہ فرض ہے کہ :-

"دنیا کے بہترین نتائج فکر اور تحقیق و تدقیق کو معرض اظہار میں لا کر صحیح اور معنی آفریں خیالات کی ایک نئی رَو جاری کر دے یعنی بالفاظ دیگر عربی ضرب المثل (خذ ما صفا دع ما کدر) پر عمل کرے۔

سید وقار احمد۔ بی۔ اے (عثمانیہ)

سوزِ بیوہ

(ایک سہیلی کو۔ اُس کی زبان سے)

حسرت آبادِ جہاں میں درد کی تصویر ہوں — نالۂ خاموش ہوں میں آہِ بے تاثیر ہوں
آہ رنجِ بے نوائی ہائے دردِ بیکسی — آسمانِ فتنہ گر نے میری راحت چھین لی
برقِ خرمن سوز ایسی آشیانہ پر گری — خواب اک بھولا ہؤا میری جوانی ہوگئی
بجھ گئی وہ شمع، روشن جس سے تھا میرا مکاں — اب مجھے تاریک آتا ہے نظر سارا جہاں
جارہے ہیں چھین کر مجھ سے مرے سرتاج کو — آہ دیکھوں بھی تو کن آنکھوں سے اِس تاراج کو
حُسن کی دُنیا میں پایا عشق نے بیکس مجھے — لُوٹ کر سامانِ راحت کردیا بے بس مجھے
شکر کر درگاہِ باری میں نہ کر فریاد سُن — بے قرار اتنا نہ ہو ہاں اے دلِ ناشاد سُن
عارضی فرقت پہ تیرا رنج وغم بے سُود ہے — مَوت کے پردے میں تیرا امتحان مقصود ہے

دیکھ! رونے سے عیاں رنگِ جنوں زائی نہ ہو
تیرے سوزِ عشق کی دُنیا میں رسوائی نہ ہو

خاکسار
بیگم تصدق حسین خالد

غلط فہمی

یوں تو اس چھوٹے سے خس پوش۔ بوسیدہ جھونپڑے کی بساط ہی کیا تھی مگر اسکے آس پاس کے اونچے اونچے درختوں کی قطاروں۔ پہاڑی ناہموار زمین۔ سبز و شاداب گھاس اور دریائے کابل کی شفاف لہروں نے اس کو بڑی حد تک نگہ فریب اور دلکش بنا دیا تھا۔

نصیر خاں اپنی ڈور اور بنسی لئے۔ کرتا شلوار پہنے۔ یہاں سے کچھ فاصلہ پر لب دریا خاموش بیٹھا شکار کھیل رہا تھا کہ دفعتہً فضائے آسمانی پر اُودی اُودی گھٹائیں چھا گئیں۔ بات کی بات میں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو گیا۔ اور طوفانی بارش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ نصیر خاں چونکہ ابھی ابھی سخت بیماری سے اُٹھا تھا۔ اسکو سردی اور بارش سے محفوظ رہنے کی خاص ہدایت کیگئی تھی اور چونکہ اس وقت پوستین یا کوئی ایسی دوسری شئے اسکے پاس نہ تھی جس سے اپنے جسم کو رطوبت سے بچا سکے اس لئے وہ گھبرا کر اُٹھا اور اِدھر اُدھر جائے پناہ کی تلاش میں نگاہیں دَوڑا رہا تھا۔ کہ اس کی نظر اس جھونپڑے پر پڑی۔ وہ بے تحاشا بھاگ کر اس طرف آیا اور قبل اسکے کہ بارش کا پہلا قطرہ زمین پر گرے دروازہ کھول کر بے تکلف اندر داخل ہو گیا۔

اب وہ ایک وسیع اور خوشنما کمرہ میں تھا جس کا ساز و سامان دیکھ کر اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ پختہ چمکدار فرش پر جا بجا مختلف جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ میز۔ کرسی وغیرہ ہر چند کہ بوسیدہ اور قدیم وضع کی تھیں مگر پھر بھی قیمتی اور صناعی کا بہترین نمونہ۔ دیواروں پر دو چار دستی تصاویر لٹکی ہوئی تھیں۔ انگیٹھی پر دو پیتل کے خوشنما گلدان اور کچھ شیشے چینی کے برتن رکھے تھے۔ ایک طرف کھڑکی میں مصوری کے تختے پر ہوائی جہاز کی نامکمل تصویر چسپاں تھی جس کا دریائی معکوس اور گرد اگرد کے نظر فریب مناظر۔ درختوں کا سین۔ روانیٔ آب۔ بچوں کا حیرت و استعجاب سے اسکی طرف دیکھنا ایسی دلکش و دلفریب اور منظر آفریں باتیں تھیں جو نصیر خاں کی حساس طبیعت پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ کمرہ کا ساز و سامان بلکہ ہر شئے کے حسنِ انتخاب اور اسکی آراستگی میں ایک نسائی ذوق اور خوش سلیقگی اس درجہ بیّن طور پر نمایاں تھی کہ نصیر خاں کو بار بار اپنے دل میں یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ اس کی مالکہ ضرور کوئی خاتون ہے جو فنِ مصوری کی شائق اور بہترین ماہرہ ہے۔

نصیر خاں نے کھڑکی کے باہر نظر کی تو دیکھا کہ موسلا دھار پانی پڑ رہا تھا۔ ہوا کے تیز تھپیڑوں سے

درختوں پر ایک پُرلطف اور وجدانی کیفیت طاری تھی، ندی نالے اُبلے پڑتے تھے۔ وہ اس فرحت بخش منظر کا لطف اُٹھانے کے لئے کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ تو گیا لیکن دل ہی دل میں اس خیال سے شرمندہ اور پریشان تھا کہ مالکِ مکان اسکی دیدہ دلیری اور ناجائز دخل اندازی پر خدا معلوم دل میں کیا کیا نہ خیال کرے۔ اسی طرح اپنے خیالات کی اُدھیڑبن میں وہ کرسی سے اُٹھا۔ ڈھونڈھ کر انگیٹھی میں کچھ کوئلے وغیرہ ڈالے اور دیاسلائی لگا کر پھر بیٹھ گیا۔ ابھی چند لمحے ہی گذرے تھے کہ دفعتہً جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ کسی نے باہر سے ایک چھوٹا ہلکا اسٹول۔ تصویر بنانیکا تختہ۔ رنگ کی تشتری اور کاغذوں کا بنڈل ایک ایک کرکے اندر پھینکے۔ اس کے بعد ایک دوشیزہ۔ عمدہ قسم کی برساتی اوڑھے بارش کے پانی سے ازسرتاپا شرابور۔ ہانپتی۔ کانپتی داخل ہوئی جس کو دیکھتے ہی نصیر خاں کی ہمت جواب دے گئی۔ اسکے قلب کی پُرزور حرکت نے جسم میں رعشہ پیدا کر دیا ایک طرف تو رعبِ حسن۔ اور دوسری جانب اپنی ناجائز موجودگی کی ندامت نے اسکو مجبور کیا کہ خود ہی سرِ نیاز جھکا کر اقرارِ جرم کرے مگر اس اثناء میں لڑکی نے اسکو دیکھ لیا۔ اسکی متبسم نظروں اور سر کی ایک خوشگوار جنبش نے نہ صرف اسکے اطمینانِ قلب کا ثبوت دیا بلکہ نصیر خاں کی تالیفِ قلب کا سبب بن گئیں۔ وہ جلد جلد اپنا سامان قرینے سے رکھنے لگی۔ انگیٹھی پر نظر پڑتے ہی اس نے خندہ پیشانی سے پوچھا "کیا یہ آگ آپنے سُلگائی ہے؟ . . . . . ناحق زحمت فرمائی . . . . . . میں شکریہ ادا کرتی ہوں"

نصیر خاں کو اپنی قوتِ سماعت پر اعتبار نہ ہُوا۔ اسکو حیرت تھی کہ بجائے سخت کلامی اور دُشنام دہی کے وہ ان تشکر آمیز الفاظ کا کیونکر مستحق ہوگیا۔ جن معذرت کے الفاظ کا ذخیرہ لیکر وہ فرطِ ادب سے کھڑا ہُوا۔ ان میں سے ایک بھی اس سے ادا نہ ہوسکا۔ اس نے گھبراہٹ میں فقط اتنا کہدیا:-

"محض اس لئے کہ شاید آپ بھیگتی ہُوئی آئیں اور آگ کی ضرورت ہو۔"

"جی نہیں! میں بھیگی نہیں ہوں۔ برساتی نے بہت کچھ بچالیا۔" یہ کہہ کر اس نے برساتی اتار کر لٹکا دی اور اپنے دوپٹے کا بھیگا ہُوا آنچل آگ کے سامنے پھیلا کر قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور بولی۔ "مجھے نہایت مسرت ہے کہ میری عدم موجودگی میں آپ بے تکلف یہاں تشریف لے آئے آپ جانتے ہیں کہ دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہوکر دنوں کا شمار کس کو ٹھیک یاد رہ سکتا ہے۔ اور پھر بھلا مجھ جیسی کمبخت یاد کو! ۔ مجھے آج برابر دوشنبہ کا خیال رہا۔ آپکو آئے غالباً زیادہ دیر نہ گذری ہوگی۔ مجھے آپنے اپنی تشریف آوری سے حد درجہ ممنون فرمایا . . . منشی محمد اسمٰعیل خانصاحب! حقیقتاً آپ جیسے

مشغول آدمی کا عزیز وقت اتنے دشوار گذار سفر میں بیکار صرف ہوا جسکا مجھے افسوس ہے۔ مگر کیا کروں مجبور تھی ورنہ خود جلال آباد حاضر ہو جاتی ...... آپ تشریف رکھیں۔ میں چائے تیار کرتی ہوں۔"

نصیر خاں عالم تحیر و تشویش میں لڑکی کو بار بار سر سے پاؤں تک دیکھتا اور ہر سوال کے جواب میں یا تو محض سر ہلا دینے پر اکتفا کرتا یا کبھی عالم بیخودی میں اسکی زبان سے "ہاں" نہیں مہمل طور پر نکلجاتا۔ محمد اسمعیل خانصاحب کا نام سنتے ہی وہ ایکبار اچھل پڑا مگر یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ کوئی صاحب ہیں جنکی آمد کی لڑکی منتظر تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس نے انکو کبھی دیکھا نہیں ہے۔ چنانچہ بار بار ارادہ کرنیکے باوجود اسکے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، اور وہ سراسیمہ اور پریشان اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔ مگر لڑکی پر اسکا اثر ہی دوسرا ہوا۔ وہ اسکی خاموشی اور کم سخنی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی اور سمجھی کہ ان وکیلوں کا فرقہ بھی عجب خاموش طبیعت اور استقلال پسند ہوتا ہے۔ گھنٹوں چپ بیٹھ کر دوسروں کی داستان سنتے رہنا بس انہی کا کام ہے +

کچھ دیر بعد اس نے قصداً از راہِ تمسخر پوچھا "کہیئے جلال آباد میں آج موسم کیسا تھا؟"

"موسم کے اعتبار سے خوشگوار" نصیر خاں نے پوری احتیاط سے کام لیا تاکہ اسکا ہر جواب مختصر اور مزید سوال کی گنجایش سے بے نیاز ہو۔ لڑکی کو اس پر بیساختہ ہنسی آگئی اور بولی۔ "سبحان اللہ! کس قدر قانونی اور نپا تلا جواب ہے۔ یہی تو وکیلوں کی خصوصیت ہے۔ کیا اسکے لئے بھی اسی قدر احتیاط کی ضرورت تھی؟"

یہ سنتے ہی نصیر خاں کے اور کان کھڑے ہو گئے۔ اسکو اب صاف ظاہر ہو گیا کہ محمد اسمعیل خانصاحب جنکا لڑکی نے ابھی نام لیا کوئی جلال آباد کے وکیل ہیں اور اس پر اُسے انکا پورا شبہ ہو رہا ہے۔ وہ پریشان تھا کہ کس طرح اس مخمصہ سے نجات حاصل کرے۔ گو اسکو وکیل بننے اور اسکے نباہنے میں چنداں پس و پیش نہ تھا مگر صورتِ معاملات اس درجہ پیچیدہ ہوتی جاتی تھی کہ اسکو اپنی ندامت اور شرمندگی کا وقت قریب تر نظر آتا دکھائی دیتا تھا اس نے ایکبار پوری ہمت کرکے ارادہ کر لیا کہ جس طرح ہو لڑکی کو مزید اظہارِ واقعات سے روک دے مگر اسی اثناء میں لڑکی نے پھر کہنا شروع کر دیا :-

"میں جس قدر جلد آپکو اپنے معاملات سے کماحقہ واقف کردوں اسی قدر جلد آپ کسی مناسب نتیجہ پر پہنچنے میں کامیاب ہونگے اور چائے بھی بطیبِ خاطر نوش فرما سکینگے۔ یہ تو میں آپ کو لکھ چکی ہوں کہ سارا معاملہ میرے حقیقی بھائی سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے بھائی فریدالدین سے ......"

نصیر خاں نے گھبراہٹ میں ایک ہاتھ بڑھا کر لڑکی کو خاموش کرنیکی کوشش کی اور لڑکھڑاتی

زبان سے بولا" اسکے متعلق اب آپ کچھ اور نہ فرمائیں میں نہیں سمجھتا کہ آپ مجھکو کیا خیال کرینگی جب میں ......"

لڑکی :- (بات کاٹ کر) بیشک! آپ واقعات سے ناواقف ہیں۔ آپ اس وجہ سے پریشان نہ ہوں مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی تحریر میں آپکو مفصل حالات سے مطلع نہ کرسکی۔ لیکن اب آپکو مختصر الفاظ میں سارا قصہ سنائے دیتی ہوں جس کے بعد آپکی صائب رائے سے مستفید ہونا میرا واحد مقصد ہوگا"

نصیر خاں ایک ٹھنڈی سانس بھرکر بالآخر خاموش ہوگیا۔ گناہ۔ اور لذتِ گناہ انسانی ضمیر کو گمراہ کرنے کے لئے نت نئی قسم کے صدہا بہانے اور عذرِ لنگ تلاش کر لینے میں ہمیشہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ نصیر خاں کو بھی ضمیر کے بار بار ملامت کرنے کے باوجود یہ خیال کرکے سرِ تسلیم خم کرلینا پڑا کہ اس نے حتی الوسع پوری کوشش کرلی کہ لڑکی پر اپنی اصلیت کا اظہار کرکے اسکی غلط فہمی کو رفع کردے مگر شاید خدا کو یہی منظور معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی اپنی داستان جاری رکھے اور وہ خاموش سنتا رہے۔ اگر اسکو بہ اصرار خاموش کرتا ہے تو لڑکی بلاشبہ خوف زدہ ہوجائیگی۔ اس بچاری کو اس وقت ہمدرد کی تلاش ہے۔ کیا ہرج ہوگا کہ وہ وکیل بن کر اسکی داستان سن لے اور کوئی ایسی مفید تدبیر بتادے جس سے اس کا غم غلط ہو اور مطلب براری ہوجائے، وہ انہی خیالات کی ادھیڑ بن میں تھا کہ لڑکی نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کردیا:۔

"میں اب آپ سے صاف صاف عرض کرتی ہوں کہ میرے بھائی کچھ عرصہ سے بری صحبت کا شکار ہوکر گمراہ ہو گئے ہیں۔ مے نوشی اور قمار بازی کا انکو چسکا پڑگیا ہے اور مزید برآں میں نے اب سنا ہے کہ وہ کسی پر فریفتہ بھی ہیں۔ انہوں نے پوشیدہ طور پر صدہا روپیہ قرض لیکر برباد کردیا ہے۔ قرضداروں نے شاید نالش وغیرہ کی دھمکی دی ہے اس لئے دو روز سے وہ روپوش اور مفقود الخبر ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ بجز ذلت و رسوائی کے کوئی ذریعہ انکی گلوخلاصی کا نہیں، اور سب سے زیادہ ڈر تو یہ ہے کہ اگر ان واقعات کی اطلاع کانوں کان کہیں میرے چچا کو پہنچ گئی تو وہ انکو اپنے ورثہ سے ضرور محروم کردینگے۔ اس وقت ہم دونوں کی آمدنی کا ذریعہ وہی جائداد ہے جو ہمارے چچا نے ہمارے نام وقف کردی ہے۔ وہ ان سے یوں بھی ناخوش رہتے ہیں اگر خدانخواستہ کہیں یہ باتیں سن پائیں تو پھر ہماری تباہی یقینی ہوجائیگی۔ وقف نامہ کی اولین شرط یہ ہے کہ جبتک انکی عمر پوری تیس سال کی نہ ہوجائے وہ جائداد کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اور مجھے بھی یوں پابند کردیا گیا ہے کہ تاوقتیکہ پچیس سال کی نہ ہوجاؤں اپنی جائداد پر اختیارِ کلی حاصل نہیں کرسکتی بجز اسکے کہ اس سے قبل میں کسی مناسب جگہ اپنی شادی کرلوں۔ قرضے کی رقم تقریباً چار پانچ ہزار کے درمیان

تک پہنچ گئی ہے۔ ہم دونوں کی جائداد کی آمدنی فقط چار سو سالانہ کی ہے۔ اگر تھوڑا بہت میری بی بی معنوی سے سہارا نہ ملتا تو شاید گذر اوقات بھی مشکل ہو جاتی۔ میں نے بارہا اس پر غور کیا کہ میں اپنے چچا کے پاس جا کر روپیہ طلب کروں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی ضرورت پیش کروں اور کس بہانہ سے کام لوں اور ...... وہ مجھے اور فریدالدین کو خوب جانتے ہیں فوراً سمجھ جائینگے کہ ضرور کوئی فریدالدین کی ناجائز ضرورت ہوگی۔ ...... آپ دیکھتے ہیں میری مشکلات!" یہ کہکر اُسکا دل بھر آیا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ نصیر خاں اب تک چپ بیٹھا لڑکی کے ایک ایک حرف کو بغور سُن رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بولا "آپ گھبرائیں نہیں! پریشان نہ ہوں! ...... غالباً آپ یہ چاہتی ہیں کہ کسی ذریعہ سے روپیہ قرض ملجائے اور آپکے چچا کو خبر نہ ہو!"

لڑکی۔ (آنسو پونچھ کر) "جی ہاں! اگر کوئی ایسی صورت ممکن ہو جائے تو عمر بھر بار احسان سے سبکدوش نہ ہو سکوں۔ میں ادائے رقم کے متعلق ہر مناسب شرط پر رضامند ہوں"

نصیر خاں "مگر میرے خیال میں ...... یہ آسان کام نہیں! روپیہ کسی طرح بھی لیا جائے بغیر کافی ضمانت کے کوئی نہیں دیتا"

یہ سنتے ہی لڑکی کے چہرہ پر مایوسی کے آثار نمایاں ہو گئے اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "وکیل صاحب! ضمانت کے لئے تو میری جائداد موجود ہے۔ اگر آج نہیں تو دو چار برس کے بعد تو مجھے اپنے حصہ پر پورا اختیار حاصل ہو ہی جائیگا اُس وقت مجھ سے ہر طرح روپیہ وصول کیا جا سکتا ہے"

نصیر خاں "افسوس یہ ہے کہ آپ مہاجنوں کی کج خلقیوں اور ریشہ دوانیوں سے مطلق واقف نہیں۔ میری رائے میں آپ اس خیال سے درگذریئے اور جس طرح ہو اپنے چچا ہی کو رضامند کیجئے"

لڑکی "آہ! یہ بھی ناممکن ہے ...... (کچھ توقف کے بعد) اچھا! تو اب مجھے یہی کرنا پڑیگا"

نصیر خاں "وہ کیا؟"

لڑکی "شادی۔"

نصیر خاں "شادی؟"

لڑکی "جی ہاں! کیا آپکے خیال میں یہ بھی کوئی مشکل کام ہے؟"

نصیر خاں "نہیں۔ میرا مطلب یہ نہ تھا۔ بلکہ ......"

لڑکی :- میں آپ کا مطلب سمجھ گئی۔ ایک صاحب کا پیغام آچکا ہے "
نصیر خاں :- ایک کیا صدہا آئے ہونگے۔ مگر . . . . . کیا آپ خیال کرتی ہیں کہ یہ صاحب آپکے موزوں شوہر ہونگے ؟ "

لڑکی نے کرسی پر اس طرح پہلو بدلا کہ نصیر خاں اسکے چہرہ کی گھبراہٹ کو محسوس نہ کر سکے۔ کچھ دیر تامل کے بعد اس نے جواب دیا "جی نہیں! سچ پوچھئے تو موزونیت کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ مگر یہ صاحب میرے مصائب و تفکرات سے واقف ہونیکے باوجود نکاح کیلئے تیار ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب مجبوراً مجھ کو شادی کر ہی لینا پڑیگی! "

نصیر خاں :- فقط اس لئے کہ آپ اپنی جائداد پر پورا اختیار حاصل کرسکیں؟ "
لڑکی :- جی نہیں! بلکہ اپنے بھائی کو موجودہ مصائب سے نجات دلانے کے لئے "

نصیر خاں پر اس جواب سے ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ بیساختہ کھڑا ہو کر کمرہ میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اسکی نظریں گو نیچی تھیں مگر چہرہ سے غور و فکر کے آثار نمایاں تھے کچھ دیر بعد اس نے کہا "خدا کے لئے آپ اس ارادے سے باز آئیے "

لڑکی نے تعجب سے پوچھا "شادی کے متعلق ؟ "

نصیر خاں :- جی ہاں! شادی اگر بلالحاظِ موزونیت محض کسی دوسرے مقصد کو مدِنظر رکھکر کی جائے تو ظاہر ہے کہ آئندہ زندگی میں میاں بی بی کے خوشگوار تعلقات کی ضامن نہیں ہوسکتی۔ اسکے علاوہ بھلا آپ سی شریف طینت فرشتہ سیرت خاتون کیلئے کیا یہ خودکشی سے کم ہوگا کہ آپ دیدہ دانستہ اپنی زندگی کو دائمی مصائب و آلام کی بھینٹ چڑھا دیں "

لڑکی نے شرم سے نگاہیں نیچی کرلیں اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لیکر بولی "محمد اسمٰعیل خانصاحب! آپ اپنی قسم کے نئے وکیل معلوم ہوتے ہیں۔ میری ہر تجویز کو مسترد کر دیا۔ اب آخر آپ ہی بتائیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟ "

نصیر خاں :- صبر! "
لڑکی :- اور اگر اس اثنا میں کوئی موزوں و مناسب پیغام آجائے تو مجھے شادی کرلینی چاہیئے ؟ "
نصیر خاں :- میرے خیال میں نہیں۔ آپ اس قدر جلد کسی معقول فیصلہ پر ہرگز نہ پہنچ سکینگی "

۲

چھوٹی سی میز پر سفید کپڑا بچھادیا گیا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ مگر دونوں الگ الگ اپنی دنیائے تخیل میں محو بیخودی تھے۔ لڑکی کو مصائب و آلام کی تازہ یاد نے بحر غم میں غرق کر دیا تھا۔ مزید برآں محمد اسمعیل خانصاحب کی آمد اور انکے مشوروں سے جو کچھ اُمیدیں اور آسرے وابستہ کر رکھے تھے ظاہراً سب شکستہ ہو چکے تھے۔ ناکامیوں نے اسکے لبوں پر مہر سکوت لگادی تھی اور اس وقت اسکو اتنا بھی احساس باقی نہ تھا۔ کہ وہ چائے پی رہی ہے۔ نصیر خاں کو یہ خلجان تھا کہ دیکھئے لڑکی اب آگے اور کیا کہتی ہے، وہ برابر اسی اُدھیڑ بن میں لگا تھا کہ کسی طرح کوئی موقعہ ہاتھ آئے اور وہ لڑکی کو اپنی اصلیت سے آگاہ کر دے۔ چنانچہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نصیر خاں نے ایک مرتبہ پہلو بدلا۔ باہر نظر ڈال کر ایک لمبی سانس لی اور بولا۔" اللہ غنی! آج کی بارش ہے یا طوفان؟ خدا رحم کرے"

لڑکی نے نظر اُٹھا کر نہ تو اسکی طرف دیکھا اور نہ کوئی جواب ہی دیا بلکہ اسی طرح ایک کہنی میز پر رکھے اپنے رخسار کو ہتھیلی کا سہارا دئے رہی۔ دوسرے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی اور اسکی نظر اس پر اس طرح جمی ہوئی تھی گویا اسکی کامیابی کے سارے راز اسی میں پوشیدہ تھے۔

نصیر خاں نے اپنی رو میں پھر کہنا شروع کیا" بعض اوقات ایسے موقعوں پر عجیب اہم واقعات پیش آتے ہیں ابھی تھوڑے دنوں کا ذکر ہے کہ میرے دوست نصیر خاں صاحب ایسی ہی آفت ناگہانی میں پھنس گئے۔ مہلک بیماری سے نجات پانیکے بعد انکو معالج نے یہ ہدایت کی تھی کہ کچھ عرصہ تک دُنیاوی مخمصوں سے علٰحدہ ہو کر سیر و تفریح میں بسر کریں چنانچہ اسی لئے وہ گھر سے دُور ایک کھلے مقام پر لب دریا بیٹھے شکار کھیل رہے تھے کہ دفعتہً بارش کے آثار نمایاں ہو گئے انکے پاس اپنی محافظت کا چونکہ کوئی سامان نہ تھا اسلئے وہ گھبرا کر اُٹھے اور جائے پناہ تلاش کرنے لگے، اتفاق دیکھئے کہ قریب ہی انکو ایک خس پوش جھونپڑا دکھائی دیا۔ جہاں پر انہوں نے کئی بار دستک دی مگر کوئی جواب نہ پاکر مجبوراً دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ہر چند کہ انکی یہ حرکت نازیبا تھی مگر انکو اپنی جان کی حفاظت کیلئے ایسا کرنا پڑا۔ اس گھر کی آرائش اور سامان مصوری دیکھ کر انکو انتہائی حیرت ہوئی اور کچھ دیر بعد ہی انکو یقین ہو گیا کہ اسکی مالکہ کوئی دوشیزہ مصور ہے۔ چنانچہ اس خیال سے کہ شاید وہ بھیگتی ہوئی واپس آئے۔ انہوں نے انگیٹھی وغیرہ تلاش کر کے آگ سلگادی"!

لڑکی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔ نصیر خاں تجاہل عارفانہ سے کھانسنے لگا۔ لڑکی خوف زدہ ہو کر اسکو سر سے پاؤں تک مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ پیشانی پر بل ڈالکر اس نے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔ اچھا پھر آگے چلئے!

نصیر خاں:" اتنے میں مکان کی مالکہ بھیگتی ہوئی واپس آگئی جسکو دیکھتے ہی نصیر خاں کے رہے سہے حواس جاتے رہے اسکو یقین ہوگیا کہ دوشیزہ اسکی بیجا موجودگی سے ناخوش ہوگی اور ضرور اسکو اسی حالت میں مکان سے باہر نکل جانے پر مجبور کریگی مگر واقعات اسکے بالکل خلاف پیش آئے۔ لڑکی کسی ایسے آنے والے شخص کی منتظر تھی جسکو اس نے کبھی دیکھا نہ تھا چنانچہ نصیر خاں کو وہی آنیوالا شخص سمجھ کر اس نے خاطر و مدارات شروع کردی نصیر خاں کو حیرت رہی مگر مجبوراً ریاکاری سے کام لیکر خاموش رہنا پڑا۔ لڑکی نے اسکو وکیل سمجھ کر اپنے متعلق ایسے واقعات بیان کرنا شروع کردئے جنکے سننے کا حق نصیر خاں سے اجنبی کو ہرگز نہ تھا۔ مگر وہ بیچارا کیا کرتا۔ اس نے بار بار کوشش کی کہ لڑکی کو اپنی شخصیت سے آگاہ کردے مگر اسکی معصومیت اور بھولاپن دیکھ کر اپنی قوتِ ارادی کا مختار نہ رہا اور خاموشی کے ساتھ اسکی داستان سننے پر مجبور ہوگیا۔ مگر ساتھ ہی اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ لڑکی کا راز اسکا راز ہوگا اور تاحیات اسکے سینے میں محفوظ رہیگا۔"

لڑکی کھڑی ہوگئی غصہ سے اسکی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "نصیر خاں صاحب؟"

نصیر خاں بھی بہ ادبِ تمام کھڑا ہوگیا۔ خجالت کے بار سے اسکا سر جھکا جاتا تھا۔ اس نے اپنی نظریں نیچی رکھکر کہا۔ "محترم خاتون! میں اپنی خطا پر خود نادم ہوں۔ سہ شنبہ کل ہے۔ اس لئے آپکے وکیل محمد اسمٰعیل خانصاحب کے آنیکا دن بھی کل ہے۔"

لڑکی: "آپکی یہ حرکت نہایت نازیبا تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپنے سخت گناہ کیا۔"

نصیر خاں: "بیشک! میں نہیں سمجھتا کہ اب اسکی تلافی کیونکر کروں۔ مگر اتنا ضرور عرض کرتا ہوں کہ خدا کیلئے آپ حصولِ قرض اور ناموزوں شادی ہر دو خیالات سے درگذر یئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رقم مطلوبہ کل صبح تک پہنچ جائیگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا حافظ!"

یہ کہتا ہوا نصیر خاں دروازہ سے باہر نکل گیا ہوتا۔ مگر کسی کی نازک انگلیوں نے اسکا دامن پکڑکر روک لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ تو کسی کی پشیمان نظر زبانِ بیزبانی سے نہ صرف مہمان نوازی کے لئے مصر تھی بلکہ دعوتِ محبت بھی دے رہی تھی +

دیوانہ (بریلوی)

کچھ کام کر

الفت سے جگ کو رام کر   خوشیوں کو سب میں عام کر
دنیا میں کچھ دن کام کر   پھر قبر میں آرام کر
کچھ کام کر کچھ کام کر

کر کام صبح و شام کچھ   ہے کام ہی میں نام کچھ
لیکر یہاں آرام کچھ   کرتا ہی رہ تو کام کچھ
کچھ کام کر کچھ کام کر

کچھ کر جو کرنا ہے تجھے   جگ سے گذرنا ہے تجھے
اس گھاٹ اترنا ہے تجھے   دو دن کو مرنا ہے تجھے
کچھ کام کر کچھ کام کر

تیری یہ ناداری ہے کفر   یہ ذلت و خواری ہے کفر
دنیا سے بیزاری ہے کفر   کچھ کر کہ بیکاری ہے کفر
کچھ کام کر کچھ کام کر

کمزور کو ہمت دلا   بیمار کی ڈھارس بندھا
غمگیں دلوں کا غم مٹا   دنیا کو نام حق سنا
کچھ کام کر کچھ کام کر

دل سے بھلا رنج و الم   اور کر نہ فکر بیش و کم
جبتک ہے تیرے دم میں دم   چل اور بڑھائے جا قدم
کچھ کام کر کچھ کام کر

گذرے جو ساعت عمر کی   اس پہ نہ نادم ہو کبھی
نیکی ہے یہ سب سے بڑی   نیکی میں خوش رہ ہر گھڑی
کچھ کام کر کچھ کام کر

بشیر احمد

مشرب ناب

انسان اپنی قسمت کا آپ معمار ہوتا ہے، اس لئے کہ خدا مدد کرتا ہے انہی لوگوں کی جو اپنی آپ مدد کرتے ہیں ایک شاعر نے لکھا تھا اور کس قدر درست لکھا تھا! کہ خدائے تعالےٰ نے ہر شخص کو ایسے ہات ضرور دئے ہیں جو آسمانوں تک پہنچ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ پھیلائے جائیں۔

دُنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جو ناممکن ہو، صرف نپولین بونا پارٹ کی ضرورت ہے، مگر ہر شخص نپولین نہیں بن سکتا، اس لئے نہیں کہ وہ بننا نہیں چاہتا، بلکہ اس لئے کہ وہ بننے کی کوشش نہیں کرتا، کیا نپولین بننے کے معنی صرف یہی ہیں کہ کوئی شخص فرانس کے مخالفین کو پے بہ پے زک دیا کرے؟ سوئٹزرلینڈ کے دشوار گذار راستے عبور کرلے؟ مصر اور سوڈان یا جرمنی اور یونان پر دھاوے کرے؟ اور آخر کار ایک زبردست شہنشاہ بن جائے؟ نہیں، ہرگز نہیں!!

ہر وہ شخص جو اپنے ماحول کی مخالف قوتوں کو اپنی اَن تھک کوششوں کے ذریعہ سے توڑ دیتا ہے اور اپنے راستہ کی رکاوٹوں کو اپنی غیر معمولی جرأت و ہمّت سے دُور کر دیتا ہے، صحیح معنوں میں نپولین بن سکتا ہے وہ نپولین نہیں، جو جزیرہ سینٹ ہلنیا میں بیکسی اور بے چارگی کی مَوت مرا، بلکہ وہ نپولین جسکی خاطر لاکھوں بنی نوعِ انسان جان دیدینے کے لئے تیار رہا کرتے تھے، اور جسکی عظمت کے آگے روئے زمین کے جابر و مطلق العنان حکمران بھی سرنگوں ہو جاتے تھے!

کائنات انصاف پر مبنی ہے، وہ خود انصاف کرتی ہے اور منصف مزاجوں کو پسند بھی کرتی ہے، جو شخص اسکے حق میں انصاف کرتا ہے وہ اسکا بدلہ دئے بغیر نہیں رہتی، جو شخص دنیا میں، اُس دُنیا میں جو محشرستانِ حادثات ہے ایک دیکھنے والی آنکھ، سُننے والے کان، سوچنے اور سمجھنے والی عقل، اور متاثر ہونے والے دل کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، زمانہ اسکے تماشے کے لئے رنگ برنگ کے نظارے پیش کرتا جاتا ہے، دنیا اسکی خاطر قسم قسم کے ترنم خیز نغمے چھیڑتی جاتی ہے، کائنات اسکی دلچسپی کے واسطے آئے دن نئی نئی چیزیں ظاہر کرتی رہتی ہے اور عالم اسکو ہر وقت ایک ایسی شکل میں نظر آتا ہے جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جو شخص خود غرض ہے، خود پرست ہے اور خود نما ہے، دنیا بھی اسکو خود غرض، خود پرست اور خود نما نظر

آئیگی وہ جبتک دوسروں کی روٹیوں پر کی دال اپنی روٹی پر کھینچتا رہیگا، اسوقت تک اُسکو بھوکا اُٹھنا پڑیگا۔ وہ جبتک اپنے گھمنڈ میں سرشار رہیگا، کائنات کا ایک ایک ذرہ آفتاب بن کر اُس سے علیحدگی چاہیگا، وہ جبتک ہر معاملہ میں "من چیزے ہستم" کی صدا بلند کرتا رہیگا ہر ایک معاملہ "چیزِ دیگر" کی شکل میں نظر آتا جائیگا۔ کائنات اور اُسکی ساری مخلوق خود انسان کی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کا آئینہ ہوتی ہے ہمدرد انسان کے ساتھ دنیا کی ساری مخلوق ہمدردی کرنیکے لئے بڑھتی ہے۔ جس شخص میں خلوص ہوگا، دُنیا کا ذرہ ذرہ اُس سے بغلگیر ہونیکے لئے اپنے آغوش کو وسیع کرلیگا۔ جو کوئی محبت بھری آنکھوں سے زمانہ پر نظر ڈالتا ہے، زمانہ کا ہر منظر اسکو اپنی طرف کھینچنے اور اُسکی دلجوئی کرنے میں محو نظر آتا ہے، جہاں کہیں کوئی شخص کسی مقصد کی خاطر محنت اور استقلال سے کام کرتا ہے، خود اسکا مقصد اسکی طرف کھچا چلا آتا ہے +

مقاصد گھاس پھوس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن کس کے نزدیک؟ اُس انسان کے نزدیک جسکے پاس محنت اور مستقل مزاجی کا حربہ ہوتا ہے۔ جس میں اسکا فقدان ہو، اسکو اپنے راستہ کا ایک ایک روڑا بھی ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیوں سے زیادہ خطرناک اور ناقابلِ عبور نظر آتا ہے +

انسان کی فطرت میں ہزار ہا قسم کی قوتیں ودیعت کردی گئی ہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ ان سے واقف ہوکر اُن سے کام لینے کی کوشش کی جائے۔ کہنے کو تو تمام آدمی ہم رتبہ وہم قوت ہیں لیکن ایک شخص سُلطان علاء الدین حسن گنگو غازی بن جاتا ہے اور اسکا دوسرا ساتھی ایک معمولی دیہاتی کسان! اس لئے نہیں کہ اوّل الذکر کسی بادشاہ یا امیر کے گھر پیدا ہوا تھا، بلکہ اس لئے کہ ہمت اور استقلال کے دیوتاؤں کو اس نے اپنا ہمدم بنالیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسکو "موقعے" حاصل ہوگئے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ اُس نے اپنی محنت اور دیانتداری کے ذریعہ سے "موقعوں" کو اپنی طرف آنے کا موقع دیا +

ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری
بی۔ اے

———※———

محفلِ ادب

برکھارت میں

پھر حسینوں کی طبیعت لاجونتی ہوگئی
تھی جو ساری سادی سادی وہ بسنتی ہوگئی

کالی کالی اور متوالی گھٹائیں چھا گئیں
یا سیہ پریاں فضا میں بال کھولے آگئیں

برق کے انوار پر ابرِ سیہ مرنے لگا
چوٹیوں سے کوہ کی سرگوشیاں کرنے لگا

پتی پتی ڈالی ڈالی کانپا عالم ہُوا
اور سے کچھ اور اک اِک قطرۂ شبنم ہُوا

یوں نکل آئے شجر پہنے زمرد کی عبا
جیسے کیف وجد میں ہوں مست خاصانِ خدا

ددب نے مخمل بچھایا ہے پرِ طاؤس کا
رنگ سبزہ نے اڑایا تختِ کیکاؤس کا

ایک ہے سارے چمن والوں پہ یہ بخشش تری
آرزو اے کاش اتنی پوری ہو جائے مری

وہ! انہیں پھولوں کے پردے میں جو ہے پردہ نشیں
وہ! جسے کہتے ہیں سب نازکبدن ناز آفریں

جسکے ہر انداز پر "شہناز" کو اتنا ہے ناز
غزنوی سے مدتوں ملتا رہا بن کر "ایاز"

یہ لبِ "سوسن" مسی مالیدہ ہے جس کیلئے
بھیس میں لیلیٰ کے جس نے قیس کو صدمے دئے

"دامنِ صد برگ" جسکے واسطے ہے چاک چاک
جسکی خاطر ہو گیا فرہاد تیشے سے ہلاک

نازکی جو ہی میں جسکی بانکپن "شبو" میں ہے
زلفِ شیریں میں جو تھا سنبل کے اک اک مو میں

سینۂ لالہ کے جو ہر داغ میں ہے ضوفشاں
نور جس کا تھا جبینِ ماہِ کنعاں سے عیاں

دل میں رہ رہ کے بتلائے طرزِ حسنِ دلبری
اور نہ ماہر کہہ سکے "من دیگرم تو دیگری"

(دلگار)

اختر شماری:- امریکہ کے بعض ماہرین فلکیات نے اختر شماری جیسے غیر متناہی سلسلۂ عمل کو بھی

پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، انہوں نے اپنی جد وجہد کے نتائج شائع کر دیئے ہیں جس سے ہر حصۂ ملک کے ستاروں کی تعداد معلوم ہوتی ہے، وہ اعداد و شمار حسب ذیل ہیں،

ولایات متحدہ امریکہ	۱۹۸۴۳۹۰۰	برطانیہ عظمیٰ	۹۰۶۶۰۰،
فرانس،	۷۶۳۵۰۰،	کناڈا	۷۱۹۷۰۰،
اسٹریلیا،	۲۹۷۳۰۰،	جرمنی	۲۹۱۹۰۰،
بلجیم،	۱۱۹۶۰۰،	اٹلی	۱۰۸۷۰۰،

لیکن ہمارے مشرقی شعرا کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ اس فہرست میں کسی مشرقی ملک کا نام موجود نہیں

(معارف)

شاعری کی تعریفات۔ جانسن کہتا ہے شاعری "مقفیٰ مضمون نگاری ہے، صداقت کو مسرت کے ساتھ تخیل کی مدد سے متحد کر دینے کا نام ہے" "شاعری خیالات و الفاظ کے علاوہ اور کیا ہے"؟ مکالے کے خیال میں شاعری سے ہمارا مقصد الفاظ کو اس طرح استعمال کرنا ہے، کہ تخیل پر اثر پڑے یعنی الفاظ سے وہ کام لینا جو نقاش رنگوں سے لیتا ہے، کارلائل اعلان کرتا ہے ہم شاعری سے "موسیقانہ خیال" مراد لیں گے، شیلے کہتا ہے شاعری کو ہم عام الفاظ میں اظہار تخیل کہہ سکتے ہیں، ہیزلٹ کے خیال میں یہ "تخیل و جذبات کی زبان" ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے نزدیک "انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے، یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے ذوق و شوق، عشق و محبت، حیرت و استعجاب، طیش و غضب، رنج و غم وغیرہ کی جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں انکو اس طرح سے موزوں کر کے ادا کرنا کہ جو اسکے دل میں ہے وہی دوسروں پر چھا جائے۔ اسی کا نام شاعری ہے" علامہ شبلی کے نزدیک جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں، وہ شعر ہیں، علامۂ حالی مکالے کا قول نقل کرتے ہیں اور کسی دوسرے محقق کا بھی کہ "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اُس کو سُن کر خوش یا متاثر ہو، وہ شعر ہے خواہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ لے ہنٹ کہتا ہے کہ "یہ صداقت حسن، یا قوت کے لئے جذبہ کا اظہار ہے، وہ تخیل کے ذریعہ سے اپنے خیالات کی تشریح کرتی ہے" کولیرج کی نظروں میں شاعری سائنس کے مقابل ہے اس لئے کہ اس کا مقصد صداقت نہیں مسرت ہے۔ میتھو آرنلڈ کے خیال میں یہ بیان کی وہ مکمل و مسرت زا شکل ہے جو الفاظ اختیار کر سکتے ہیں اور

حسن و صداقت شعری کے متعینہ قوانین کے تحت میں زندگی کی تنقید ہے کمپبل کے نزدیک "زبردست جذبہ یا تخیل کی آواز ہے" رسکن اسکی تعریف اس طرح کرتا ہے: "یہ تخیل کی تجویز ہے شریفانہ جذبات کیلئے شریفانہ بنیادوں کی"۔

(نگار)

یورپ کے مسلمانوں کے اعداد و شمار۔ ایک رسالہ نے یورپ کے مسلمانوں کے حسب ذیل اعداد و شمار شائع کئے ہیں:۔

البانیا، ۸۳۰۰۰۰،
یونان، ۴۷۵۰۰۰،
رومانیا، ۴۴۰۸۷،
دیگر بلادِ یورپ، ۴۶۲۳۷۰،

بلغاریہ، ۰۶۷۲۵۰۰ ،
مانٹینگرو، ۱۰۵۰۰۰،
روس، ۱۵۲۰۰۰۰۰

مجموعہ ۱۷۷۸۸۹۵۷،

(معارف)

کچھ بےخبر نہ تھے دل و جاں کے زیاں سے ہم
بچتے رہے مگر نہ بچے امتحاں سے ہم

دل ہی نے ان کے دل سے کہی داستانِ شوق
سمجھا سکے نہ حالِ دل ان کو زباں سے ہم

کیا بےوفائیوں کا گلہ اُن سے کیجئے
ہیں منفعل اب آپ ہی اپنے گماں سے ہم

کچھ اپنا حال کہہ کے پریشاں ہیں روز و شب
اتنے بھی کیوں کھُلے تھے مگر رازداں سے ہم

نازاں ہم اعتمادِ وفا پر بہت رہے
واقف نہ تھے ابھی رہ و رسمِ جہاں سے ہم

کس سے بیاں خرابیٔ دل کا فسانہ ہو؟
داد اس جنونِ شوق کی پائیں کہاں سے ہم؟

کچھ اپنی بات پاتے ہیں غیروں کے حال میں
بس اب تو ٹو کا ئینگے افسانہ خواں سے ہم

اب جوشِ آرزو کی وہ کیفیتیں کہاں
رہنے لگے ہیں اُن سے بھی کچھ سرگراں سے ہم

حامد وہ آشنا بھی تو اپنا نہ ہو سکا
بیگانہ جسکے واسطے ہیں اک جہاں سے ہم

حامد علی خاں

فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

جلد ۱۰ — نمبر ۶

تصویر:- عظمت مغلیہ کی شام

شکریہ۔ ہم اپنے دوست جناب میاں محمد اسلم صاحب سب جج کے مرہونِ منت ہیں کہ انہوں نے ہمیں شالامار باغ (لاہور) کی یہ خوبصورت تصویر جو موجودہ اشاعت کی زینت ہے ہمایوں کے لئے عنایت فرمائی۔

آپ اور ہم

گزشتہ دسمبر میں ہمایوں کو زیادہ دلچسپ اور مفید بنانیکے لئے ہم نے جو کوشش شروع کی تھی اسکے نتائج ہم سے زیادہ آپکو معلوم ہیں' اُمید ہے کہ آپنے اس حقیقت کو نظرانداز نہ کیا ہوگا کہ چندہ میں کسی قسم کے اضافہ کے بغیر ہم نے ہمایوں کا حجم پہلے کی نسبت سے بڑھا دیا ہے' اور تصویریں بھی اس سال کے اکثر پرچوں میں مقابلتہً زیادہ شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ اس سال کا آخری پرچہ ہے اس سال کے آغاز میں ہمایوں کی اشاعت جس قدر تھی اسوقت تک اُس سے ڈیوڑھی ہو چکی ہے۔ ہم آپکی اس حوصلہ افزائی کے ممنون ہیں' لیکن آپ سے ہماری توقعات اس سے بھی کچھ زیادہ ہیں' اگر ہمایوں کا ہر خریدار ایک ایک دو دو خریدار بھی پیدا کرے تو ہمایوں کی اشاعت بہت جلد چار بلکہ پانچ ہزار تک پہنچ سکتی ہے۔ کیا یہ آپ کیلئے کوئی بہت بڑی بات ہے۔ آخر ہمیں بھی تو کچھ معلوم ہو کہ آپ ہماری ناچیز مساعی کی قدر کرتے ہیں *

ہمارا ارادہ ہے کہ نئے سال کے آغاز میں ہمایوں کو اور بھی زیادہ بلند معیار پر لیجائیں اس میں ہماری جو مدد آپ کر سکتے ہیں اسکی ہمیں آپ سے توقع ہے آئندہ پرچہ ہمایوں کا سالگرہ نمبر ہوگا۔ اس کا حجم سو صفحے سے زیادہ ہوگا اور اس میں ملک بھر کے باکمال اور مشہور ادبا و فضلا اور شعرا کے بہترین نتائج تخیل پیش کئے جائیں گے۔ اس نمبر کا ہر مضمون ہر افسانہ اور ہر نظم اہل نظر کی توجہ کی خاص مستحق ہوگی۔ اس پرچہ کے لئے خوبصورت رنگین اور عکسی تصویروں کا اہتمام خاص طور پر کیا گیا ہے۔ یہ تمام کی تمام تصویریں نہایت بلند پایہ دلچسپ اور قابلِ قدر ہیں۔ اس پرچہ کی دوسری خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں *

کیا آپ اپنے حلقۂ اثر میں جنوری سے ہمایوں کے دو ایک خریدار پیدا کر کے ہماری حوصلہ افزائی اور اپنے پرچہ کی ترقی کی کوشش نہ کرینگے ؟ پیشگی شکریہ قبول ہو۔

"ہم"

جہاں نما

بمبئی پریذیڈنسی مسلم لیڈیز ایجوکیشنل کانفرنس:- مسلمانان ہند کی برگشتہ طالعی نے ابتدا ہی سے تعلیم نسواں کے مسئلہ میں جو غیر مآل اندیشانہ تغافل شعاری جائز رکھی آخر وہ رنگ لائے بغیر نہ رہی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان قوم آج من حیث المجموع ملک میں تمدنی، معاشرتی اور اقتصادی انحطاط کے اسفل السافلین میں گری ہوئی نظر آتی ہے اور مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا ہے ۔

قوم کو اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے آجکل ملک میں مختلف مجالس قائم ہو رہی ہیں اور آخر اس ہلاکت پر جمود کا خمار کچھ ٹوٹتا ہوا نظر آرہا ہے جس کی نحوست صدیوں سے ہمارے سروں پر منڈلا رہی تھی ملک کے مستقبل کیلئے یقیناً یہ ایک مبارک فال ہے ۔

آج سے چند سال قبل بعض تعلیمیافتہ اور ہمدرد ملت خواتین نے احاطۂ بمبئی میں تعلیم نسواں کے مقاصد کی تبلیغ کی غرض سے "بمبئی پریذیڈنسی مسلم لیڈیز ایجوکیشنل کانفرنس" کی بنیاد رکھی تھی ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو اس کانفرنس کا تیسرا اجلاس بمقام پونا منعقد ہوا جس کی کرسی صدارت پر مسز خدیجہ شفیع طیب جی صاحبہ رونق افروز ہوئیں محترمہ ممدوحہ نے اس موقع پر اپنے بلیغ خطبۂ صدارت میں ترقی و تعلیم نسواں کے متعلق جن ولپذیر اور نکتہ آموز حقائق کی چہرہ کشائی کی اُن سے کسی شخص کو انکار نہیں ہوسکتا۔ افسوس کہ اس قلیل گنجائش میں ہم اس اہم اور مفید خطبۂ صدارت کے اقتباسات پیش کرنے سے قاصر اور ایجاز و اختصار سے کام لینے پر مجبور ہیں ۔

تعلیم نسواں کے متعلق محترمہ خدیجہ شفیع صاحبہ نے قوم کی جن ضروریات کی ترجمانی کی وہ مختصراً یوں بیان کیجا سکتی ہیں:-

(۱)- اچھا نصاب تعلیم - (۲)- اچھی استانیاں (۳)- خانگی مدارس کی کثرت (۴)- جبری تعلیم - ان ضروریات کی اہمیت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں - صاحبۂ ممدوحہ نے اعداد و شمار کے ذریعہ سے بتایا کہ بلحاظ اوسط اس وقت ایک ہزار میں سے صرف بارہ مسلمان عورتیں تعلیمیافتہ ہیں اور ان میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو بجز اپنی مادری زبان میں لکھ پڑھ سکنے کے اور کچھ بھی نہیں جانتیں اسکے مقابلہ میں ہندو اور پارسی خواتین ہم سے بہت سبقت لے گئی ہیں ممدوحہ نے مشورہ دیا کہ مسلمان خواتین کی تعلیمی مجالس میں ہندو اور پارسی خواتین کو ضرور شرکت کی دعوت دینی چاہیئے اور انکے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے محترمہ خدیجہ شفیع صاحبہ نے ثانوی مدارس میں لڑکیوں کے ذریعۂ تعلیم پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ انگریزی کی بجائے اردو زبان ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیئے ، نواب حیدر نواز جنگ بہادر کے مشورہ سے اعلیحضرت نظام دکن نے عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیکر ہمیشہ کیلئے اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیا ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی کی کامیاب مثال سے ان تمام مشکلات کا سحر ٹوٹ چکا ہے جو اس راستے میں حائل سمجھی جاتی تھیں ۔

پردے کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے محترمہ موصوفہ نے فرمایا کہ رواجی پردہ نہ صرف مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں سدِ راہ ہو رہا ہے بلکہ اس حبس بیجا سے مسلمان خواتین کی صحت کو بھی غیر مسلم خواتین کے مقابلہ میں نمایاں نقصان پہنچ رہا ہے - رواجی پردہ کے مسئلہ میں مسلمانوں کی یہ انتہا پسند صیادنشی مسلمان لڑکیوں کو جبری تعلیم کے فیوض سے بھی محروم کر رہی ہے - یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ مسلمانوں کو اس کی طرف خاص توجہ مبذول کرنی چاہیئے ۔

آخر میں محترمہ خدیجہ شفیع صاحبہ نے دعا کی کہ ان پڑھ مسلمان بہنوں کو تعلیم کی طرف رغبت پیدا ہو اور تعلیمیافتہ بہنوں کو اپنی ان پڑھ بہنوں کی دستگیری کی توفیق عطا ہو ۔

شالامار باغ

آہ اے باغِ کہن اے یادگارِ انبساط!
آہ اے جلوہ گہِ ہنگامۂ عہدِ نشاط!

رشکِ صد گلزارِ جنت تھا کبھی تیرا چمن
تیری شوکت سے عیاں تھی شانِ ربِ ذوالمنن

کھیلتی تھیں تیرے پھولوں سے کبھی شہزادیاں
تیرے گلشن میں کبھی تھیں حُسن کی آبادیاں

آہ وہ دن تیری محفل میں تھی جب خوشبو کی دُھوم
تیرے گلزاروں میں جب تھا گلعذاروں کا ہجوم

کیا ہُوئے وہ دن کہ گہوارہ تھا آزادی کا تُو
وائے قسمت آج نظّارہ ہے بربادی کا تُو

یاد ہے تجھ کو کہ وہ شاہنشہِ عالی وقار
جس کے ہر اسلوب پر حُسنِ تناسب تھا نثار

پائداری کو محبت جس کی تعمیروں سے تھی
تقویت قوم و وطن کو جسکی تدبیروں سے تھی

حُسن کی کیفیتوں سے جس کا دل سرشار تھا
علم کا آئینہ جس کا دیدۂ بیدار تھا

آ نکلتا تھا اِدھر جب اپنے توسن پر سوار
پھول برساتی تھی اُس کی راہ میں فصلِ بہار

شاہ کے آتے ہی فواروں کا ہر سُو چھُوٹنا وہ ترنّم وہ طلسمِ خامشی کا ٹُوٹنا!

آہ وہ پھُولوں کے تختے آہ وہ چڑیوں کا شور چادرِ آب رواں میں آہ وہ پانی کا زور!

آہ وہ ذوقِ سخن وہ انجمن آرائیاں آہ وہ شوقِ حقائق وہ فلک پیمائیاں!

آہ وہ دِن جب کہ شاہِ ہند تھا شاہِ جہاں وقف تھا ہندو و مُسلم کیلئے ہندوستاں

آہ وہ جانبازیاں وہ اتحادِ باہمی آہ وہ ایثار جس کی آج ہے اِتنی کمی!

وہ سخاوت وہ صداقت وہ شجاعت کیا ہُوئی؟ وہ مرّوت وہ مودّت وہ محبّت کیا ہُوئی؟

اب کہاں وہ ہمّتیں ہیں اب کہاں وہ اُلفتیں؟ چھا رہی ہیں گُلشنِ ہندوستان پر ظُلمتیں

کر دے پھر یارب تُو اپنے نُور کا مسکن اِسے
پھر بنا دے پھُولتا پھلتا ہُوا گُلشن اِسے

د ۔ ن

صُبح و شامِ ہند

صُبح آئی اور زمینِ ہند کیلئے آفتاب کی زرّیں کرنوں کا سہرا لائی !

ابھی انسانی ہاتھوں نے عروسِ عالم کے پریشاں بالوں کو سُلجھایا نہ تھا جنگل کا نظارہ تھا دریا کا کنارہ تھا۔ کچھ حیوان کچھ حیوان نما انسان اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے +

دُنیا مہرِ عالمتاب کی روشنی سے درخشاں ہوئی تھی کہ اک چُست قامت بلند اندام قوم دُور سے بڑھتی ہُوئی نظر آئی، ان لوگوں نے خود رو پودوں کو کاٹ چھانٹ کر کھیتی باڑی کی جادو طرازی سے مُردہ اُفتادہ زمین کو اک نئی زندگی بخشی صنعت و حرفت بنیں سنوریں علم و فن ہنسے کھیلے فلسفہ و معرفت اپنی سنجیدگی و متانت کے ساتھ محوِ خرام ہُوئے + لیکن ساتھ ہی چھوٹے بڑے کی تمیز اور قویٔ ضعیف کی چیخ پکار سے فضائے وطن میں اک انتشار پیدا ہو گیا +

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ اک شہزادہ جو جنگل کی سمت جوگی بنکر گیا تھا پیامِ ربّانی لیکر انسانی بستیوں کی طرف لوٹا۔ اور للکارا کہ بھائیو! بھائی بھائی بنو۔ سچی خوشی سچی نیکی سے ملتی ہے تم جو کرو گے سو بھرو گے + اُسکی آواز اس قدر شیریں اور اُسکا پیام اس قدر راست تھا کہ شاہ و گدا سبھی نے اُسکے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا + اس وقت عروجِ ہند کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ خیر و راحت کی ہوائیں چلتی تھیں عدل و نیکی کی صدائیں آتی تھیں لیکن تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ اِدھر خود پرستوں نے پھر نفس پروری کا غبار اُڑایا اُدھر سُورج کا چہرہ متضاد قوتوں کے اثر سے ابرِ غلیظ کے پیچھے چھُپ گیا +

اس آڑے وقت میں قدرت نے فطرت کی یاوری کی، تاریک بادلوں سے فضل و کرم کی بوندیں پڑیں بادل چھٹ گئے گرد بیٹھ گئی اور اُفق پر اسلام کے علمبردار قطار در قطار نمودار ہُوئے + ستم رسیدوں کو پھر امن و امان کی نعمتیں ملیں، علم و فن کا بختِ ہمایوں پھر چمکا، اللہ اکبر کے بلند آہنگ نعروں نے کثرت پرستوں میں وحدت کا غلغلہ برپا کر دیا، اورنگِ سلطنت پر وہ جہانباں جلوہ آرا ہُوئے جنکے آئین و فرامین آجتک حسنِ مرمریں میں سونے چاندی کی طرح چمک رہے ہیں، جہاں ہری بھری کھیتیوں کی جگہ اُجڑے ہُوئے میدانوں میں خاک اُڑتی تھی وہاں اُنہوں نے فیضِ علوم کی نہریں بہائیں، حفظ و صیانت کی دیواریں کھینچیں سکون و اطمینان کی محلسرائیں بنائیں اور حُسن و محبت کے باغات آراستہ پیراستہ کئے + تر و تازہ پانی آبجُوؤں میں رواں ہُوا، فواروں سے اُچھلا، آبشاروں سے گرا اور سبزہ زاروں میں پھیل گیا! آفتاب نصف النہار پر تھا تو اُس میں تمازت بھی زیادہ تھی۔ سہ پہر کی کرنیں کم گرم اور ہوائیں نرم و سبک ہُوئیں انسانی فطرت اپنی اندھیری کوٹھڑی سے قدرت کے نظّارے کو کھلی ہوا میں نکلی اور مدت کے بعد پھر جسمانی و رُوحانی

آزادی سے دوچار ہوئی۔

لیکن زمانے کی گردش کسے چین سے بیٹھنے دیتی ہے؟ جب محنت کی جگہ عشرت نے لی تو تابش نے بھی ظلمت کا لباس پہنا اور شرم کے مارے رات کے دامن میں چھپ گئی، شام جو عظمتِ مغلیہ پر بڑی عنایت درجہ دردانگیز اور باغِ وطن کیلئے انتہائی ظلم وستم کی نامہ بردار تھی!! فرنفری کی چڑیلیں چاروں طرف سے اُمنڈ آئیں حرص و ہوا کے بھوت قدم قدم پر آدھمکے بادشاہوں کی جگہ بادشاہ گروں نے لی والی مطلق العنان بنے، جہاں ایک تختِ مرمریں تھا اب اسکے بجائے وہاں ہزاروں چوبی تخت نظر آنے لگے، ناشائستہ قوموں نے ملک کے کونے کونے میں اپنے اپنے زنگ خوردہ سکے رائج کئے۔ روشنی کی اک بھولی بھٹکی کرن بھی تو نہ تھی کہ کسی کو کھرے کھوٹے کی پہچان ہو سکتی۔ بس گھُپ اندھیرا تھا اور قیامت کا شوروغل!

اس کس مپرسی میں کچھ اجنبی آئے اور ان عالیشان محلات و باغات پر قابض ہو گئے۔ انہیں بنے بنائے محل ملے کیا کرایا انتظام ہاتھ آیا، جہاں جہاں انہوں نے تخت بچھا دیکھا وہ ڈٹ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑے سے لین دین کے بعد پردیسیوں نے کہا بابا ہم پردیسی ہیں تمہارا بھلا ہی چاہتے ہیں تم اپنے دیس کو ہمارے حوالے کردو۔ ہم نے اک دوسرے کی چغلیاں کھائیں اور انکی گود میں جا لیٹے۔ انہوں نے تھپک تھپک کر سُلایا۔ ہم تھکے ماندے تھے پہلے رویا کئے تھے اب سویا کئے۔

ہم بہت سوئے رہے ہوکر اُٹھنا چاہا تو بجائے تھپکیوں کے انہوں نے دھمکیاں دیں کہ سور ہو تمہارے لئے سوئے رہنا ہی مفید ہے، ہم نیند لے چکے تھے نیند میں اپنی گئی گذری عظمت کے خواب بھی دیکھ چکے تھے سو بے چین تھے کہ اب اُٹھیں اور اُٹھ کر گھر بھر کی خبر لیں، دیکھا تو یہاں یہ عالم تھا کہ دیس پردیسیوں کا دیس بن چکا تھا جو ہمارا جی پرچانے کو قسم قسم کے سوانگ بھرتے تھے کبھی بے گھوڑے کی گاڑیوں میں کبھی برق رواں اُڑان کھٹولوں میں وہ ہمیں چمن چمن کی سیر کراتے کبھی آسمانی بجلی کو قمقموں میں بند کرکے گل وگلزار کو منور کر دیتے کہ اک چکاچوند کی دُنیا ہماری نگاہوں میں بس جاتی اور ہمیں کچھ سجھائی نہ دیتا۔

اس روشن تاریکی اور تاریک روشنی سے ہمارا جی اُکتا گیا۔ ہم جھنجھلائے ہم چلائے کہ خدا کے بندو یا ہمیں تاریکی میں بند کردو یا روشنی میں آزاد۔ اُنہوں نے سر ہلایا اور وعدہ کیا اور تسلی دی اور واقعی اُفق سے روشنی کے آثار پدیدار ہوئے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور اُن کا شکریہ۔ ہم سمجھے ہمارا نصیبہ جاگا لیکن وائے قسمت کہ آن کی آن میں پھر وہی اندھیرے کی چادر آسمان پر پھیل گئی —— وہ جسے ہم صبح سمجھے تھے صبح کاذب نکلی! آہ پردیسی تو دشمن تھے ہی فلکِ ناہنجار بھی اُنکا یار نکلا اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ یہ ہمارے اپنے ہی جھگڑوں کا خمیازہ ہمارے اپنے ہی گناہوں کی سزا تھی!!

بالآخر اب ہم مضمحل ہو کر گر پڑے ہیں مایوس ہو کر سر بگریباں ہیں مجبور ہو کر سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہماری قسمت ہی الٹی ہے۔

بھائیو! اُٹھو اور آنکھیں کھولو، ہمت کی کمر باندھو پھر بھائی بھائی بنو، خدا کا نام لو بچھڑے ہوئے مل جاؤ روٹھے ہوئے من جاؤ۔ جو اپنی مدد آپ کرتا ہے خدا بھی ضرور اُس کی مدد کریگا!

اُسوۂ حسنہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

۳

اسیرانِ جنگ کے ساتھ حُسنِ سلوک کی جو مثال حضور سرورِ دوجہاں ؐ نے قائم کی دنیا کی حربی تاریخ آجتک اُسکی نظیر پیش نہیں کرسکی۔ قیدیوں کی گرفتاری کے بعد آنحضرتؐ سب سے پہلے اُنکے لباس کی فکر کیا کرتے تھے اور بسا اوقات اُنہیں فدیہ لئے بغیر رہا کردیتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ حنین کے بعد رسُول اللہ اور رسُول اللہ کے اُسوۂ طیبہ کی تقلید میں دوسرے مسلمانوں نے مجموعی طور پر چھ ہزار قیدی اسی طریقہ پر آزاد کردئے تھے۔ قیدیوں کی تواضع عزیز مہمانوں کی طرح کی جاتی تھی۔ اُنکے آرام و آسائش کے لئے اپنی راحت و آسودگی کو قربان کرنے میں دریغ نہ کیا جاتا تھا۔ غزوۂ بدر کے ایک قیدی نے رہائی کے بعد اپنی اسیری کی کیفیت اس طرح بیان کی: "مسلمانوں پر اللہ کی رحمت ہو۔ وہ اپنے اہل و عیال سے اچھا ہمکو کھلاتے تھے اور اپنے کنبے سے پہلے ہمارے آرام کی فکر کیا کرتے تھے"۔ لیکن انجمنِ جاہلیتِ جدیدہ کے ہسپانوی رُکن، نام نہاد تہذیب و تمدن کے اِس دَور میں آج بھی مغرب الاقصیٰ کے اسیر مجاہدینِ ریف کی گردنیں کاٹ دیتے ہیں اور بہیمیت کے جوش میں ان بیکسوں کی مظلومی سے مسرت اندوز ہونیکے لئے اُنکے سرہائے بریدہ کے پُشتے اور دیواریں بناتے اور اُنکی زبانیں اور کان کاٹ کر انوکِ سنگین میں پرو دیتے ہیں۔ اس بربریت کے مقابلہ میں جب ہم جنگ کے وہ شریفانہ اصول دیکھتے ہیں جو آنحضرتؐ نے قائم کئے تو بے اختیار زبان پر یہ الفاظِ ربانی جاری ہو جاتے ہیں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ

نجد کے رئیس ثمامہ بن اثالؓ نے اسلام لانے کے بعد یمامہ سے مکّہ کی طرف غلّہ کی برآمد بند کردی لیکن باوجود اسکے کہ اہلِ مکّہ فریقِ محارب کی حیثیت رکھتے تھے، آنحضرتؐ نے ثمامہؓ کو حکم دیا کہ غلّہ بھیجنا بدستور جاری رکھیں اسی ارشادِ نبوی کا ایک کرشمہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب اپنے عہدِ خلافت میں جنودِ مجاہدین کو بازنطینی طاقت کے خلاف روانہ کیا تو سرعسکرِ اسلام یزید بن ابوسفیان کو یہ نصیحت کردی کہ "کھجور کے درختوں کا تباہ کرنا اور اناج کے کھیتوں میں آگ لگانا تمھیں منع ہے کسی ثمردار درخت کو نہ کاٹنا نہ جانوروں کا نقصان کرنا سوائے اُنکے جن کو تم قوت لایموت کے لئے ذبح کرو"۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ آنحضرت نے اس حیرت انگیز صلح پرور جنگی زندگی کا آغاز اُسی صورت میں گوارا فرمایا، جب کوئی دوسرا چارۂ کار نہ رہا۔ اس حقیقت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ غزوۂ احد میں جب قریش کا پلّہ بھاری رہا اور مسلمانوں کی قوت بظاہر ذرا ہی کم ہوتی ہوئی پائی گئی تو کفار حجن کی ہمت بڑھ گئی تھی، ہر طرف سے یورش کرنے لگے۔ چنانچہ متعدد قبائل نے مبلّغینِ اسلام کی مختلف جماعتوں کو فریب سے قتل کر ڈالا اور یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ یہود کی عداوت عملاً غزوۂ احد کے بعد ہی سے شروع ہوئی۔ بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے واقعات کو معترضین نے شانِ پیمبری کے خلاف قرار دیا ہے۔ قطعِ نظر اس سے کہ ان قبائل نے حکومتِ وقت کے خلاف سازش کی تھی بلکہ بنی قریظہ نے ایامِ محاصرہ میں اقدامِ بغاوت کر کے اپنے جرم کو سنگین تر بنا دیا تھا اور پھر اپنے ہی تجویز کئے ہوئے حَکَم حضرت سعد ابن معاذ سے اپنی قسمت کا فیصلہ کرایا تھا، اس رمز کو فراموش کرنا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نتائج وعواقب کو ملحوظ رکھکر اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرتے تھے۔ اگر اس فتنہ کو اُسی وقت دبا نہ دیا جاتا اور اس غفلت کے باعث بعد میں بے شمار بندگانِ خدا کا خون بہتا تو اِس خونریزی کا ذمّہ دار کون ہوتا؟ مشہور انگریز ادیب اور معلّمِ اخلاق جان رسکن کے بقول "فتنہ وفساد ایک ابدی قانونِ مرگ ہے" جس پر چند نفوس کا قتل بہرکیف مرجح اور افضل ہے۔ بنی قریظہ سے جو بجا اور حق بجانب سلوک کیا گیا، وہ نہایت واضح طور پر الفتنۃ اشد من القتل کے اسلامی اصول کو نمایاں کرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر صرف ایک ناعاقبت اندیشانہ قدم ایک پوری قوم کو تباہی و بربادی کے قعرِ عمیق میں گرا سکتا ہے اور جذبۂ عفو و ایثار کے اظہار کی خاطر امن و آسائش کی حکومت کو اس طرح غارت کر دینے کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اس خیال سے خودکشی کر لے کہ دنیا میں کھانے والوں کی، بقدر ایک کے، کمی ہو جائے اور بھوکوں کا پیٹ بھرے لیکن اسلام اس قسم کی تباہ کُن اخلاقی عیاشیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور زندہ رہ کر دُنیا کو موردِ برکات وحسنات بنانا اُس کا مطمحِ نظر ہے۔ اگر اس موقع پر آنحضرت بنو قینقاع و قریظہ کی غدّاری کو اپنے دامانِ کرم میں چھپا لیتے تو مسلمانوں کے فلسفۂ سیاست میں ایک ایسی مثال قائم ہو جاتی جس کی تقلید اُن پر فرض تھی۔ لیکن حضور شارعِ اسلام علیہ احسن التحیات جو اپنی اُمت کے استخلاف فی الارض کو دیکھ رہے تھے، ایک ایسے غلط سیاسی و اخلاقی اصول کا نفاذ نہ فرما سکتے تھے جس سے تاسیسِ حکومتِ الٰہی کا تصور بھی خارج از امکان ہو جاتا ہے۔ بُدھ مت اور مسیحیت کو اپنے برخود غلط "عدمِ تشدد" پر ناز ہے

لیکن اگر اس دلفریب اصول پر عمل کیا جاتا تو جاپان آج جاپان نہ ہوتا نہ یورپ کی سراپا تشدد سلطنتوں کے باشندے ہمیں "عدم تشدد" کا درس دینے کے لئے آج موجود ہوتے۔ ان لوگوں سے اسلام صرف ایک سوال کرتا ہے "لم تقولون مالا تفعلون؟"

یہ عجیب تماشا ہے کہ اہلِ یوروپ حکومت و سلطنت جیسے اہم شعبۂ حیات کو مذہب کے اقتدار سے بے نیاز کر دینے پر تلے ہوئے ہیں اور اسی منطق کے مطابق مدینۂ منورہ میں حکومتِ اسلامیہ کے قیام کو آنحضرت ؐ کے دُنیوی مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اسلام بلکہ دُنیا کے تمام مذاہب کا میدانِ عمل آخر یہی عالمِ اخلاق و افعال ہے اور دین و دُنیا کوئی دو جدا حقیقتیں نہیں۔ افراد کا متحد نظام تمدن اُنکی حکومت ہے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ من حیث فرد ایک خاص ضابطۂ حیات کے پابند ہونیکے بعد من حیثِ قوم کسی دوسرے آئین کے تابع ہوں۔ پس اگر کوئی مذہب سچا اور کامل ہے تو اُسے لازماً انسان کی انفرادی رہنمائی کے ساتھ اُسکی اجتماعی ضروریات کا بھی کفیل ہونا چاہیئے اور اگر حیاتِ انسانی کی انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں میں کسی قسم کا تضاد پیدا ہو جائے تو محال ہے کہ مذہب زیادہ عرصہ تک اپنے خلوص و صداقت کو برقرار رکھ سکے۔ اِسلامی حکومت اہلِ ایمان کے اعمال کی ہیئتِ اجتماعی کا پرتو ہے اور اسکے بغیر مذہب کا قیام و استحکام ممکن نہیں۔ علامۂ شبلی مرحوم نے بالکل ٹھیک کہا ہے:-

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کبتک؟ — چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھیگا دُھواں کبتک؟

حکومت کی قوت مذہب کے خلوص و صداقت کو برقرار رکھنے کے لئے کس حد تک ضروری ہے، اس کا قیاس ڈاکٹر ڈریپر کے بیان سے ہوگا جو لکھتے ہیں:- "اشاعتِ اِسلام اور اشاعتِ مسیحیت میں ایک بہت بڑا اہم فرق ہے۔ مسیحیت کو کبھی اتنی طاقت حاصل نہ ہوئی کہ دولتِ روما کی بُت پرستی کا قلع و قمع کر سکتی۔ جس قدر اُس کو ترقی ہُوئی، اُسی قدر بُت پرستی کا عنصر اس میں زیادہ ملتا گیا۔ ایک مذہب کی قدیم شکلیں زندہ ہو کر دوسرے مذہب میں آملیں اور نتیجہ یہ ہُوا کہ مسیحیت بُت پرستی کے ساتھ مخلوط ہوگئی لیکن عرب میں (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قدیم بت پرستی کو ایسا مٹایا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رکھا۔ جن عقائد کی آپ ؐ نے اور آپ ؐ کے بعد آپکے جانشینوں نے تلقین کی اُن میں بُت پرستی کا ڈھونڈے سے بھی سراغ نہیں ملتا"۔ اسلام کی اسی شانِ جہانبانی کے تصدق میں آج کروڑوں فرزندانِ توحید کی گردنیں ایک خدا کے سوا اور کسی ذات کے سامنے نہیں جُھکتیں دوسری طرف کروڑوں ایسے

بدنصیب بھی ہیں جو اپنی سجود پرور پیشانیوں کو خاکِ تثلیث پر ڈالے ہوئے نجاستِ شرک و کفر سے آلودہ کر رہے ہیں!
مسلمان اپنے ہادیؐ کے اس اسوۂ حسنہ کی طرف سے خالی الذہن نہیں ہو سکتے کہ اُس نے دین کے استحکام کے لئے
حکومت کا قیام ضروری خیال کیا تھا اور وہ از رُوئے سُنّتِ نبوی یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ خلافتِ اسلامیہ کے دینی
مفہوم سے اُس کی دُنیوی حیثیت ناقابلِ انفکاک ہے۔

اس حکومتِ الٰہی کے قیام کا منشا و مقتضا کیا تھا؟ نجران کے عیسائیوں کے فائدہ کے لئے جو فرمان
بارگاہِ نبوّت سے صادر ہُوا تھا، اُس میں بہت بڑی حد تک ہمیں اس سوال کا شافی جواب مل جاتا ہے۔ اسلام
کا دامانِ رحمت مُسلم اور غیر مُسلم دونوں کی حفاظت کیلئے جائز حد تک پھیلا ہُوا ہے۔ وہ دنیا کے خوف کو امن سے
بدلنے کے لئے آیا ہے۔ اُسکی جنگ صلح کا پیغام اور اُسکی تلوار امن کا پرچم ہے۔ وہ دُنیا کے ہنگامۂ فساد کو مٹا
کر حکمِ خدا کے اعلان و نفاذ پر مامور ہُوا ہے، اور اشارۂ ایزدی کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ۔
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر[1] اسکے فرائضِ اولیٰ میں داخل ہیں۔ ان مقاصدِ مہمہ کی تکمیل اور پھر ایسی سرزمین میں جو
صدیوں تک جاہلیت کا صنم کدہ بنی رہی تھی اُسی خلقِ عظیم کی مقتضی تھی، جس کا ظہور عرب کے گلیم پوش شہنشاہ سے
ہُوا حضورؐ کی ذاتِ اقدس اس قدر متنوّع، اس قدر متفرق بلکہ بہ حالاتِ ظاہری متخالف فضائلِ اخلاق کی جامع
ہے کہ عقل اس وصل دہندۂ دین و دُنیا کی داستانِ حیات پر نظر ڈال کر ششدر رہ جاتی ہے اور معاً یہ خیال ہونے
لگتا ہے کہ المانی فلسفی ہیگل کا نظریۂ اتحادِ اضداد (جو زیادہ صحیح معنی میں "نظریۂ متممات" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے)
عالمِ رُوحانیات کی ماورائے حکمت کارگاہ کے اندر بھی جاری و ساری ہے۔ بعض خصائلِ حمیدہ کی نوعیت
اس طرح کی واقع ہُوئی ہے کہ عوام اُنکے بادی النظری تناقض کی بناپر اُن کو ناقابلِ اجتماع تصوّر کرتے ہیں۔ لیکن
درحقیقت یہ مختلف اور متعدد قوائے اخلاقی باہم تکملہ و تتمہ کا رابطہ رکھتے ہیں۔ حضرت ابوسعید الخدری رحمۃ اللہ
علیہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔ کیسا دل نشین منظر ہوتا ہوگا کہ جب کوئی
خطاکار سامنے آکر معافی کا طالب ہوتا تو خود معاف کرنے والے کی گردن شرم سے جُھک جاتی اور روئے انور
پر فرطِ حیا سے سرخی دوڑ جاتی۔ ایسی عفیف اور بے لوث، ایسی پُر سکون اور خاموش طبیعت کے انسان کا رہنما
عام کی حیثیت سے عرصۂ عمل میں نکلنا، اور اس ہمت فرسا زندگی کی تمام مقتضیات کو علیٰ وجہ الکمال پورا کرنا
اعجاز سے کم نہیں۔ انتہائی شرم و حیا اور خاکساری و فروتنی کو کسی عام رہنما کے لوازمِ حیات، مثلاً خطابت وغیرہ

[1] الذین ان مکّنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور
سورۃ الحج

سے بہت کم لگاؤ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس زندگی کے لئے جرأت و جسارت اور تحکم و بے باکی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ نے ان دو بظاہر متضاد حیثیتوں کو وصل دیدیا اور تیرہ سو برس ہوئے زمانہ نے دیکھا کہ ایک ہی انسانؐ دُنیا کا سب سے بڑا ہادی اور حیائے کامل کا مظہرِ اتم بھی تھا۔ وہی ایک انسانؐ جس کا حلم و تحمل اپنے خادم کو اُسکی پُوری مُدتِ ملازمت میں ایک دفعہ بھی یہ کہنے کا روادار نہ ہُوا تھا کہ "تو نے یہ کام کیوں کیا اور وہ کیوں نہیں کیا؟"[1] جس کا حسنِ خلق معاملاتِ ارشاد و ہدایت میں بھی اس قدر ذکی الحس تھا کہ کسی شخص کی نامطبوع حرکت پر اُس کا نام لئے بغیر فقط اتنا کہدیتا تھا کہ "وہ کیسے لوگ ہیں جو یہ کرتے ہیں"[2]۔ "جو اپنی مروت کے ہاتھوں خود عقوبت میں میں گرفتار ہونا گوارا کرتا تھا لیکن دوسروں سے یہ کہنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا کہ تمہارے اس کام سے مجھے تکلیف ہوتی ہے[3]، اُسی ایک انسانؐ کے سامنے جب بڑے بڑے معزز عمائدِ قریش کی یہ درخواست آئی۔ کہ قریشی مجرمہ فاطمہ بنت الاسود کا گناہِ سرقہ، اُس کی عزتِ نسب کا لحاظ کر کے معاف کر دیا جائے، تو وہ از فرق تا بہ قدم جلال و جبروتِ الٰہی کی تصویر بن گیا، اور اُسؐ نے نہایت جوش سے کہا کہ "بخدا اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی یہ کام کرتی تو میں ضرور حد جاری کرتا"۔ خلقِ نبوی کے اِسی آسمانی اعتدال کے صدقہ میں وہی ایک شمشیر جو صاعقۂ عدل بن کر عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث اور بنو قریظہ کی گردنوں پر چمکی تھی، آیۂ رحمت بن کر ہبار بن الاسود اور وحشی اور کوہِ تنعیم کی حملہ آور جمعیت کے سروں پر سایہ افگن ہوگئی[4]۔

انکسار اور تواضع کی یہ کیفیت تھی اور تکبر و خود پسندی سے اس درجہ احتراز تھا کہ مدینہ کی ایک مجذوب سی عورت نے[5] اپنے کسی کام کیلئے حضورؐ کو رستہ چلتے روک لیا تو شہنشاہِ عرب دیر تک سرِ رہ گزار بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا[5]، چھوٹے بچے شوق سے سرورِ کون و مکانؐ کے پاس آتے تھے حضورؐ انکو گود میں بٹھاتے اور اُنکے ساتھ کھیلتے تھے[5]۔ اُنکے معصوم دلوں میں کبھی یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ جس شخصؐ کے ساتھ ہم طفلانہ شوخیاں کرتے ہیں، وہ دنیا کا سب سے بڑا انسانؐ ہے۔ آپؐ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو بنی عبدالمطلب کے بچے آپکے استقبال کیلئے خوش خوش بھاگتے ہوئے آئے اور آپؐ نے نہایت شفقت سے اُن میں سے ایک کو اُٹھا کر اپنے آگے اور ایک کو اپنے پیچھے سوار کر لیا[6]۔ ان حقائق پر اگر غور کیا جائے تو دُنیا کے عام واقعات و مشاہدات کے رُو سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جس

---

[1] مشکوٰۃ ص۴۴۱ (روایت حضرت انسؓ)   [2] شفا ص۵۲ (روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ)

[3] یہی حقیقت اس آیۂ کریمہ کی شانِ نزول ہے۔ ان ذلکم کان یوذی النبی فیستحی منکم واللہ لا یستحی من الحق۔ سورۃ الاحزاب

[4] ذکر اسلام عدی بن حاتم در سیرت ابنِ ہشام۔ [5] بخاری ص۸۸۸، ص۹۴۰، ص۹۴۴ وغیرہ [6] بخاری ص۲۴۲۔

مقدس انسان ؐ نے جذبۂ علم و محبت کو اس حد تک فروغ دیا تھا، اُس نے اپنا رُعب اور دبدبہ بھی کھو دیا ہوگا لیکن یہاں بھی وہ وجودِ قدسی بیک وقت مقابل کی تکمیلی فضیلت سے بوجہ احسن بہرہ مند تھا اور اُسکے خلقِ انکسار کے اتمام کیلئے اُسکا وقار موجود تھا۔ چنانچہ فتحِ مکّہ کے دن جب ایک شخص نے حضورِ رسالت میں آکر کچھ عرض کرنا چاہا تو جلالِ نبوی نے اُسکے جسم پر لرزہ طاری کر دیا۔ آپؐ نے اُسکو اس طرح تشفی دی: "گھبراؤ مت، میں کوئی بادشاہ نہیں، ایک غریب قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی[1]"

کہتے ہیں کہ شاعر کے دل میں سارے جہان کا درد ہوتا ہے لیکن جو غم اس عالمِ ہست و بود کے دھندلے نظاروں سے پیدا ہو، اُسے اُس اندوہِ اکبر سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی جو عالمِ باقی کے جلوۂ سرشار کا آفریدہ ہو۔ ہر وقت کی شگفتہ رُوئی، ہر وقت کا تبسّم ایسے شخص کا طبعی خاصہ نہیں ہو سکتا جسے بچپن ہی سے غور و فکر کی عادت ہو، اور ایک زبردست حکمراں، مدبّر، اور سب سے بڑھ کر ایک پیغمبر کے اہم فرائض جس کے ذمہ ہوں۔ غور و فکر کی یہی عادت شعرا میں نالہ و فغاں کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اکثر حکماء کے لئے اُنکی "فلسفیانہ ترشروئی" یا کم از کم ایک مستقل اور دائمی محزونی و افسردہ خاطری کی علّت بن جاتی ہے جس کے تاریک بادل اُنکی پیشانی پر ہمیشہ چھائے رہتے ہیں۔ حضور خواجۂ ہر دوسرا اگرچہ غم و اضطراب کے دو جہان اپنے قلبِ پاک میں چھپائے ہوئے تھے، چنانچہ صحیحین میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: "لوگو! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا" لیکن غمِ دوجہان کا یہ بارِ عظیم بھی حضور کو اس حقیقت سے بے خبر نہ رکھ سکتا تھا کہ آپؐ کے صحابہؓ اور ملنے والے آپ ہی کے نورِ تبسّم میں جیتے تھے۔ اسی لئے آپ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے اور ہر شخص سے بہ خندہ جبینی پیش آتے تھے حضرت جریر ابن عبداللہ کا بیان ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد میں بارہا حاضرِ خدمت ہوا مگر یہ اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ حضورؐ نے مجھے دیکھا ہو اور تبسّم کے انوار چہرۂ مبارک پر ہویدا نہ ہوئے ہوں۔ حضرت عبداللہ ابن حارث کا قول ہے کہ میں نے کسی شخص کو جنابِ رسالت مآبؐ سے زیادہ خوش خلق اور خوش مزاج نہیں دیکھا، اور شفاءِ عیاض میں ہے کہ دشمن ہو یا کافر، آپ ہر ایک سے بہ کشادہ پیشانی ملتے تھے۔ یہی وہ سحر تھا جس سے آپکے مخالف بھی رام ہو جاتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کفّار جب آنحضرت کو ساحر اور جادوگر کہتے تھے تو حقیقت کے بہت قریب پہنچ جاتے تھے۔

---

[1] شفا ص۵۹۔ [2] شمائلِ ترمذی ص۱۷

جس شخص کی تکریم و تعظیم اس حد تک کی جاتی ہو کہ اُس کا تھوک تک ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہو، اُسکا وضو کیا ہُوا پانی بھی زمین پر نہ گرنے پاتا ہو، اُسکی آواز کے بلند ہوتے ہی تمام دوسری آوازیں خاموش ہو جاتی ہوں، اُسکے اشارۂ ابرو پر بڑے بڑے شریف و نجیب اور غیور و عالی مرتبت عقیدتمند نوکروں کی طرح دوڑتے ہوئے آتے ہوں، ایسے شخص کے دل میں اگر اپنے وقارِ منصبی کا خیال پیدا ہو جائے تو کچھ عجب نہیں، مگر یہاں کیا کیفیت تھی؟ زید بن سعنہ جو اسلام لانے سے پہلے یہودی تھے، اُن سے آنحضرتؐ نے کچھ قرض لیا تھا اور اگرچہ ادائے قرض کی میعاد میں ابھی کچھ دن باقی تھے، اُنہوں نے تقاضا کرتے وقت آنحضرت سے سخت درشتی اور بدزبانی کا سلوک کیا، آنحضرت خاموشی سے سُنتے جاتے تھے اور مسکراتے تھے۔ حضرت عمرؓ برافروختہ ہُوئے تو آنحضرت نے اُنھیں روکا اور کہا: "عمر! مجھکو تم سے یہ اُمید نہ تھی، تہمیں چاہیئے تھا کہ اُسے حسنِ تقاضا اور مجھے حسنِ ادا کی تاکید کرتے"[1] یہی وہ اسباب تھے جو قیامِ حکومتِ اسلام کا باعث ہُوئے کیونکہ اس نصفت پژوہی کی خاطر یہودی اپنے سردار کعب بن الاشرف کو چھوڑ کر سرورِ دوجہاں محمد مصطفےٰ کی عدالت میں آتے تھے جہاں اس ارشادِ الٰہی کی تعمیل کی جاتی تھی۔

وان حکمت فاحکم بینہم بالقسط ط ان اللہ یحب المقسطین ٥

اور اگر تو ان (غیر مسلم لوگوں) میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر، بیشک اللہ انصاف کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

جن فضائلِ اخلاقی کو کمتر درجہ کے انسان خود اپنے نقصِ فطرت کی بنا پر متناقض اور ناقابلِ اجتماع خیال کرتے آئے تھے، محمد رسول اللہ نے اُنکے مزاج و ترکیب کو اعتدال پر لاکر ثابت کر دیا کہ وہ دراصل خُلقِ انسانیت کی تکمیل و اتمام کرتے ہیں اور اس طرح تاریخ کائنات میں شاید پہلی اور آخری دفعہ، ایک کاملِ انسانؐ کا ظہور ہُوا۔ ولیم میور کو اعتراف ہے کہ عیسائیت پانچسو برس کی تعلیم و تلقین کے بعد بھی عرب کی وارستگی پر غالب نہ آسکی۔ یہودیت اپنی مسلسل کوششوں کے باوجود اس آزاد خطّہ میں ناکام رہی۔ لیکن اب حالت ہی کچھ اور تھی۔ رحمتِ الٰہی نے بالآخر ان آوارہ سرشتر بانوں کو آگھیرا تھا۔ بھلا بجلی کے خزانے کو چھُو لینے کے بعد بھی کسی شخص کا سکون و جمود قائم رہ سکتا ہے؟ یہ فرزندانِ صحرا، اوّلیں مرتبہ ایک انسانِ کاملؐ کے رُو بہ رُو تھے، اور اُس کی رُوحانیت کے پیہم برق وش جلوے پورے عرب کی ہستی کو لرزا رہے تھے۔

انتقام کی رسم جاہلیت قدیمہ کا مایۂ نازشعارِ قومی تھی۔ آنحضرت کی تعلیمات کے تصدّق میں عفو و

---

[1] بخاری صفحہ ۳۷۰، صفحہ ۳۷۹ [2] "سیرت" شبلی۔

رحم کے ساتھ انسانیت کا ازلی پیمان اَز سرِنو استوار ہُوا اور جاہلیت کے تمام دستور پیغمبرؐ کے قدموں کے نیچے پامال ہو گئے۔ اِس مبارک دَور کا آغاز آپ نے اپنے خاندان سے کیا اور سب سے پہلے ابن ربیعہ بن الحارث کا خون معاف کیا۔ اِسی طرح وہ تمام مجرمین بھی معاف کر دیئے گئے جو تیرہ برس تک بلکہ اسکے بعد بھی رسُول اللہ اور اُنکی اُمت پر ہر قسم کے ستم توڑ کر اپنے دل کے حوصلے نکالتے رہے تھے۔ دشمنوں سے خونریز انتقام لینے کا اصول جاہلیتِ قدیمہ و جدیدہ دونوں کے شعارِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، البتہ دورِ قدیم کے اہلِ جاہلیت کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے، وہی کرتے تھے، لیکن ارباب جاہلیتِ جدیدہ اپنا اصولِ حیات تو یہ بیان کرتے ہیں کہ نکوکار انسان کے دونوں گال طمانچوں کے لئے بنائے گئے ہیں مگر عملاً اپنے جذبۂ انتقام کی شانِ بہیمیت میں عربِ قدیم کی ضلالت و جہالت کی "ارتقائی" پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ سرزمینِ فرنگ کے یہ "جدید قبائل" گزشتہ جنگِ عظیم سے پہلے ایک معمولی سے قتل پر بھڑک اُٹھے تھے اور اس طرح تاریخ روزگار کا وہ سب سے بڑا محاربہ برپا ہُوا تھا جسکے سامنے ہنگامۂ بکر و تغلب کے افسانے گرد ہو کر رہ گئے۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ نسلی و وطنی تعصب کے لات و ہبل کے سامنے، حرص و آز اور نخوت و نفسانیت کے پجاری یورپ میں آج بھی سربسجود ہیں، بلاشبہ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے۔ کہ انسان ایک خاص گھرانے، ایک خاص مُلک، ایک خاص قوم کا رکن ہونے کی حیثیت سے ایک مخصوص حلقہ کا پابند ہے لیکن اُسکا یہ محدود حلقۂ علائق و روابط خود ایک وسیع تر دائرۂ کائنات میں شامل ہے اور ایک ادنےٰ وحدت پر اعلےٰ اور وسیع تر وحدت کو قربان کر دینا صریح غلطی ہے۔ شعوب و قبائل کی تقسیم محض انسان کی انفرادی حیثیت کی تعیین اور شناخت کیلئے ہے تاکہ دنیا کے کاروبار تنظیم و ترتیب سے چلتے رہیں، نہ یہ کہ اس فرق کو بنائے مخاصمت قرار دیکر انسان اپنے ہی بنی نوع کی گردنیں کاٹنے لگے۔ دنیا کے سب سے بڑے بُت شکنؐ نے کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے ساتھ، عصبیّتِ نسل و وطن کے بُت کو توڑ کر اسکی پرستش بھی ہمیشہ کیلئے حرام کر دی، اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اعلان کر دیا[۱] کہ لیس للعربی فضل علی العجمی و لا للعجمی فضل علی العربی، کلکم ابناء ادم و ادم من التراب اس ارشادِ اقدس کی تقلید میں حضرت علی مرتضیٰ فرماتے ہیں کہ ذمّی کا خون مسلمان کے خون کے مانند ہے مگر بخلاف اسکے جاہلیتِ جدیدہ کی سب سے بڑی سلطنت کا ایک جلیل القدر رکن کہتا ہے کہ اسکی قوم کے کسی فرد کے خون کا ایک قطرہ تمام سلطنتِ

---

[۱] "سیرت" شبلی۔

ایران کے خون کے برابر ہے۔ اللہ اکبر! اسلام اور کفر میں کیسا عظیم فرق و تفاوت ہے!

آنحضرتؐ نے مکہ کے بین القبائلی عقدِ مواخات میں نسلی تفریقات کی کشمکش غرور کو مٹا دیا اور مدینہ کے مشہور تر عقدِ مواخات میں ملکی و وطنی اختلافات محو کر دیئے۔ چنانچہ زمانہ دیکھ چکا ہے کہ بارگاہِ رسالت میں ابوبکر اور عمر اور علی کے پہلو بہ پہلو صہیب اور سلمان اور بلال بھی موجود تھے، رحمۃ اللہ علیہم اجمعین حضرت سلمان پارسی نژاد تھے مگر قبولِ اسلام کے بعد اُن سے کسی نے اُنکا حسب نسب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: "سلمان ابن اسلام ابن اسلام"۔ مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ فتحِ مکہ کے بعد بنی مخزوم کی ایک عورت فاطمہ بنت الاسود نے چوری کی۔ قریش نے جو چاہتے تھے کہ معاملہ دب جائے، حضرت اُسامہ بن زید یعنی اُسی غلام کے بیٹے کو اپنا وکیل بنا کر آنحضرت کے پاس بھیجا جسے کچھ ہی عرصہ قبل اُنکا غرورِ نسل خاطر میں بھی نہ لاتا۔ حضورؐ نے غضب آلود ہو کر فرمایا: "بنی اسرائیل اسی لئے تباہ ہوئے کہ وہ غرباء پر حد جاری کرتے اور امراء سے درگزر کرتے تھے"[۱] اسی تعلیمِ پاک کے اتباع میں حضرتِ عمر فاروقؓ نے ثابت کر دیا کہ اسلام کے دربار میں ایک عام مسلمان اور جبلہ بن الایہم غسانی جیسے ذی شوکت رئیس برابر ہیں۔ سلطنتِ روما میں امراء اور عوام کی باہمی کشمکش دو صدیوں سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی تھی۔ چنانچہ رومیوں کو ان خانہ جنگیوں کی بدولت چوتھی صدی قبلِ مسیح کے نصفِ آخر تک اتنی فرصت بھی نہ ملی کہ بیرونی معاملات کی طرف متوجہ ہو سکتے۔ حضور ختم المرسلینؐ نے اپنی مثالِ حسنہ سے سیاستِ اسلام کی بنیاد ایسی مؤسس و مستحکم کر دی تھی کہ اس قسم کے خطرات سے اُسے آجتک سابقہ نہیں پڑا۔ دُنیا کو معلوم ہو چکا تھا کہ جن غلاموں کو وہ ذلیل و حقیر سمجھتی رہی تھی، اُنہیں میں زیدؓ اور اُسامہؓ اور بلالؓ بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ انہیں تعلیماتِ مقدسہ کے صدقہ میں آج صرف اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اُس کے غلام مختلف زمانوں میں مشرق سے لیکر مغرب تک تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوتے رہے، چنانچہ خود ہندوستان میں اسلامی حکمرانوں کا ایک سلسلہ جو خاندانِ غلامان کے نام سے مشہور ہے آنحضرت کے قائم کردہ اصولِ مساوات کی نہایت روشن نشانی ہے۔ آنحضرت نے اُن لوگوں کو جو ایکدوسرے کے دُشمن تھے آپس میں بھائی بھائی بنا دیا اور جو دوست تھے اُنکی مودت کو پہلے سے زیادہ مضبوط اور پایدار کر دیا۔ اسلام سے پہلے دو آدمیوں کے لئے وجہ اتحاد یہ تھی کہ ایک قوم کا خون دونوں کی رگوں میں دوڑتا ہے، ایک ہی خاک نے دونوں کا خمیر ہستی اُٹھایا ہے، لیکن آنحضرتؐ نے اپنے مقدس نمونے اور پاک تعلیم سے حبل المتین

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب الحدود،

ایزدی کے اعتصام کو ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان واسطہ بنایا:-

فاصبحتم بنعمته اخوانا وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها

خدائے بزرگ و برتر کے احسانِ عظیم سے تم لوگ بھائی بھائی بن گئے حالانکہ تم ایک تعرِ آتشیں کے کنارے پر تھے جس میں گرنے سے اُس نے تمہیں روک لیا،

ہنری جیمز کے ایک سبق آموز قصہ میں ایک ایسے شخص کی کیفیت بیان کیگئی ہے، جو معاشرتی وجود تو رکھتا ہے مگر کوئی خانگی وجود نہیں رکھتا، یعنی عام صحبتوں میں اُس سے زیادہ خوش آئند اخلاق اور دلپسندیدہ اطوار کا آدمی اور کوئی نہیں ملتا، لیکن اس کے پیچھے پیچھے اگر اُسکے گھر کے اندر چلے جاؤ تو وہ غائب ہوجاتا ہے اور بجز کپڑوں کے ایک جوڑے کے اور کچھ نہیں رہتا۔ تلبیس و نمود کی جس حقیقت کی طرف اس قصہ میں استعارۃً اشارہ کیا گیا ہے، اُس کی جھلک ہم اپنے گردوپیش کے بہت سے مشہور اور بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی میں دیکھتے ہیں اور سچ پوچھو تو کسی انسان کے لئے خانگی و غیر خانگی زندگی میں مطابقت پیدا کرنا نہایت عظیم روحانی قوتوں کی مساعدت کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر ہم کبھی اپنے ہی ظاہر و باطن کا جائزہ لیں تو اپنی عبرت و بصیرت کے لئے عجیب و غریب تناقضات کے کرشمے دیکھ سکتے ہیں، لیکن حضور خیرالانام صلی اللہ علیہ وسلم جیسے سرشارِ حق کی زندگی میں اس دورخی کی گنجائش کہاں رہ سکتی تھی؟ آپ کا ظاہر باطن اور باطن ظاہر تھا۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو یہ چاہیں کہ ہمارے مخلی بالطبع اوقات کی جزئی اور تفصیلی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جائے؟ مگر تمام عالم کے لئے اکمل و احسن نمونۂ زندگی قائم کرنے والے انسانؐ نے اپنی ازواجِ مطہرات کو حکم دیدیا تھا کہ اُس کے حالاتِ حیات کو خواہ وہ اندرونی معاشرت و خانہ داری ہی سے متعلق ہوں، دُنیا تک پہنچادیں کیونکہ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ اُسکی ایک ایک حرکت، اُسکی ایک ایک جنبش، ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں انسانی اعمال و افعال میں منعکس ہوگی اور شجرِ ایمان کی یہ سبز شاخیں پھولتی پھلتی ہوئی خود ابد پر اپنا سایہ ڈال دیں گی۔ ہم شاید اپنی کمزوریاں دُنیا کی نظر سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ عبادتِ نافلہ چھپ کر ادا کرتا تھا کہ مبادا لوگ تقلید کریں اور اُمتِ مرحوم کو اس قدر عبادت شاق ہو۔ تمام ازواجِ مطہرات میں آنحضرت کو اگرعائشہ صدیقہؓ سے باجود حضرت صفیہؓ اور حضرت زینبؓ کے حسنِ صورت کی افضلیت کے زیادہ تعلقِ خاطر تھا تو اس کی

بھی یہی علّت تھی کہ فقیہانہ اجتہاد اور ذہانت کے اعتبار سے جناب صدیقہ سب میں افضل تھیں اور حضوؐر کی حیاتِ طیّبہ کے نکات و معارف کو سب سے بہتر سمجھتی اور سمجھا سکتی تھیں۔ چنانچہ اپنی اسی قابلیت کی بدولت "خذ نصف الدین من الحمیرا" کے فرمودۂ نبوی کی مستحق ٹھیریں اور اسی وجہ سے حضرت عمرؓ جیسے پُرجلال خلیفہ نے مسائل میراث کے بارے میں بارہا اُن سے استناد و استشارہ کیا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ہمارے گھر میں ایک ایک مہینہ تک آگ نہیں جلتی تھی اور رسولؐ اور رسولؐ کا کنبہ کھجور اور پانی پر گزران کرتے تھے۔ یورپ والے کہتے ہیں کہ آنحضرت کی مساعیٔ حقّہ (معاذ اللہ) ہوسِ ثروت و سلطنت کیلئے تھیں لیکن اگر آپؐ کو ایسا ہی شاہنشاہ بننے کی آرزو تھی جو بے چھنے جَو کی روٹی کھائے، جو اپنے ہاتھ سے اپنی جوتیاں سیئے، جس کے کپڑوں کو تہ برتہ پیوند لگے رہیں، جس کے اہل و عیال خود چکی پیسیں اور پیہم کئی کئی راتیں کھانا میسّر نہ ہونے کے باعث بھوکے سو جائیں، تو معترضین کا الزام یقیناً بجا اور درست ہے۔ جس شب شہنشاہِ کونینؐ کا وصال ہوا، حضرت عائشہؓ نے پڑوس کے گھر سے چراغ کیلئے تیل منگوایا تھا اور حضوؐر کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن تھی، خدا کی شان یاد آجاتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کامل انسانؐ جس کا تقدّس فرشتوں کو شرماتا تھا، بایں ہمہ طہارت و تورّع، اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے محاسن آداب اور مکارمِ اخلاق کی دعا کرتا رہتا تھا۔ درحقیقت آپؐ کو دنیا کے حکمرانوں اور تاجداروں کے لئے بھی ایک اُسوۂ حسنہ قائم کرنا تھا۔ جس کی پیروی کی توفیق اگرچہ اکثر مسلمان سلاطین کو نہ ہوئی تاہم صرف ہندوستان کی تاریخ میں ناصرالدین محمودؒ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے درویش صفت شہنشاہ گزر چکے ہیں جنکے اسلامی زہد و تقویٰ کے سامنے ہمارا سرِ عقیدت آج بھی خم ہو جاتا ہے۔ غرض کہانتک کہا جائے ؎

شیریں تر از حکایت ما نیست قصۂ
تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم!

اسوۂ نبوی نے ہمارے لئے دُنیا کے اُن معاملات پر بھی روشنی ڈالدی جنہیں اکثر رہ نمایانِ دین نگاہِ استغنا سے دیکھنے کے خوگر ہیں۔ دُنیا کے اور کس مذہبی پیشوا نے اپنے معتقدین کو تحصیلِ علومِ دنیوی کی ترغیب دی ہے؟ لیکن محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو دین و دُنیا میں اتحاد پیدا کرنیکے لئے آئے تھے، طلبِ علم و ہنر کی اہم دنیوی ضرورت کو بھی نظرانداز نہ کیا۔ چنانچہ اُسی دن جب پہلی مرتبہ

سعادتِ جہاد مسلمانوں کے حصّہ میں آئی، غنائم علم بھی اُنکے قدموں میں ڈالدیئے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی علمی ترقیات کی داستان، خلافِ دستورِ عام، اُن کے قائدِ مذہبی علیہ الف الف تحیات والسّلام کے فیوض کے تحت میں آتی ہے اور حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کا کوئی مجمل تبصرہ بھی اس بحث سے بے نیاز نہیں ہوسکتا

ظہورِ اسلام کے وقت قریش جیسے مقتدر اور کثیر النفوس قبیلہ میں صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو کسی قدر لکھ پڑھ سکتے تھے اور جنکے نام علامۂ بلاذری نے الگ الگ لکھ ڈالے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب تلوار چلانے میں جتنے ہشیار تھے، قلم کے استعمال سے اتنے ہی ناواقف تھے اور غرورِ جاہلیت ہر قسم کی نوشت وخواند کو نگاہِ حقارت سے دیکھتا تھا۔ لیکن جب اسی جاہل قوم کے سامنے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اسوۂ حسنہ آیا تو اُس نے اپنی اعجاز نما کشور کشائی کی طرح علمی فتوحات کے میدان میں بھی ایک عجیب محیّر العقل پیش قدمی کا جلوہ دکھایا۔ پیغمبرِ خداؐ نے غزوۂ بدر کے بعد اُن اسیروں کے لئے جو زرِ فدیہ ادا نہ کرسکتے تھے، یہ تجویز کرکے کہ اولادِ انصار کو کوئی علم یا ہنر سکھادیں، علوم وفنون کی قدردانی کی ایک معرکۃ الآرا مثال قائم کی تھی اور اسی خصوص میں آپؐ کے متبعین کے لئے آپکے چند ارشادات تھے جن کا ماحصل یہ ہے:-

کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

حضورؐ کی اِس عملی اور زبانی تلقین کے طفیل یہ شرف اسلام کے حِصّہ میں آیا ہے کہ اس نے علوم دینی ودنیوی کے تخالف وتناقض کو مٹا کر ان کا اتحاد نہ صرف ممکن بلکہ ثابت کردکھایا اور نہایت سختی سے دائرۂ اسلام کے اندر رہ کر مُسلمانوں نے اولوا الابصار کی عبرت کے لئے مظاہر کائنات میں وہ آیاتِ بصیرت پیدا کیں کہ ایک دُنیا کو اُن سے سبق لینا پڑا۔ ایک پیغمبرانہ مثال کے قائم ہوجانیکے بعد ملّتِ بیضاء کے شہداء کا خون اور علماء کی روشنائی یکساں طور پر بنی نوعِ انسان کی خدمت کرنے لگی۔ اگر اسلام نے محمود غزنوی کو بت شکنی کے لئے سومنات بھیجا تو ابوریحان بیرونی کو بھی ہندوستان کی اقلیم علم کی تسخیر کے لئے اُسکے ساتھ روانہ کردیا۔ یہی خدمت زیادہ وسیع پیمانہ پر مُسلمانوں نے فلسفۂ یونان کے لئے انجام دی اور آج یوروپ کو اعتراف ہے کہ یونانی علوم وفنون سے اُس کا تعارف رسُولِ اُمّیؐ ہی کی اُمت کے توسط سے ہُوا۔ اندلس میں جابجا مکتب، مدرسے

دارالعلم اور بیت الحکمت قائم ہو گئے تھے جن میں اطراف اکناف عالم سے ہر مذہب و ملت کے ہزارہا طالبان فن تحصیل علوم کیلئے چلے آتے تھے۔ خود دنیائے مسیحیت کا ایک پوپ دسلوٹر دوم اسلمانونکی معارف نوازی کے ظل عطوفت میں پرورش پا چکا تھا اور یوروپ کی بڑی بڑی درسگاہوں میں عربی زبان رائج تھی، ابن رشد اور ابوالعاص اندلسی فلسفہ میں یوروپ کے اولیں معلم خیال کئے جاتے ہیں، ابن خلدون نے پروفیسر نکلسن کے بقول یوروپ کو فلسفۂ تاریخ سمجھایا اور ڈاکٹر ڈریپر کے نزدیک ابوموسی جعفر کوفی نے علم کیمیا کیلئے وہی کار نمایاں کیا جو اس زمانہ میں پریسٹلی اور لاوازیئے نے انجام دیا ہے، اس سلسلہ میں علامہ ابومعشر بلخی اور محمد ابن جابر البطنی جیسے ماہران علم ہئیات، تاریخ حیوانات کے مشہور مصنف الدمری اور اسی پایہ کے بیسیوں مسلمان علماء کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ہر طرف علم کے چرچے تھے، ہر جگہ حکمت کی گرم بازاری تھی، مامون ابن مامون فرمانروائے خوارزم گیارھویں صدی میں ایک ثانوی حیثیت کا اسلامی تاجدار تھا لیکن ۱۰۱۷ء میں جب سلطان محمود غزنوی نے اسکے علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا، اس وقت ابوسہل مسیحی جیسے فلسفی، ابونصر عراق جیسے ہندس، ابوالحسن خمار جیسے طبیب اور بوعلی سینا و ابوریحان بیرونی جیسے مشاہیر عصر دربار خوارزم کی زینت تھے۔

کیسا عظیم الشان معجزہ ہے کہ اونٹوں کے وہ حدی خواں جنکے جمود کا طلسم صدہا برس سے نہ ٹوٹا تھا، یک بیک آتش بجاں ہو کر اٹھے اور دنیا و دین اور حکمت و اخلاق کے ہر شعبہ میں زمانہ کو درس دینے لگے، جاہلیت کے وہی فرزند جو شاید کشت و خون اور جدال و قتال کے ہنگاموں میں اپنی عمریں کھو دیتے، ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ بنگئے اور آج لاکھوں اور کروڑوں دل انکی عقیدت اور محبت سے لبریز ہیں، ایک نہایت ہی قلیل مدت کے اندر عرب کا نقشہ بدل گیا، گنگا کی روانی اب وہی ترانہ سنا رہی تھی جس سے مست ہو کر بحر اوقیانوس کی موجیں ساحل ہسپانیہ پر اپنا سر پٹک پٹک دیتی تھیں، ارض بطحا کے خشک اور بے برگ صحرا میں برق تجلی گری اور خس و خاشاک کو بھی منور کر گئی جسکے نورانی جلوے دہلی سے لیکر غرناطہ تک قدم قدم پر جھلکنے لگے، غزالیؒ، رازیؒ، اور ابوحنیفہؒ، فارابی، ابن سینا، اور ابن رشد، عالمگیر، الپ ارسلان اور عمر ابن عبدالعزیزؒ جیسے بیسیوں پرستاران حق کے نام حیات جاوداں کے آسمان پر درخشاں ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں، یہ سب کس آفتاب کے پرتو تھے؟ کون تھا جس نے دنیا کو تاریکی سے نکال کر روشنی کا، ظلمت سے نجات دیکر نور کا راستہ دکھا دیا؟ جاؤ حجاز کے بیابان میں پکار پکار کر یہ سوال دہراؤ، اور پھر دہراؤ، شاید فاران کی گھاٹیوں میں گونج پیدا ہو کہ "محمد!"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

غزل

تو ہے اور فکرِ جفا ہے اور بس
میں ہوں اور شکرِ خدا ہے اور بس

بندہ پرور! اس طرف بھی اک نظر
اک نظر کی التجا ہے اور بس

یا تو دل تھا اور لاکھوں مُدعا
یا دلِ بے مُدعا ہے اور بس

کوئی بارِ عشق اُٹھا سکتا بھی ہو
اِدّعا ہی اِدّعا ہے اور بس

تو ہے اور دنیا کی دُنیا تیرے ساتھ
میں ہوں اور میرا خدا ہے اور بس

عادتِ چون و چرا کے دن گئے
اب سرِ صبر و رضا ہے اور بس

کل تک اصرارِ خطا تھا لیکن آج
میں ہوں۔ اقبالِ خطا ہے اور بس

ہو چکے دُنیا کے شکوے ہو چکے
اب فقط تجھ سے گلہ ہے اور بس

لامکاں کا کھوج کبتک ڈھونڈیئے
کیا یہی تیرا پتا ہے اور بس

ناخدا بھی ناخدائی کر چکے
اب خدا کا آسرا ہے اور بس

اصلِ ہستی تک پہنچنا کیا محال
اُسکا جوبن پھٹ پڑا ہے اور بس

دوستو! ناصح مرا دُشمن نہیں
اک ذرا سر پھر گیا ہے اور بس

جو کبھی آزاد تھا قسمت سے اب
اک گرفتارِ بلا ہے اور بس

حکیم آزاد انصاری

تذکرۂ قیصر جرمنی

میری سلطنت سے دست برداری

۸ر اگست ۱۹۱۸ء کے چند دن بعد میں نے شاہی کونسل طلب کی۔ تاکہ ہم لڑائی کے متعلق اصلی واقعات کا اندازہ کرسکیں، فوج کے اعلیٰ افسر بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی صلح کی تجویز کو پسند کیا۔ بشرطیکہ وہ ملک کیلئے مفید ہو۔ چنانچہ میں نے ہالینڈ سے دریافت کیا۔ کہ آیا وہ اس معاملے میں مداخلت کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے صُلح کرانے کا ذمہ اُٹھایا۔ مگر اس اثنا میں آسٹریا نے علیحدہ صلح کرنے کا اعلان کردیا تھا۔ اور اُس نے اتحادِ ثلاثہ سے خفیہ طور پر گفت وشنید شروع کردی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہنشاہ چارلس نے مدت سے ہمارا ساتھ چھوڑنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ جب وہ ہمارے پاس آتا تھا، تو جو کچھ ہم کہتے تھے۔ ہاں میں ہاں ملاتا تھا لیکن جب وہ اپنے ملک میں واپس جاتا تھا۔ تو جو کچھ اُسکی مرضی ہوتی تھی۔ کرتا تھا۔ وائنا کی گورنمنٹ ہمیشہ ہمیں دھوکا دیتی رہی، وہ اشارتاً، کنایتاً ہم سے کہتی رہتی تھی۔ کہ اگر تم ہمیں کچھ بُرا بھلا کہوگے، تو ہم اپنی فوج واپس بُلا لینگے۔ آسٹریا کی تحریکِ صلح نے ہمیں عجیب مخمصے میں پھنسا دیا۔ اگر وہ تین ہفتے اور انتظار کرتا تو اغلب تھا۔ کہ واقعات ہمارے موافق ظہور پذیر ہوتے۔ لیکن اس بیچارے کو یقین تھا کہ علیحدہ صلح کرنے سے اتحادِ ثلاثہ اسکے ساتھ اچھا سلوک کریگا۔ ۸ر اگست کی ناکامی کے بعد جرنیل لوڈنڈارف نے اعلان کیا۔ کہ اب وہ جنگ جاری رکھ کر دشمن کو مغلوب کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ چنانچہ صلح کرنے کی تحریک ضروری سمجھی گئی۔ چونکہ ہمارے سیاست دان اپنی نااہلیت کی بدولت صلح کی گفت وشنید میں ناکام ہوئے۔ اور جرمنی میں خانہ جنگی کا خطرہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس لئے لوڈنڈارف نے ۲۹ر ستمبر کو دوبارہ لکھا۔ کہ اگر صلح نہیں ہوسکتی تو عارضی صلح کا فی الفور انتظام کیا جائے۔ ایسے نازک وقت میں جرمنی میں ایک تحریک بڑے زور وشور سے اس غرض سے شروع ہوئی۔ کہ ایک نئی گورنمنٹ قائم کی جائے جو لڑائی کو ختم کرسکے۔ میں اِن واقعات سے غافل نہ تھا۔ اور چاہتا تھا کہ گورنمنٹ کے موجودہ وزرا کو

علیحدہ کرکے بارسوخ آدمی اُنکی جگہ پر مقرر کر دوں۔ کیونکہ گورنمنٹ نے ۸ راگست سے لیکر ستمبر کے اخیر تک صلح کرانے میں کوئی نتیجہ خیز کوشش نہیں کی تھی۔ اس اثناء میں میں نے جرنیل نان گیلوٹز اور جرنیل فان تڈرا کو جنگ کے محاذ سے بلوایا، انہوں نے فوج کی اندرونی حالت کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا۔ کہ اب سپاہیوں کی ایک کافی تعداد لڑائی کرنے سے گریز کرتی ہے، جو رنگروٹ لڑائی کرنے کی غرض سے آتے ہیں وہ افسروں کا حکم نہیں مانتے۔ اور جو سپاہی رخصت سے واپس آتے ہیں۔ اُنکے خیال بدلے ہوُئے نظر آتے ہیں، کیونکہ جرمنی میں جنگ کے خلاف ایک عام تحریک پھیل رہی ہے، جو سپاہیوں تک بھی پہنچ چکی ہے، انہوں نے یہ رائے دی۔ کہ ان حالات میں تمام فوج کو انٹورپ۔ میوز لائن تک واپس ہٹالیا جائے۔ میں نے اسی دن فیلڈ مارشل ہنڈنبرگ کو بذریعہ ٹیلیفون حکم دیا۔ کہ وہ فوج کو اس لائن سے پیچھے ہٹالے۔ تاکہ ہماری تھکی ہوُئی فوجوں کو کچھ آرام مل جائے۔

اب فوج کی وہ حالت نہ تھی جو ۱۹۱۴ء میں تھی۔ کیونکہ ۱۹۱۸ء کی فوج میں بہت سے ایسے رنگروٹ بھی تھے۔ جو باغیانہ خیالات سے بھرے ہوُئے تھے۔ اُنکو جب کبھی موقع ملتا تھا۔ تو اندھیرے میں خندقوں سے نکلکر بھاگ جاتے تھے۔ لیکن پرانی فوج بڑی مستعدی سے لڑتی رہی، انہوں نے دشمنوں کی تعداد کی کبھی پروانہ کی، اور ہمیشہ اُنکو شکستِ فاش دیتے رہے، اسی لئے ہماری فوج کا ہر ایک فرد فخریہ طور پر یہ کہنے کا حق رکھتا ہے، کہ اس نے لڑائی میں پشت نہیں دکھائی۔ لیکن ہماری فوج آخر انسانوں کی بنی ہوئی تھی۔ ان سے معجزے کی امید کرنا غلطی ہے، اٹھائیس سلطنتوں کے برخلاف لڑنا اور پھر شکست نہ کھانا ایک ایسی بات ہے جس کو دنیا کبھی بھول نہیں سکتی، فیلڈ مارشل اس حکم پر معترض ہوُا۔ اور کہا کہ جب صلح کی کوشش ہو رہی ہے، تو فوجیں اسی جگہ ڈٹی رہنی چاہئیں جہاں کہ پہلے موجود ہیں، اور اس بات پر اُس نے زور دیا۔ کہ پیشتر اسکے کہ فوجیں پیچھے ہٹائی جائیں۔ جنگی سامان جرمنی بھجوانا چاہیئے۔

سالف نے ولسن پریذیڈنٹ امریکا کو جو خط جنگی کونسل اور ریشتاغ کے مشورے سے تحریر کئے تھے، مجھے اُنکی قطعی اطلاع نہیں ہوُئی تھی، حتیٰ کہ جب ہماری طرف سے ولسن کو آخری خط لکھا جا رہا تھا تو میں نے سالف کو صاف طور پر بتا دیا۔ کہ خط بھیجنے سے پیشتر مجھے دکھا دیا جائے۔ چنانچہ اُس نے مجھے خط لا کر دیا۔ میں نے اس سے ذکر کیا کہ بعض لوگ میرے ترکِ سلطنت کے متعلق بے بنیاد

افواہیں پھیلا رہے ہیں، اس سلئے دفتر امورِ خارجہ کو چاہیئے کہ اخباروں کے ذریعے سے اُنکی زبردست تردید کریں۔ سالف نے وعدہ کیا۔ کہ وہ اس قسم کی افواہوں کی تردید کریگا، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ دفتر امورِ خارجہ نے مطلق پروانہ کی، سالف مجھ سے کہا کرتا تھا کہ اگر میں نے سلطنت سے ہاتھ اُٹھالیا، تو وہ بھی اپنی ملازمت سے دستبردار ہوجائیگا، لیکن مجھے تو میری گورنمنٹ نے معزول کردیا۔ مگر سالف نے ملازمت نہ چھوڑی۔

میں نے ان حالات میں اپنی فوج کے پاس جانیکا ارادہ کیا۔ چانسلر۔ پرنس میکس نے مجھے جانے سے روکا۔ کیونکہ اسکے خیال کے مطابق میرا برلن میں رہنا زیادہ ضروری تھا، میں نے اُس سے کہا، کہ مجھے اپنی فوج سے جُدا ہوئے ایک مہینہ ہوچکا ہے، اگر میری عدم موجودگی میں ولسن کا صلح کے متعلق کوئی جواب آئے۔ تو فوجی ہیڈکوارٹر میں وہ دیگر وزرا کے ساتھ آکر مجھ سے بات چیت کرلیگا۔ میں نے پھر اپنے جرنیلوں کو حکم دیا کہ وہ باقاعدہ طور پر پسپائی کرتے ہوئے انٹورپ میوز لائن تک آجائیں، لیکن وہ کہتے تھے کہ ابھی تک جنگ کا سامان پورے طور پر واپس نہیں بھیجا گیا۔ اس سلئے پسپائی کو التوا میں رکھا جائے۔ مگر میں نے کسی کی نہ سُنی جب میں اپنی فوج کے ساتھ جاملا۔ تو کمان افسروں نے مجھے یقین دلایا۔ کہ سپاہیوں کے جوش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، لیکن رنگروٹ اور وہ سپاہی جو رخصت سے واپس آتے ہیں۔ لڑائی کرنے سے گھبراتے ہیں، برلن میں میری غیر حاضری میں میرے برخلاف سخت جوش پھیلا ہُوا تھا۔ لیکن گورنمنٹ نے اس باغیانہ جوش کو بند کرنیکا کوئی انتظام نہ کیا، بلکہ باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئی۔ چانسلر ان دنوں میں بیمار تھا۔ اور حکومت کی باگ سالف کے ہاتھوں میں آگئی۔ ایسے نازک وقت میں جبکہ شہزادہ میکس بیمار تھا ریشتاغ کو چاہیئے تھا کہ اسکی جگہ کسی زبردست آدمی کو مقرر کرتی، تاکہ وہ اپنے رسوخ سے حکومت کی کشتی کو ڈگمگانے سے بچاتا، لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔

اب گورنمنٹ اور چانسلر نے مجھے ترکِ سلطنت پر مجبور کرنا شروع کیا، ڈریوز میرے پاس چانسلر کے ایما سے آیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے مجھ سے کہا کہ چانسلر کا یہ خیال ہے کہ اگر میں خود بخود حکومت سے دست بردار ہوجاؤں تو بہتر ہوگا۔ تاکہ یہ معلوم نہ ہو۔ کہ میں نے کسی دباؤ کی وجہ سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ میں نے اسکو بہت ڈانٹا۔ کہ وہ ملازم ہوکر اپنے حلف کے برخلاف اس قسم کی باتیں کس طرح کرسکتا ہے، میں نے اس سے کہا کہ میں ہرگز تخت و تاج کو نہ چھوڑونگا۔ اور اپنی فوج اکٹھی کرکے برلن میں واپس آجاؤنگا، تاکہ حکومت فوج

کی امداد سے امن و امان قائم کر سکے۔ اس اثناء میں ہنڈنبرگ اور جرنیل گرونر بھی آ گئے۔ انہوں نے بھی ڈریوز کو بُرا بھلا کہا، وہ شرمندہ ہو کر واپس چلا گیا۔ ہنڈنبرگ نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نے سلطنت ترک کی تو فوج کے تمام افسر بھی سبکدوش ہو جائینگے، فوج منتشر ہو جائیگی اور لڑائی کرنے سے انکار کر دیگی۔ دوسرے دن میں نے چانسلر کے پاس ایک ایڈریس تیار کرا کر بھجوایا اور اُسکو حکم دیا۔ کہ اسکو ملک کے تمام علاقوں میں طبع کرا کر تقسیم کیا جائے۔ اس ایڈریس میں میں نے اپنے رویہ کے متعلق ذکر کیا تھا۔ لیکن چانسلر نے سات دن تک اسکو اپنے ذاتی بکس میں ڈال رکھا۔ آخر کار جب اسکو مجبور کیا گیا تو اُس نے شائع کیا۔ اس سے عام پبلک پر اچھا اثر پڑا۔ حتیٰ کہ میرے مخالفین بھی قدرے خاموش ہو گئے لیکن سوشلسٹ جماعتِ برلن میں فساد کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ انکا ارادہ تھا کہ مجھکو علیٰحدہ کر کے جمہوری حکومت قائم کریں۔ جرنیل گرونر نے جو برلن میں واقعات کی روش دیکھنے کے لئے گیا تھا، مجھے آ کر بتایا کہ گورنمنٹ کا رعب و داب بالکل نہیں رہا۔ لوگ بغاوت کرنے پر تُلے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح سے صلح ہو، میرے برخلاف لوگوں کا جوش بڑھ رہا ہے، لیکن گورنمنٹ اس تحریک کو بند کرنیکی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ جو فوجیں برلن میں مقیم میں وہ ناقابلِ اعتبار ہیں۔ اس نے ذکر کیا کہ خفیہ پولیس والوں نے روسی سفیر کی ڈاک سے چند ضروری کاغذات پکڑے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالشویک جرمنی میں بھی بغاوت کرانا چاہتے ہیں، ان حالات میں اس نے مشورہ دیا کہ جس طرح بھی ہو سکے، عارضی صلح کا فی الفور انتظام کیا جائے، ورنہ خانہ جنگی کا سخت خطرہ ہے۔

۹۔ نومبر کی صبح کو چانسلر نے مجھے اطلاع بھجوائی کہ ریشتاغ کی سوشلسٹ جماعت مطالبہ کرتی ہے۔ کہ میں سلطنت سے دستبردار ہو جاؤں، دیگر سیاسی جماعتیں جو قبل ازیں میری دستبرداری کی مخالف تھیں، اب وہ بھی سوشلسٹ جماعت سے مل گئی ہیں اس لئے اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں علیٰحدہ ہو جاؤں تو بہتر ہوگا۔ ورنہ برلن میں زبردست خانہ جنگی شروع ہو جائیگی۔ میں نے اسی وقت ہنڈنبرگ اور گرونر کو بلوایا۔ گرونر نے بیان کیا کہ فوج اب زیادہ دیر تک نہیں لڑ سکتی۔ بلکہ آرام کرنا چاہتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ فی الفور صلح کی جائے کیونکہ فوج کے پاس خور و نوش کا سامان ختم ہونے والا ہے اور باغیوں نے کھانے پینے کے ذخیروں پر قبضہ کر لیا ہے۔ ولیعہد جرمنی بھی اس وقت آ گیا۔ چانسلر کی طرف سے ہر گھڑی اطلاعیں آتی رہیں کہ واقعات خطرناک صورت اختیار

کررہے ہیں۔ بازاروں میں کہیں کہیں گولیاں چل رہی ہیں۔ اور لڑائی کا سخت اندیشہ ہے۔ اسی وقت وزیر جنگ نے خبر دی کہ فوج کا کچھ حصہ جو برلن میں مقیم تھا۔ باغیوں سے جاملا ہے۔

میں اپنے لوگوں کو خانہ جنگی سے بچانا چاہتا تھا۔ اگر میری دستبرداری ہی سے کشت وخون بند ہوسکتا تھا، تو میں جرمنی کے تخت کو چھوڑنے پر راضی تھا، لیکن میں پرشیا کی بادشاہی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ فوجی ماہرین نے مجھ سے کہا۔ کہ اگر میں دونوں سلطنتوں سے بالکل دستبردار ہوگیا۔ تو فوج کے تمام افسر علیحدہ ہو جائینگے اور فوج جو منتشر ہو جائیگی جرمنی میں واپس آکر ملک کو سخت نقصان پہنچائیگی، میں نے چانسلر کو جواب دیا کہ میں نے ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا۔ سوچکر جواب دیا جائیگا۔ جب کچھ عرصے کے بعد میں نے اسکو اطلاع بھیجی کہ میں جرمنی کے تخت سے دستبردار ہونے پر تیار ہوں، لیکن پرشیا کی بادشاہی سے علیحدہ نہیں ہونگا تو مجھے جواب آیا کہ میرا فیصلہ بڑی دیر کے بعد پہنچا ہے۔ کیونکہ چانسلر نے خود بخود میری دستبرداری کا اعلان کردیا تھا۔ اور ساتھ ہی ولیعہد کی طرف سے بھی اعلان ہوچکا تھا کہ وہ بھی تخت کا دعوے نہیں کریگا، حالانکہ اس سے کسی نے نہیں پوچھا تھا۔ چانسلر نے گورنمنٹ کا انتظام جمہوریت پسند اراکین کے سپرد کردیا تھا۔ اور ہر ایبرٹ چانسلر مقرر ہوا تھا۔ یہ تمام واقعات لاسلکی کے ذریعے سے تمام ملک میں مشتہر کئے گئے تھے۔ مختصر بات یہ ہے کہ مجھ سے شاہی تخت اور پرشیا کی بادشاہت بغیر میری رضامندی کے چھینی گئی، جب میری فوج کو یہ خبر پہنچی تو فوج والوں کو سخت افسوس ہوا کہ انکے بادشاہ نے اس نازک وقت میں انکا ساتھ چھوڑ دیا۔ چانسلر نے ان واقعات میں سخت کمزوری دکھائی۔ وہ سوشلسٹ جماعت سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اور جس طرح وہ کہتے تھے۔ اسے کرنا پڑتا تھا۔

فیلڈ مارشل ہنڈنبرگ نے مجھے صلاح دی۔ کہ میں کسی غیر جانبدار ملک میں چلا جاؤں۔ تاکہ جرمنی خانہ جنگی سے بچ جائے۔ کیونکہ اُسے خطرہ تھا کہ فوج میری موجودگی میں باغیوں سے فساد کریگی اور خواہ مخواہ ملک میں ایک عام کشت وخون ہوگا۔ اس وقت میرے دل میں بڑی کشمکش ہو رہی تھی۔ ایک طرف تو میں اپنے بہادر سپاہیوں کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اور دوسری طرف سے برطانیہ اور فرانس نے اعلان کردیا تھا کہ وہ جرمنی کے ساتھ کوئی مستقل صلح نہیں کرسکتے۔ جبتک کہ میں حکمران ہوں۔ ہماری گورنمنٹ نے بھی اعلان کردیا تھا کہ اگر میں جرمنی سے باہر چلا جاؤں، تو

ملک کے واسطے مفید ہوگا۔ میں نے ان حالات میں اپنی ذاتی اغراض کی ذرا پروانہ کی اور اپنا تخت و تاج ملک کی خاطر قربان کردیا۔ لیکن مجھے اب معلوم ہوا کہ یہ قربانی بے فائدہ ثابت ہوئی۔ میری روانگی سے جرمنی کو نہ تو صلح میں کوئی مفید شرائط ملیں اور نہ اس سے خانہ جنگی بند ہوئی۔ بلکہ اس سے ملک میں زیادہ فساد مچ گیا +

میں نے تین سال تک فوج کے ساتھ محنت کی تھی اور اب ساڑھے چار سال کی فاتحانہ جنگ کے بعد وہ باغیوں کے ہاتھوں عین اس وقت تباہ ہوئی۔ جبکہ صلح عنقریب ہونیوالی تھی۔ جب کبھی میں خیال کرتا ہوں، کہ پہلے پہل بغاوت کے آثار میری بحری فوج میں جسکو میں نے از سر نو تیار کیا تھا پائے گئے۔ تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا ہے +

میرے دشمن مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ میں نے اپنی فوج کے ساتھ غدّاری کرکے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ قیصر کو چاہیئے تھا کہ فوج کو ساتھ لیکر دشمن پر حملہ کرتا۔ اور اسی میں مارا جاتا، لیکن اگر میں ایسا کرتا تو عارضی صلح کبھی نہ ہوتی، علاوہ ازیں بہت سے بہادر سپاہیوں کا ناحق خون ہوتا۔ بعض کہتے ہیں کہ قیصر کو فوج لیکر جرمنی میں داخل ہونا چاہیئے تھا۔ اور فوج کے زور سے حکومت کرنی چاہیئے تھی، لیکن اس صورت میں پُرامن واپسی ممکن نہ تھی کیونکہ باغیوں نے رائن کے پلوں اور دیگر ضروری مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ اگر میں فوج لیکر واپس آتا تو میری باغیوں سے یقیناً مٹ بھیڑ ہوتی۔ اور طرفین کی کشمکش سے جرمنی کا ناحق نقصان ہوتا۔ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ میری کسی حرکت سے جرمنی کا بے فائدہ جانی یا مالی نقصان ہو۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں۔ کہ مجھے خودکشی کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن یہ حرکت میرے نزدیک بزدلانہ ہے۔ اور اگر مجھ سے یہ فعل سرزد ہوتا تو میرے دشمن میری موت کے بعد کہتے کہ اس جنگ کا میں ہی ذمہ دار تھا۔ آخر کار میں نے اپنے دوستوں کی صلاح اور مشورے کے مطابق ہالینڈ جانے کا ارادہ کرلیا +

ماخوذ

محمد علی

شاعر

جس قدر انساں پہ ہوتی ہیں طاری حالتیں
ہو نہیں سکتیں بیاں ہرگز وہ ساری حالتیں

واسطہ ہے نفی سے اُنکو نہ کچھ اثبات سے
ہے تعلق اُن کا نامعلوم ادراکات سے

لمس کرتا ہے فقط احساسِ پنہانی انہیں
اور دیتا ہے ترقی ذوقِ روحانی انہیں

مستتر ہوتی ہے جو پاکیزگی جذبات میں
وسعتیں کرتی ہے پیدا اور اپنی ذات میں

اپنے جذبوں کی فراوانی میں کھو جاتا ہے دل
اپنی شخصیت سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے دل

بیخودی یا وجد یا جو کچھ بھی کیفیت ہے یہ
کچھ نہیں ہے صرف محویت ہی محویت ہے یہ

اِن لطائف کی زباں سے ترجمانی ہو تو کیا
گفتگو میں ربطِ الفاظ و معانی ہو تو کیا

بیزبانی اسکو کہہ سکتے ہیں خاموشی نہیں
ہے تسکّر ہی تسکّر یہ فراموشی نہیں

ناطقہ مجبور ہے تصریح و تفصیلات سے
کام چل سکتا نہیں تشبیہ و تمثیلات سے

دل کی کیفیات کا اظہار ممکن ہی نہیں
کھول دے ہر شخص یہ اسرار، ممکن ہی نہیں

ہاں فقط اک شخص جو اونچا ہے سطحِ عام سے
جسکو قدرت نے مدد دی قوتِ الہام سے

اِن حقائق کا اگر کوئی مُبصّر ہے تو وہ
اِن معارف کا اگر کوئی مفسّر ہے تو وہ

ہے لبِ شاعر پہ، جو ہر قلب میں مستور ہے
"شاعری جزویست از پیغمبری" مشہور ہے

ارشد تھانوی

دھرم بھکشو انندا

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

ساکیہ منی مہاتما بدھ نے جب اپنے مریدینِ خاص کو اطراف و جوانب میں بدھ مت کی تبلیغ کیلئے روانہ کیا تو انہیں رہنمائی کیلئے چند نہایت ہی مفید ہدایات بھی دیں۔ عاجزی انکسار۔ ترک سامانِ دنیا۔ شوقِ تبلیغ اور سب سے بڑھ کر یہ ہدایت کہ اپنے مقصد کی اشاعت کیلئے کوئی کرامات یا معجزہ نہ دکھایا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ مبلغوں کو بعض دفعہ بہت سی ہدایات پر چلنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور بعض جگہ ناممکن نظر آیا کہ وہ ان پر کاربند رہ سکیں لیکن سوائے مقدس بھکشو انندا کے اور کوئی کم ازکم اس آخری حکم کے خلاف چلنے کا خیال دل میں نہ لایا۔

انندا مگدھ دیش کی طرف روانہ ہوا اس نے قانونِ بدھ کی نشر و اشاعت میں سخت جد و جہد کی۔ کچھ تو مذہبی اصولوں کی سادگی اور کچھ اسکی اپنی فصیح زبانی نے لوگوں کو جوق در جوق اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اور ہزار ہا رام کے بھگتوں نے برہمنوں سے پیٹھ پھیر کر انندا کی پیروی اختیار کی۔ کامیابی کا اثر ہمیشہ انسان پر عجیب و غریب ہوا ہے۔ انندا بھی اس سے بچ نہ سکا۔ ایک دن اس نے سامعین کی بھری مجلس میں کہا "کس قدر خوش نصیب ہے وہ مبلّغ جو دلائلِ عقل سے اور خود مثال بنکر صداقت اور حقانیت کی اشاعت میں مصروف رہے۔ لوگوں کو صداقت کی طرف پکارے مگر اپنے قول و فعل کی عظمت سے اور اپنی فصیح بیانی کے ساتھ نہ کہ کذّاب برہمنوں کی طرح غلط بیانی اور شیطانی ہتھکنڈوں سے" جونہی کہ یہ معاندانہ اور پُر غرور الفاظ ادا ہوئے اسکی عظمت کا ستارہ جھلملا گیا صداقت اور حقانیت اس سے کنارہ کر گئی یہاں تک کہ جب اس نے دوسری دفعہ وعظ شروع کیا۔ تو لوگوں نے اس کا مذاق اُڑایا۔ سیٹیاں بجائیں۔ آوازے کسے۔ اور اخیر میں اس پر پتھر بھی پھینکے۔ معاملہ اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ انندا نے چند برہمنوں کو ایک عجیب شغل میں دیکھا وہ ایک لڑکے کے گرد جو کہ بیہوش پڑا تھا جمع تھے اور اپنے تمام منتر اور رسوم کو ختم کر کے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کامیابی سے

مایوس ہو کر اُن میں سے بزرگ ترین برہمن نے کہا۔ "آؤ ہم اسکے جسم کو شیطان کے لئے بدترین قیامگاہ بنادیں شاید وہ پھر اس میں رہنا چھوڑ دے"۔ معلوم نہیں انہوں نے کس قسم کی دھونی بچے کو دینی شروع کی کہ ہر طرف دھواں ہی دھواں چھا گیا۔ انہوں نے اُسکے جسم کو داغنے کے لئے ایک آہنی سلاخ کو گرم کرنا شروع کیا۔ ان تمام رسوم سے وہ غالباً غاصب شیطان کو دفع کرنا چاہتے تھے۔ انندا کا سب سے پہلا خیال تھا کہ لڑکا بیہوش ہے پھر اُسے فوراً خیال آیا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اس معصوم کو ظالموں کے پنجے سے رہائی دلائی جائے؟ ممکن ہے کہ بہتر تیمارداری سے اس کی حالت سدھر جائے۔ شاید یہ مجھے میری اس موجودہ تکلیف دہ حالت سے نکالنے میں مدد ہو سکے۔ اور مقدس بدھ مت کی عظمت کو چار چاند لگا دے"۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے ایک سپاہیانہ دھمکی سے برہمنوں کو ڈرا کر بھگا دیا اور اپنا منہ آسمان کی طرف کر کے گوتم بدھ کے سات ناموں کو جپا کسی اثر کے نہ ہونے سے مایوس ہو کر بھی اُس نے ناموں کا وظیفہ جاری رکھا۔ حتّٰی کہ بیہوشی غالباً فطری طور پر کم ہوئی اور مریض اُٹھ بیٹھا۔ آنکھیں کھول دیں اور انندا نے اُسے اُسکے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا اُسکی اس کرامت کا چرچا گھر گھر ہو گیا۔ عوام یک زبان ہو کر پکار اُٹھے معجزہ! معجزہ!! سینکڑوں نے اب اسکے وعظ میں شرکت اختیار کی بہتوں نے بدھ مت اختیار کر لیا۔ انندا اپنی قابلیت۔ اپنے اعتمادِ نفس اور حوصلہ پر نازاں تھا اس نے فخر سے کہا کہ اچھا نتیجہ ذرائع کی صداقت کو یقیناً ثابت کر دیتا ہے، مگر اس بدعت کی بنیاد رکھنے پر بدھ دیوتاؤں میں انندا کی قدر کوہ سے برِکاہ کے برابر بھی نہ رہی۔ ہاں! مہاتما بدھ نے جن کا چشمۂ فیض وکرم لا انتہا تھا اس معتوب انسان کو بھی اپنی نظروں سے نہیں گرایا۔ ہند کا گوشہ گوشہ اُسکے اس کارنامے سے گونج اُٹھا۔ شدہ شدہ۔ مہاراج ادھیراج کو بھی اس کی اطلاع ہوئی۔ انندا حضورِ شاہی میں باریاب ہوا جہاں اُس سے دریافت کیا گیا کہ کیا واقعی اس نے شیطان کو نکال باہر کیا۔ جس کا جواب انندا نے اثبات میں دیا۔ مہاراج نے کہا تو پھر مجھے بہت خوشی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تقدس مآب میرے ولیعہد کو ضرور شفائے کلی عطا فرمائینگے۔ وہ آج انیس دن سے بیہوشی کی حالت میں پڑا ہے، دھرم بھکشو نے کہا۔ افسوس شہنشاہِ اعظم! وہ صفاتِ علوی جو ان امور کے لئے ضروری ہیں۔ مجھ میں صرف اتنی ہی تھیں۔ کہ ایک ادنیٰ شودر بچے کو شفا

حاصل ہوجائے اور بس! یہ ناممکن ہے کہ شہزادۂ ولیعہد کو کچھ فایدہ ہو سکے،

مہاراج نے پوچھا تو یہ صفات کس طرح حاصل کی جاسکتی ہیں،

انندا نے جواب دیا۔ صرف تپسیا کی سختیاں جھیلنے سے جس میں کامیاب ہوکر تپسوی ہواؤں پر قابو حاصل کرسکتا ہے پیکرِ برق کو پاش پاش کرسکتا ہے۔ شیروں سے گفتگو کرنے میں اُسے باک نہیں رہتا بدرِ کامل کو آستین میں لئے پھرنا اُسکے لئے کوئی وقت طلب معاملہ نہیں رہ جاتا۔ غرضکہ تمام فوق العادت اسباب اُسکی اس قوت کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں،

مہاراج نے کہا یعنی تمہاری نا قابلیت کی وجہ محض تم میں ان صفات کی غیر موجودگی ہے۔ اور ان صفات کا نہ ہونا تپسیا کی کمی کی وجہ سے ہے؟ کیوں درست ہے نا؟ تو پھر میں تمکو اپنے برہمنوں کے حوالے کرتا ہوں۔ تاکہ وہ تمہاری کچھ مدد کرسکیں۔ تمہاری تپسیا کی ہمیں سخت ضرورت ہے، انندا نے بے فائدہ اپنے الفاظ کی تشریح کرنے کی کوشش کی کہ اُس کا مطلب تپسیا کی سختیوں سے روحانی سختیوں اور گیان دھیان سے تھا۔ برہمن ایک ادھرمی کو اپنے قبضے میں پاکر بہت خوش تھے۔ وہ اُسے ایک مندر میں لے گئے جہاں انہوں نے اُسکے کپڑے اُتار ڈالے وہ حیران تھے کہ تپسیا کا کوئی نشان یا داغ اُس کے جسم پر نہیں تھا۔ "رام! رام! یہ ادھرمی اپنی سالم کھال کے ساتھ سورگ میں جانیکی اُمید رکھتا ہے"!! اس خوفناک فروگذاشت سے بچانیکے لئے انہوں نے اُسے اوندھے مُنہ لٹایا۔ اُسکا تمام جسم آہنیں سُرخ سُلاخوں سے داغ دیا۔ حتیٰ کہ اُس کی پشت کی تمام جلد جل گئی۔ اور گوشت کے لوتھڑے لٹک گئے وہ اُس کو اس حالت میں چھوڑ کر اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ تاکہ دوسری طرف داغ دینے کے لئے دوسرے دن علی الصباح آسکیں انہوں نے طعنہ زنی کے طور پر کہا: "اب تمہاری یہ تپسیا تمہیں کسی حالت میں بھی دہاتما بھاگیرت اور خود شہزادہ وِسوامتر سے کم نہیں رہنے دیگی"

انندا نیم مُردہ عالمِ بیہوشی میں مندر کے فرش پر پڑا تھا۔ کہ دفعتہً مقدس مندر نورانی شعاعوں سے بھر گیا۔ جن میں سے ایک پیکرِ نورانی نمودار ہوا۔ آواز آئی "میرے بدقسمت چیلے! کیا تجھے اب بھی اپنی بے وقوفی کا یقین نہیں ہوا؟" انندا اپنی پاکبازی اور عقل پر حرف آتا نہیں دیکھ سکتا تھا اُس نے کراہتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا: "پرماتما نہ کرے کہ میں ان مصائب پر زبانِ شکوہ وا کروں جو اپنے

آقا کے مذہب کی اشاعت میں مجھے برداشت کرنی پڑیں"۔

پھر آواز آواز آئی تو کیا تم تندرست ہونا چاہتے ہو۔ اور تمہاری خواہش صرف یہی ہے کہ سلطنت مگدھ کو بدھ مت کا پیرو دیکھو"

انندا نے دریافت کیا "یہ کس طرح ہو سکتا ہے" یہ خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے"

جواب ملا کہ "موجودہ نافرمانی اور جعلسازی پر قائم رہنے سے"

انندا کانپ گیا لیکن کسی نئے خیال سے متاثر ہو کر خاموش رہا۔ وہ کسی صریح اور صاف حکم کا منتظر تھا۔ پھر پیکرِ نورانی نے کہا۔

"تو پھر سمجھ لے! کہ شہزادہ تیسویں دن کے اختتام پر ہوش میں آئیگا جو کہ کل عین دوپہر کا وقت ہوگا۔ تمہیں اس مناسب وقت پر جیوراج کی چارپائی کی طرف جانا چاہیئے اور اپنا ہاتھ اُسکے سینہ پر رکھکر فوراً اُٹھنے کا حکم دینا چاہیئے اُسکی شفایابی تمہاری مافوق الفطرت طاقت کی طرف منسوب کی جائیگی اور بدھ مت کے قیام کا باعث ہوگی۔ اس سے بیشتر مجھے تمہاری پشت کی درستی کے لئے کچھ کرنا چاہیئے جو کہ میری طاقت میں ہے میں تم سے صرف اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اُس وقت تم اپنے گُرو کے حُکم کے صریح خلاف کر رہے ہوگے۔ یہ کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا موجودہ حالت سے عارضی چھٹکارا تمہیں اور سخت ترین مصائب میں پھنسا دیگا"۔

انندا نے خیال کیا "ایک غیر مادی پیکرِ نور ایک مظلوم مبلغ اور کھال کھنچے ہوئے انسان کے احساسات سے واقف نہیں ہو سکتا"۔

اس نے کہا "مجھے تندرست کر دو اگر تم کر سکتے ہو۔ اور اپنے نصائح کو کسی دوسرے موزوں وقت کے لئے رہنے دو"

پیکرِ نورانی نے جواب دیا "بہت خوب" اور جونہی کہ اُس نے اپنا ہاتھ انندا کی طرف بڑھایا، اُس کی تمام پشت پر نئی کھال آگئی اور جسم سے داغوں کے تمام نشان یک لخت مٹ گئے۔ اسکے بعد پیکرِ نورانی یہ کہکر غائب ہو گیا کہ "جب کبھی تمہیں میری ضرورت پڑے۔ تو یہ منتر پڑھنا میں فوراً تمہارے پاس موجود ہو جاؤنگا۔ **اوم۔ مانی۔ پدمی ہونگ**"

برہمنوں کے غصہ اور حیرانی کی کوئی حد نہ تھی۔ جب انہوں نے اپنے شکار کی حالت اسقدر

بہتر دیکھی۔ یقیناً وہ اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کرنیکی دوبارہ کوشش کرتے اگر ایک شاہی افسر ساتھ نہ ہوتا۔ جس نے کہ فاتح مظلوم کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور شاہی محل میں پہنچا دیا۔ اُس کو فوراً ولیعہد کے کمرے میں باریاب کیا گیا۔ جہاں ایک مجمعِ عظیم اُس کا منتظر تھا۔ چونکہ دوپہر ہونے میں ابھی دیر تھی۔ انند انے حکمتِ عملی سے معجزات کے ناممکن ہونے پر ایک مؤثر وعظ کہہ کر وقت گزارا جس میں اس نے اس بات پر خاص زور دیا کہ اگر کوئی معجزہ دکھا سکتا ہے تو وہ صرف بدھ مت کے پیرو دکھا سکتے ہیں اور بس۔ تب وہ بلندی سے اُتر آیا۔ اور جونہی کہ آفتابِ عالمتاب عین نصف النہار پر پہنچا۔ اُس نے اپنا ہاتھ شہزادہ کے سینہ پر رکھا جو فوراً اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے ایک نامکمل فقرہ شطرنج کی بابت پورا کیا جس کو کہ وہ فوری بیہوشی کی وجہ سے پورا نہیں کر سکا تھا۔ نعرۂ تحسین بلند ہوُا اور باری جامہ میں پھُولے نہ سماتے تھے۔ مگر برہمنوں کی حالت دگرگوں تھی۔ خود ذاتِ شاہانہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بادشاہ نے بدھ مت کے قوانین سمجھنے کی التجا کی۔ انند انے جو کہ ذہانتِ دینوی میں اِس چوبیس گھنٹہ کے عرصہ میں کافی ترقی کر چکا تھا۔ ابتدا ہی میں اصل الاصول مذہب یعنے راہبانہ زندگی اور ترکِ دنیا کا ذکر غیر ضروری سمجھا۔ مصائبِ زندگی۔ نروان کی ضرورت۔ نجات کا راستہ آہنسا پرمودھرما۔ غرضکہ ان میں سے اُس نے کسی ایک کو بھی اپنی توجہ خاص کا مرکز نہ بنایا۔ بلکہ صرف یہی بیان کیا کہ بدھ مت کے بھکشو دائمی افلاس ہی میں خوش ہیں۔ اور نئے انتظام کے ماتحت تمام دولت۔ جو دھرم کے نام سے ابتک جمع کی جا چکی ہے۔ حاکمِ وقت کا حق ہے۔

مہاراج پکار اُٹھے "گئو ماتا کی جے! یہ یقیناً ایک سچا مذہب ہے"۔

یہ الفاظ اُس کے منہ سے ادا ہُوئے ہی تھے، کہ تمام درباریوں نے تبدیلِ مذہب کا اعلان کر دیا۔ عوام نے مثال کی پیروی کی۔ برہمنوں کا ستارۂ عروج گہنا گیا۔ اور صرف ایک دن میں اس نئے اور پاک مذہب کے نام سے وہ تمام زیادتیاں اور بے عنوانیاں ہوئیں جو کہ سابقہ برہمنی مذہب نے سینکڑوں سالوں میں بھی نہ کی تھیں انندا نے اپنے تمام مخالفین کو معافی عطا کی۔ اسکی کامیابی یہیں پر ختم نہ ہوئی بلکہ اُسکو محل شاہی میں بُلایا گیا۔ اور شہزادہ ولی عہد کی تعلیم اُسکے سپرد ہُوئی جس کی تاسیس اُس نے بدھ مت کے قوانین کے موافق شروع کی۔ لیکن یہ ایک دقت طلب امر تھا۔ کیونکہ جیوراج کے مشاغلِ خاص میں بھی جن کا کہ وہ عادی تھا دخل اندازی کی ضرورت پڑتی تھی۔ تھوڑے عرصے کے بعد انندا پھر حضور شاہی میں طلب ہوا۔ شہنشاہ کے پاس اس وقت دو اول درجے کے انسان قالب شیطان سیرت بدمعاش افسر موجود تھے۔ ایک کے

ہاتھ میں ایک عظیم جنگی کلہاڑا تھا اور دوسرا ایک بہت بڑا زنبور لئے ہوئے تھا۔

مہاراج نے اِن دونوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ میرا جلّادِ اعظم اور یہ محافظِ تعزیر ہے۔

انندا دو اتنے بڑے عمائدِ سلطنت سے مل کر بہت خوش ہُوا۔

مہاراج نے کہا "مقدّس مہاتما! شاید آپ نہیں جانتے ہیں کہ ہمیں آپکی تپسیا کی پھر ضرورت ہوئی ہے۔ ایک زبردست دشمن ہم پر حملہ آور ہُوا ہے جو ہمارے پیارے مُلک کو تباہ و برباد کرنیکا رذیل ارادہ رکھتا ہے اگر مذہب کی پناہ مجھے نہ ہوتی تو میری مایوسی اور افسردگی کی کوئی حد نہ ہوتی۔ لیکن مجھے آپ پر کامل بھروسا ہے۔ اے روحانی باپ! یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ ایک عظیم روحانی طاقت کم سے کم وقت میں حاصل کریں۔ میں آپکے پرانے دوست برہمنوں کی مدد اب آپکے لئے حاصل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ ہم سے علیحدگی اختیار کرچکے ہیں۔ لیکن اُنکی بجائے میں نے اپنے ان قابل اعتبار اور تجربہ کار مشیروں کو بُلایا ہے۔ وہ کامل طور پر متفق الرائے نہیں ہیں میرا محافظِ تعزیر چونکہ ایک رحمدل اور نرم طبیعت کا انسان ہے وہ خیال کرتا ہے کہ ابتدا میں نرمی سے کام لیا جائے اسکے خیال میں آپکا ایک دھوئیں سے پُر غار میں سر کے بل لٹکایا جانا اور نتھنوں کو سرخ مرچوں سے بھر دینا ہی کافی ہے۔ لیکن میرا جلّاد سولی توڑنے اور شکنجے میں کھینچنے سے کم کسی تپسیا کو مناسب نہیں سمجھتا۔ میں اب اس معاملہ میں مقدّس بھکشو کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں"

انندا کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے وہ حیران تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے اُس نے ہر دو ظالمانہ طریقوں پر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

راجہ نے آخر بہ اندازِ مجبوری کہا بہت خوب"۔ اگر ہم ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک پر متفق نہیں ہوسکتے تو ہمیں دونوں طریقوں کا تجربہ کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے ہم کل صبح پھر دو بجے ملینگے آپ اب اطمینان سے تشریف لے جایئے"

انندا چلا آیا مگر اطمینان اس سے کوسوں دُور تھا۔ اُسے فوراً اپنے سابقہ نجات دہندہ کا خیال آیا۔ وہ بسرعت تمام ایک تنہائی کی جگہ پہنچا اور پاک منتر کا ورد کیا۔ اوم۔ مانی۔ پدمی ہونگ۔ اُس نے کسی کی موجودگی محسوس کی۔ پھر کر دیکھا تو یہ وہ پیکرِ نورانی نہیں تھا۔ جس کے درشن پیشتر بھی ہوچکے تھے بلکہ ایک مقدّس پیر مرد جس کا سر برف کی طرح سفید اور جسم گئو بتر اور گوبر سے مُشدھ ہو رہا تھا۔ فقیر

نے کہا: "اب دیر کا وقت نہیں ہا۔ تمہیں فوراً میرے ساتھ چلنا اور ایک جوگی کا لباس پہننا چاہیئے۔"
انند اول سے تو یہ نہیں چاہتا تھا کیونکہ مہاتما بدھ کی صحبت میں رہنے سے وہ ان مزخرفات سے نفرت کرنا سیکھ گیا تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ موقع کی نزاکت نے اُسے مجبور کردیا۔ کہ وہ جوگی کا حکم مان لے وہ اپنے رہنما کے ساتھ ساتھ ایک زمین دوز مکان میں گیا۔ جہاں پر جوگی نے اُس پر زرد مٹی اور چاک کے ساتھ وہ گلکاری کی کہ ایک نہایت ہی صلح پسند مت کا مبلغ بالکل ایک بنگالی چیتے کے مشابہ ہوگیا تب اُس نے اُسکی گردن میں ایک مُردہ بچے کی کھوپری لٹکائی اور ایک دیرینہ مجرم کی کھوپری اُس کے ہاتھ میں دی اور کسی شعبدہ باز کی ٹانگ کی نلی کی ہڈی اُسکے دوسرے ہاتھ میں دیکر اُسے دوسرے کمرے میں چھوڑ دیا۔ جہاں ایک چھلنے کی راکھ کے ڈھیر پر بٹھا کر نلی کی ہڈی کے ساتھ کھوپری بجانے کو کہا۔ خود پیرمرد نے ایک منتر پڑھنا شروع کیا۔ افسوں نے اپنا پورا اثر دکھایا۔ چند ساعتیں بھی گزرنے نہیں پائی تھیں کہ طوفان باد و باراں شروع ہُوا ہوا نے بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ الاماں! الحفیظ۔ وہ پانی پڑنے لگا کہ طوفان نوح کا نقشہ کھنچ گیا۔ آسمان میں ہرطرف فاسفورس کی مشعلیں چکر لگاتی نظر آنے لگیں بھیڑیئے اور شیر اپنے اپنے غاروں اور کچھاروں سے نکل آئے درندوں کی دھاڑوں اور پرندوں کی آوازوں کے شور میں کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی لاتعداد بھوت پریت اور ارواحِ خبیثہ سے خلائے آسمانی پُر ہوگیا۔ جنہوں نے اپنے ہاتھوں کو جن پر گوشت کا نشان تک بھی نہیں تھا انند کی طرف بڑھایا اور اُس کو اُسکی جگہ پر سے اُٹھا کر پھینک دینا چاہا۔ غلبۂ خوف اور اپنے ہمراہی کی پیروی میں وہ چیخا چلایا۔ فریاد و فغاں کی، حتّٰی کہ قریب تھا کہ اپنی جگہ سے تھک کر گر پڑے کہ دفعتہً طوفان بند ہوگیا تمام ارواحِ خبیثہ غائب ہوگئیں۔ خوش طیور اپنے مسکنوں میں واپس چلے گئے نعرۂ خوشی اور سازوں کی دلکش آواز نے کسی مبارک اور خوش آئند موقع کا اعلان کیا۔

اسکے بعد جوگی نے دھرم بھکشو سے کہا "حملہ آور دشمن مردہ پڑا ہے۔ اور اُس کی فوج منتشر ہوگئی ہے، یہ تمہاری کرامت شمار ہوگی وہ ابھی ابھی تمہاری تلاش میں آرہے ہیں۔ الوداع۔ ضرورت ہوئی تو مجھے پھر بلانا۔" دُور سے سازوں کی سُریلی اور مدھم آواز آنی شروع ہوئی۔ پھر جلوس کا سلسلہ نظر آیا، جسکے آگے آگے مشعلیں روشن تھیں۔ مہاراج ہودج سے اُترے۔ انند کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور کہا: "مستغنی الصفات انسان! تو نے پیشتر ہی کیوں نہ بتا دیا تھا کہ تو ایک جوگی ہے۔" اب مجھے اپنے

دشمنوں سے ہرگز کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے جبتک کہ تیرا مبارک قدم اس زمین پر رہیگا۔ ایک غیر مستعمل مرگھٹ سے جنگلی جانوروں کو بھگا دیا گیا۔ جہاں انندا کی قیامگاہ تجویز ہوئی مہاراج نے اُسکو اپنا موجودہ لباس تبدیل کرنیکی اجازت نہ دی اُسکے بال پہلے ہی کافی بڑھ چکے تھے اور ناخن اتنے لمبے ہو گئے تھے جتنے کہ جوگیوں کے ہونے چاہئیں، ایک دن پھر اُسے راجہ کی طرف سے بُلاوا آیا۔ شاہی فرمان سے معلوم ہوتا تھا کہ مہاراج پر کسی نے جادو کر دیا مگر ان کو انندا پر پورا بھروسا تھا کہ کسی کا جادو اُسکے مقابلہ میں کارگر نہ ہو سکیگا۔ انندا نے اپنے ہتھیار سنبھالے۔ نہایت احتیاط سے ہڈی کو کھوپری سے ٹھکرایا لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ اب یہ طریقہ بھی اپنا اثر کھو چکا تھا کوئی مافوق الفطرت بات واقع نہ ہوئی۔ صرف ایک چمگادڑ اُڑتی ہوئی آئی اور نکل گئی انندا مایوس ہو چکا تھا۔ کہ ایک لمبی تڑنگی رنگین لباس میں ملبوس شکل دفعتہً اس طرح ظاہر ہوئی کہ گویا زمین سے نکل آئی ہے اجنبی نے کہا "کیا دیگ تیار ہے"

انندا نے پوچھا "کیسی دیگ"

جواب ملا "جس میں کہ تمہیں ابالنے کے لئے ڈالا جائیگا"

انندا نے کہا "ڈالا جائیگا؟ دیگ میں؟ کیوں؟"

"تمہارے منتروں نے چونکہ مہاراج ادھیراج کو ابتک کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور یقیناً شاہی خفگی کا شکار تم جیسے جعلسازہی کو بننا چاہیئے نہ کہ مجھ جیسے عالم طبیب کو جس کی موت سے علمی و عملی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ شاہی حکم نے ایک دیگ تمام رات اُبلتی رہیگی۔ تاکہ علی الصباح تمہیں اُس میں جھونک دیا جائے۔ بشرطیکہ مہاراج کو اس وقت تک تمہارے جادو سے آرام نہ ہو گیا"

انندا چلایا "آہ! پرماتما!! اب میں کس کنوئیں میں جاؤں؟"

حکیم نے جواب دیا۔ کہیں نہیں! اب تم کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتے چاروں طرف شاہی فوج کا پہرہ پہلے ہی متعین کر دیا گیا ہے"

متوحش بھکشو چلایا "تو پھر نجات کا راستہ کونسا ہے؟ کیا کوئی نہیں؟"

حکیم نے جواب دیا "اس پڑیا میں۔ یہ پڑیا زہر ہلاہل کی ہے حضور شاہی میں جاؤ۔ اور کہو کہ کارکنان قضاؤ قدر نے تمہیں یہ پڑیا عطا ہوئی ہے۔ راجہ اس کو زبان پر رکھتے ہی ہلاک ہو جائیگا اور اس کا وارث تمہیں عطائے شاہانہ سے محروم نہیں رکھیگا"

"دور! میرے سامنے سے بدترین مخلوق دور!!" یہ کہہ کر پڑیا کو زمین پر پھینک دیا۔ میں تیرا حکم ہرگز نہیں مان سکتا۔ بلکہ اب اپنے کو اپنے ہی گرُو کے حوالے کرتا ہوں۔ اوم۔ مانی۔ پدمی ہونگ، مگر اس کا کوئی اثر نہ ہونا تھا۔ نہ ہُوا۔ کوئی شکل نمودار نہ ہُوئی صرف وہی حکیم اب بھی وہاں کھڑا ہُوا تھا۔ مگر اب اُس کے چہرہ سے آثار رحم نمایاں تھے۔ انندا گومگو کی حالت میں بےحس و حرکت کھڑا رہا۔ بارہا اُس کو خیال آیا کہ حکیم سے پڑیا لے لے مگر اُس کی آواز نہ نکلتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گلے میں آکر اٹک جاتی ہے۔ حتّٰی کہ اس پریشانی اور دماغی اُلجھن نے اُس پر اتنا اثر کیا کہ وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اور گرتے ہی سو گیا۔

اب اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ پاٹلی پتر کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اگرچہ آج شہر میں تعطیل معلوم ہوتی تھی لیکن شہر بھر پر اُداسی چھائی ہُوئی تھی۔ کوئی انسان نظر نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ شیاطین کا ایک گروہ دروازوں کو گھیرے ہوئے تھا چراغاں کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نہایت خوشنما چراغوں کی دورویہ قطاریں پھول مالاؤں میں سجی ہُوئی دُور تک چلی گئی تھیں۔ ارواحِ خبیثہ خوشی کی حالت میں اِدھر اُدھر دوڑتی اُچھلتی بندروں کے مانند دُموں کو ہلاتی پھر رہی تھیں۔ حکومت کا کام شیاطین کے احکام کے ماتحت چل رہا تھا۔ عصائے حکومت اُنکے ہاتھوں میں تھا۔ جن کے سروں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں جنکے ساتھ وہ اپنے ماتحت شیاطین کو نافرمانی کی سزا دینے کے لئے جھلس دیتے تھے۔ انندا نے اس تمام تیاری کی وجہ پوچھی اسکو ایک شیطان سے جواب ملا۔

یہ تمام تیاری مقدس انندا کی تشریف آوری کے سلسلے میں کی جا رہی ہے جو کہ مہاتما بدھ کے ایک مبلغ ہیں اُن کا انتظار نہایت بےتابی اور شوق سے کیا جا رہا ہے۔ وہ چند ہی ساعت میں تشریف لانے والے ہیں" خوف زدہ انندا نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا "کیوں؟ انکے یہاں آنے کی وجہ؟" جواب ملا "زہر خورانی کی وجہ سے" وہ کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ اُسکی توجہ دوسری طرف منعطف ہو گئی جہاں دو شیطانوں کے درمیان سخت کشمکش جاری تھی۔ اور انہوں نے ایک دھما چوکڑی مچا رکھی تھی" کامرا غا؟" یقیناً ایک چلایا "دم برا نانا۔ البتہ" دوسرے نے کہا۔ انندا نے ایک شیطان سے جو قریب کھڑا تھا کہا "کیا میں ان الفاظ کی اصلیت معلوم کر سکتا ہوں؟"

"یہ دونوں طبقۂ نرگ کے ہیں۔ اول میں تو نرگی کو بھڑکتے ہُوئے شعلوں کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ اور کھانے کو پگھلا ہُوا سرمہ دیا جاتا ہے۔ طبقۂ دوم میں نرگی کو پگھلے ہُوئے سُرمہ کی ایک وسیع ندی میں پھینک دیا جاتا ہے اور آگ اُس کی خوراک ہوتی ہے۔ میرے ساتھی اس امر پر جھگڑ رہے ہیں کہ ہمارے آنے والے

معزز مہمان انندا کیلئے ان میں سے کونسا زیادہ مناسب اور موزوں ہے، انندا کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک تیز رَد ڈھنگنا شیطان نہایت تیزی سے آکر فریقین کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا بزرگو! کیا میں عرض کر سکتا ہوں؟ ہمارا مہمان انندا کسی کم رتبہ کا انسان نہیں۔ یہ خیال کرکے کہ مہاتما بدھ کا صرف وہی ایک مبلّغ ہے جو ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ میں عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ نہ تو کامراغا اور دُدم برانا کوئی بھی اُس کے لئے مخصوص نہ کیا جائے۔ بلکہ دو لاکھ چوالیس ہزار دوزخوں کی تمام طاقتوں کو یکجا جمع کرکے ایک نیا دوزخ خاص طور پر ہمارے قابلِ قدر مہمان کے لئے بنایا جائے"۔

دونوں پکار اُٹھے "یقیناً تیری رائے بالکل درست ہے"۔ یہ کہکر دونوں نئے دوزخ کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ انندا بڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسکا تمام جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔" افسوس! صد افسوس!! میں مبلّغ کیوں بنا؟ آہ پرماتما! آہ بدھ مہاتما!! صداقت کا راستہ کس قدر دشوار گزار ہے؟ انسان کتنا خطا کار ہے؟ طاقتِ روحانی پر غرور کس قدر فضول ہے؟"

ایک نہایت سریلی اور نرم آواز آئی "میرے دوست شکر ہے کہ آخر کار تم نے یہ محسوس کر لیا" انندا نے مڑ کر دیکھا تو مہاتما بدھ بذاتِ خود تشریف فرما تھے۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا دُور ہو گیا اور اُس نے اپنے روحانی جنم داتا کی شکل میں، پیکر نور، جوگی، اور حکیم تمام کو پہچان لیا۔" آہ! مہاتما! میں اب کہاں جاؤں میرا گناہ اس قابل نہیں کہ معاف ہو سکے"۔

"تمہاری نافرمانی اور جعلسازی یقیناً اُس قابل نہیں لیکن میں تمہیں یاد دلانے آیا ہوں کہ آج کے دن میرے تمام مبلّغ بندھیاچل پہاڑ پر جمع ہیں۔ اپنی اپنی کارکردگی کی روداد سنانے کے لئے آئے ہیں۔ میں صرف اب یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم اپنی روداد خود سنانے کے لئے تیار ہو یا تمہاری بجائے میں سناؤں؟"

انندا نے مستقل مزاجی سے کہا "میں خود اپنی بداعمالی کی داستان اپنی زبان سے سناؤں گا یہ مناسب ہے کہ میں اپنی بے وقوفی کا خمیازہ اس ذلت کی صورت میں خود بھگتوں"۔

"برخوردارِ من ہاں تو نے درست کہا۔ میں اسکے عوض میں تمہیں اِس مکروہ اور بدنما لباس کے اُتارنے کی اجازت دیتا ہوں۔ جو ایک جوگی ہی کے لئے موزوں ہے، اور اسکے علاوہ اپنے اجلاس میں زرد لباس پہن کر آنے کی بھی اجازت دیتا ہوں جو میرے مبلّغوں کا نشانِ امتیاز ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ میں اپنے اصول

کو بھی کسی حد تک تبدیل کئے دیتا ہوں۔ یعنی اتنا معجزہ خود دکھاؤنگا کہ تمہیں بندھیاچل پہاڑ پر فوراً پہنچا دوں۔ کیونکہ تمام مبلّغ پہلے ہی وہاں جمع ہیں ورنہ تمہارے لئے سخت خطرہ ہے۔ ممکن ہے کہ عوام تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کردیں، جو کہ اب میرے مذہب سے کلّی طور پر منحرف ہوچکے ہیں، تم غالباً ان شوریدہ سروں کی آوازیں سن رہے ہوگے؟ نئے راجہ یعنی تمہارے مرکزِ امید اور شاگردِ رشید کے اشارے سے یہ سب کچھ ہُوا کیونکہ بڈھے مہاراج اس دُنیائے فانی سے چل بسے ہیں، برہمنوں نے ان کو زہر دیا!"

"پرماتما! آقا!!" انندا نے روتے ہوئے کہا۔ "کیا میری تمام کارکردگی خاک میں مل گئی؟ کیا میری تمام محنت اکارت گئی؟ اور میری اپنی بے وقوفی سے"؟

"دغا اور فریب سے تعمیر کی ہُوئی عمارت کبھی پائدار نہیں ہوتی۔ جعل آخر جعل ہی ہے خواہ اسکے ذریعے سے صداقت ہی کی تبلیغ کیوں نہ ہو؟ لیکن اطمینان رکھو۔ تم میرے اصولوں کی تبلیغ آئندہ بہتر طریقہ پر کروگے اس وقت تم نے ایک دردناک خواب دیکھا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ اس وقت تک تم نے میرے اصول کی معنوی طور پر پیروی نہ کی تھی۔ اب تم میرے احکام پر سچّے دل سے عمل کروگے چونکہ عملی طور پر ابھی تک تم نے نافرمانی نہیں کی تمہارا قصور معاف ہے۔ جاؤ۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم نے کبھی کوئی معجزہ دکھایا تھا۔

حافظ سراج الدین خاں محمود

ترانۂ عشق

روشن تری ضیا سے مرا خاکداں بھی ہے
تُو جان بھی ہے اور تو ہی جانِ جاں بھی ہے

ہر پردہ اُس کے جلوے کا آئینہ دار ہے
جو ہم سے چھُپ رہا ہے وہ ہر سو عیاں بھی ہے

تیری بہارِ حسن ہے آرائشِ بہشت
تُو ہے تو ہمکو خواہشِ باغِ جناں بھی ہے

اِک دل ہے اور اُسکے لئے ہیں ہزار غم
تیری جفا بھی ہے ستمِ این و آں بھی ہے

کرتا نہیں مجھی سے وہ بے اعتنائیاں
اے جذبۂ وفا یہ ترا امتحاں بھی ہے

زنہار لے نہ عشق کا نام اے ہوس پرست
یہ زعم اور اُس پہ کاوشِ سود و زیاں بھی ہے

حامد علی خاں

جہاز راں ماموں

آمول سے پانچ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کے گرجا میں میرا باپ پادری کی خدمت پر مامور ہے۔ گرجا کے صحن سے متصل ہی ایک مکان میں پیدا ہوئی جو صرف پادری کے رہنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ سب سے پہلی چیز جسے میں یاد کر سکتی ہوں، میرے باپ کا اس کتبہ سے مجھے حروف تہجی کی تعلیم دینا ہے جو میری ماں کی قبر کے سرہانے ایستادہ تھا۔ اکثر اوقات میں اپنے باپ کے مطالعہ کے کمرہ کے بند دروازہ کو کھٹکھٹایا کرتی۔ اور مجھے یاد ہے میں اسکے جواب میں یہ جملے سُنا کرتی:۔ "کون ہے۔ میری بچّی تمہیں کیا چاہیئے؟ جاؤ اپنی اُمّی کے پاس۔" "جاؤ اور خوبصورت حروف پڑھنا سیکھو۔" دن میں کئی مرتبہ میرا باپ اپنے تمام کاغذات اور کتابوں کو چھوڑ چھاڑ کر میرے ساتھ اس مقام پر آتا اور کتبہ کے حروف، الفاظ اور انکے ہجے مجھے بتایا کرتا۔ اس طرح میری ماں کی قبر کا کتبہ میرا قاعدہ اور میری ہجوں کی کتاب تھی جس سے میں نے پہلے پہل پڑھنا سیکھا۔

ایک دن میں گرجا کے صحن کے سائبان کے نیچے ایک زینہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک شخص قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے مجھے بہ آواز بلند اُن حروف کو دُہراتے ہوئے سُنا جن سے میری ماں کا نام بنتا تھا۔ حروف کو دُہرا کر ایک پُر زور لہجے میں مَیں نے "الزبتھ ویلیئر" اس طرح کہا جیسے میں نے کسی اہم کام کو انجام دیا ہے۔ یہ شخص میرا ماموں جیمز تھا۔ وہ کسی جہاز پر لفٹنٹ کے عہدہ پر مامور تھا۔ میرے ماں باپ کے بیاہ کے چند ہی ہفتوں بعد وہ انگلستان سے روانہ ہو گیا تھا اور ایک طویل بحری سفر کے بعد وہ گھر واپس ہو کر میری ماں سے ملنے کے لئے آ رہا تھا۔ میری ماں کو مرے ہوئے اگرچہ ایک سال گزر چکا تھا لیکن اسکی موت یا اسکی بیماری کی کوئی خبر اسے مطلق نہ پہنچی تھی۔

جب میرے ماموں نے مجھے سائبان کے نیچے بیٹھے ہوئے دیکھا اور مجھ سے میری ماں کا نام سُنا تو محبت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور مجھ میں اپنی بہن کی کچھ شباہت پا کر اس نے خیال کیا کہ شاید میں اسی کی لڑکی ہوں۔ میں اس قدر اپنے کام میں غرق تھی کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکی اور اسی طرح ہجے کرتی رہی میرے ماموں نے کہا "اے ننھی لڑکی۔ اس عمدگی سے ہجے کرنا تمہیں کس نے سکھایا؟" میں نے جواب دیا "سامی جان نے" کیونکہ میں یہ سمجھتی تھی کہ میری ماں کی قبر کے سرہانے جو کتبہ ہے وہ اسی کی کارگزاری ہے

اور اسی نے مجھے پڑھنا سکھایا ہے۔ میرے ماموں نے پوچھا۔ "اور تمہاری ماں کون ہے؟" میں نے کہا "الزبتھ وہلیئر" اسکے بعد میرے ماموں نے محبت آمیز لہجہ میں کہا "میری چھوٹی پیاری بھانجی! آ تیری امّی جان کے پاس چلیں" یہ ارادہ کر کے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ میں اسے اپنے گھر کی طرف لے چلوں وہ بہت خوش تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے اور اس تصوّر کے ساتھ اسکی خوشی اور بھی بڑھ جاتی تھی کہ جب اسکی بہن اپنی چھوٹی بچی کو اپنے عرصۂ دراز کے گم شدہ جہاز راں ماموں کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لاتے دیکھیگی تو وہ مسرت خیز حیرت میں ڈوب ڈوب جائیگی۔

میں اسکو اپنی امّی جان کے پاس لے چلنے کے لئے راضی ہو گئی لیکن راستوں کے اختلاف کی بنا پر ہم دونوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ میرا ماموں چاہتا تھا کہ سڑک پر سے چلیں جو براہ راست ہمارے مکان کی رہنمائی کرتی تھی اور میں گرجا کے صحن کی طرف اشارہ کرتی تھی اور کہتی تھی کہ امّی جان کے پاس چلنے کا راستہ یہ ہے اس کا ہاتھ چھوڑ کر میں نے کہا "میں اس راستہ سے کبھی نہ جاؤنگی، تم راستہ نہیں جانتے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، یہ کہکر میں خاردار پودوں اور اونچی گھاس کو روندتی اور پست قبروں کو پھاندتی ہوئی اپنا راستہ جانے لگی۔ میرا ماموں میرے پیچھے آتے آتے کہنے لگا "یہ میری چھوٹی بھانجی بھی عجب بلا کی لڑکی ہے! اے لڑکی۔ میں تمہاری ماں کا مکان تمہارے پیدا ہونے کے پہلے سے جانتا ہوں، میں اسی طرح چلتی رہی، آخر کار اپنی ماں کی قبر پر آ کر ٹھہر گئی اور کتبہ کو دکھا کر تفاخر آمیز لہجہ میں کہا "لیجئے یہاں ہیں میری امّی جان" جیسے میں نے اسے قائل کر لیا ہے کہ راستہ میں ہی بخوبی جانتی ہوں۔ میں نے اسکے چہرے کی طرف دیکھا کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرے۔ لیکن آہ، میں نہیں کہہ سکتی کس قدر غمگین صورت میں نے اسکی دیکھی۔ میں اس وقت اس قدر ہراساں تھی کہ اسکے بعد جو کچھ ہوا اسکا مجھے بہت ہی دھندلا خیال ہے۔ مجھے یاد ہے میں نے اسکا کوٹ کھینچا۔ اسکو حرکت دینے کی کوشش کی اور اسکو پکارا "اجی حضت۔ اجی حضت" اب میں نہیں جانتی تھی کہ کیا کیا جائے۔ میرا دل عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اس شخص کو اپنی امّی جان کے پاس لانے میں مجھ سے بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے اور اسی وجہ سے وہ رنج و غم کی سرتاپا تصویر بن گیا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کیا تھا، میں کچھ نہیں کہہ سکتی؟ یہ مزار میرے لئے عرصہ سے مسرت کا ایک خوشنما منظر تھا۔ اکثر اوقات میرا باپ جب میری بک بک سے بیزار ہو جاتا تو مجھے یہاں بھیج دیتا یہاں مجھے پوری آزادی حاصل ہوتی تھی، میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ مقام میرے لئے من مانی خوشیوں اور کھیل کود کا بہترین اکھاڑا تھا۔ ہماری

اور امی جان کی ملاقاتیں کیا تھیں گویا فرحت و شادمانی کی نہایت خوشگوار گھڑیاں ہوتی تھیں۔ میرا باپ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ امی جان وہاں کس قدر آرام اور اطمینان کی نیند سو رہی ہیں، ایک دن میں اور تم بھی اسی قبر میں امی جان کے پہلو میں آرام سے سو جائینگے۔ جب کبھی میں سونے جاتی اور اپنا چھوٹا سا سر تکیہ پر رکھ دیتی تو میں یہ خیال کرنے لگتی کہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ قبر میں آرام کر رہی ہوں اور میں اپنے طفلانہ خواب میں بھی اپنے آپ کو وہیں دیکھا کرتی کہ وہ ایک مقام ہے نہایت ہموار، نہایت نرم اور نہایت سرسبز۔ البتہ میں اپنی امی جان کا چہرۂ زیبا کبھی نہ دیکھ سکی سوائے اسکے کہ قبر کا کتبہ تھا اور میرا باپ مسطح سرسبز زمین تھی اور میرے باپ کی آغوش میں پڑا ہؤا میرا سر۔

میرے ماموں نے کتنی دیر تک رنج کی تکلیف اٹھائی مجھے اسکی خبر نہیں۔ لیکن یہ معلوم ہوتا تھا، کہ وہ بہت دیر تک مبتلائے غم رہا۔ بالآخر اس نے مجھے اپنی گود میں لے لیا اور اس زور سے بھینچ کر لپٹا کہ میں رونے لگی اور دوڑی ہوئی اپنے باپ کے پاس گئی اور اس سے کہا کہ ایک شخص امی جان کے خوبصورت حروف کو دیکھ کر زار و قطار رو رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے باپ اور میرے ماموں کی یہ ملاقات بے انتہا درد انگیز تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسوقت سب سے پہلی مرتبہ میں نے اپنے باپ کو روتے دیکھا جسکا اثر مجھ پر پڑے بغیر نہ رہا میں باورچی خانہ میں اپنی ملازمہ سوسن کے پاس گئی اور اس سے اپنے باپ کے رونے کا ماجرا بیان کیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس روکنا چاہا، صرف اس خیال سے کہ مبادا میں انکی گفتگو میں مخل ہو جاؤں، لیکن میں اپنے باپ کے پاس کسی طرح پہنچ ہی گئی اور آہستہ سے اپنے باپ کی ٹانگوں کے درمیان رینگنے لگی میرے ماموں نے مجھے اپنی گود میں لینا چاہا لیکن میں پھرتی سے پلٹ کر اپنے ماموں کی نسبت ایک نفرت کا خیال دل میں لئے ہوئے اپنے باپ سے لپٹ گئی کہ یہی وہ شخص ہے جس نے آج میرے باپ کو رُلایا ہے۔

جب میں نے اپنے باپ کی زبانی اپنی ماں کی طویل بیماری، اسکی موت اور اس موت کی وجہ سے لاحق ہونے والی تکالیف کی پُر درد داستان سُنی تو مجھے معلوم ہؤا کہ میری ماں کی موت بھی کیسی زبردست مُصیبت تھی۔ میرے ماموں نے کہا کہ حقیقت میں یہ بات تمہارے لئے کس قدر غم انگیز ہے کہ تم صرف ایک شیرخوار بچی کے ساتھ اس دنیا میں رہ گئے۔ میرے باپ نے کہا کہ میری ننھی بیٹی میرے لئے مسرت

کا ایک سرچشمہ ہے ورنہ میں بہت جلد اس غم والم کی بدولت موت کا شکار ہو جاتا۔ یہ بات کہ میں اپنے باپ کیلئے کس طرح مسرت کا خزانہ بنی رہی میرے دل میں کھٹکنے لگی۔ مجھے اسکا علم ہے کہ جب کبھی وہ میرے ساتھ کھیلتا یا بات چیت کرتا تو میں بہت خوش ہوا کرتی تھی اور میں سمجھتی تھی کہ یہ امر محض میرے حال پر ایک قسم کی مہربانی ہے لیکن مجھے کبھی اس بات کا گمان بھی نہ ہوا کہ میرا وجود اسکی افزائش مسرت کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ رنج وغم جبکی مصیبتیں وہ جھیل چکا تھا اور جس کا علم مجھے ابھی ابھی ہوا تھا، میرے لئے بالکل نئی اور عجیب چیز تھا۔ رنج وغم کیسا! مجھے اس کا تصور بھی نہ ہوا کہ وہ کبھی ناخوش بھی رہا ہے۔ اسکی آواز ہمیشہ ملائم اور مسرت خیز رہی۔ اب سے پیشتر اسکو میں نے کبھی روتے نہیں دیکھا اور نہ رنج کی کچھ ایسی علامتیں ہی دیکھیں جن کے ذریعہ سے میں ہمیشہ اپنی معمولی تکلیفوں کا اظہار کرتی رہتی تھی۔ اگرچہ میرے خیالات ان معاملات میں بالکل طفلانہ تھے لیکن اس واقفیت کے بعد ہی سے میں اپنی مرحوم والدہ کی دردناک کہانی کے متعلق سوچ بچار کرنے لگی +

دوسرے دن میں حسب عادت مطالعہ کے کمرہ کے دروازہ پر گئی کہ ابا کو پیارے مزار پر چلنے کے لئے پکاروں لیکن میرے دماغ نے کام نہ دیا اور میں دروازہ کو نہ کھٹکھٹا سکی۔ میں باورچیخانہ اور دروازہ کے درمیان اِدھر اُدھر پھرتی رہی اور کچھ بھی نہ سمجھ سکی کہ اس وقت کیا کیا جائے۔ میرے ماموں نے مجھے اس طرح دیکھکر پوچھا "بیٹی! کیا تم میرے ساتھ باغ میں سیر کے لئے چلو گی"؟ میں نے انکار کیا کیونکہ جو کچھ میں چاہتی تھی وہ یہ نہ تھا میں قبر پر بیٹھکر ابا سے باتیں کرنے کا قدیم مشغلہ چاہتی تھی۔ میرے ماموں نے مجھے ترغیب دینے کی بہت کچھ کوشش کی لیکن پھر بھی میں انکار کرتی رہی اور روتے ہوئے باورچیخانہ کی طرف بھاگ گئی۔ جیسے ہی وہ وہاں میرے تعاقب میں آیا بسوسن نے کہا "آج یہ بچی کچھ ایسی چڑچڑی ہو گئی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ میرے ماموں نے کہا "افسوس کہ اس لڑکی کو بھائی جان محض اکلوتی ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار میں بگاڑ رہے ہیں۔ میرے باپ پر یہ ملامت مجھے غصہ میں لائے بغیر نہ رہی، کیونکہ میں اس بات کو ابھی بھولی نہ تھی کہ یہ میرا نووارد ماموں ہی تھا جس کی وجہ سے بلائے غم سب سے پہلی مرتبہ ہمارے گھرانے میں داخل ہوئی تھی۔ چنانچہ میں زور سے چیخی، یہانتک کہ میرا باپ یہ معلوم کرنیکے لئے کہ کیا معاملہ ہے باہر نکل آیا۔ اس نے میرے ماموں کو اپنی نشستگاہ پر یہ کہکر بھجوا دیا کہ جاؤ، میں اپنی چھوٹی فتنی کو آپ ہی سمجھ لونگا۔ اپنے ماموں کے جانے کے بعد میں نے رونا بند کر دیا لیکن میرا باپ میری بدمزاجی کی وجہ سے مجھے لکھر سُنانا بھی بھول گیا نہ اس نے واقعہ کی تحقیق کی۔ پھر ہم دونوں کتبۂ مزار کے پاس جا بیٹھے اس دن کوئی سبق بھی نہ ہوا، اور نہ سبزہ پوش گور میں سونے والی پیاری

امّی جان کے بارے میں کوئی گفتگو ہوئی کتبۂ قبر سے زمین پر کود پھاند بھی نہ ہوئی، نہ خوش طبعی کی باتیں ہوئیں اور نہ خوشگوار افسانوں کا سلسلہ چھڑا۔ میں اپنے باپ کی گود میں خاموش بیٹھے ہوئے اسکی صورت کو تکتی رہی اور سوچتی رہی کہ ابا کیسے غمگین نظر آتے ہیں۔ یہانتک کہ رونے کی تکان اور اس وقت کے خیالات کے ہجوم نے تھپک تھپک کر مجھے بہت جلد آرام کی نیند سُلا دیا۔

سوسن نے میرے ماموں کو بتایا کہ یہ مقام ہمارا ایک دائمی اڈا رہا ہے۔ اس نے اپنے آقا کی نسبت کہا کہ ”میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ جبتک کتبۂ مزار پر لڑکی کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہیگا میرا آقا اپنی بیوی کی موت کو کسی طرح نہیں بھول سکتا۔ کیونکہ اس بات سے گو اسکے غمگین دل کو ایک حد تک تسکین ہی کیوں نہ ہوتی ہو، لیکن اس سے ہمیشہ کیلئے اپنی بیوی کی یاد اسکے دماغ میں تازہ رہیگی“ میرے ماموں کے لئے اپنی بہن کی قبر کا یہ دردناک نظارہ ایک ایسا زبردست صدمہ تھا کہ اسکو سوسن کے سے خیالات ستانے لگے۔ اپنی دانست میں اس نتیجہ پر پہنچکر کہ اگر لڑکی کے پڑھنے لکھنے کے دوسرے ذرائع نکالے جائیں تو مزار کی روزانہ سیر کا کوئی موقع اور حیلہ نہ رہیگا۔ میرا بہی خواہ ماموں بڑی عجلت کے ساتھ شہر کے قریب بازار میں میرے لئے کچھ کتابیں خریدنے کے لئے چلا گیا۔

میں نے اپنے ماموں اور سوسن کے ان مشوروں کو سُنا اور ہماری مسرتوں میں ان کا دخیل ہونا مجھے مطلق پسند نہ آیا۔ جب میں نے اسکو اپنی ٹوپی لئے ہوئے باہر جاتے دیکھا تو دل ہی دل میں یہ سمجھنے لگی کہ وہ سمندر پار واپس جا رہا ہے جہاں سے وہ آیا تھا کیونکہ سوسن کی زبانی مجھے یہی معلوم ہوا تھا۔ سمندر پار کس مقام پر؟ مجھے کچھ معلوم نہ تھا لیکن اتنا ضرور سمجھتی تھی کہ وہ بڑی ہی دور واقع ہے میں گرجا کے صحن میں سائبان کے نیچے بیٹھ گئی اور سڑک کی طرف دیکھ کر سمجھتی رہی ”شاید میں اپنے ماموں کو پھر نہ دیکھوں“۔ اور خدا کرے کہ وہ پھر واپس نہ آئے ”میں یہ سب کچھ ترم لہجہ میں کہہ رہی تھی کیونکہ مجھے اس امر کا کسی قدر احساس تھا کہ میں اس وقت ضد اور بدمزاجی کے جذبات میں چُور تھی۔ میں اسی مقام پر بیٹھی رہی۔ یہانتک کہ میرا ماموں بازار سے کچھ چیزیں خرید کر واپس آ گیا۔ میں نے اسکو اپنی بغل میں گٹھا دبائے ہوئے تیزی کے ساتھ آتے دیکھا۔ مجھے اسکو دیکھ کر بہت افسوس بھی ہوا اور غصّہ بھی آیا اور میں نے جبراً غصیلی شکل بھی بنانیکی کوشش کی۔ اس نے اپنا گٹھا کھول کر کہا کہ ”بیٹی میں تمہارے لئے کیسی اچھی کتاب لایا ہوں۔ میں نے اسکی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا اور کہا ”مجھے کتاب کی ضرورت

نہیں"۔ لیکن اسکے ساتھ ہی میں کتاب کی طرف دوبارہ دیکھنے سے باز بھی نہ رہ سکی۔ اس نے نہایت پھُرتی کے ساتھ گٹھا کھولتے ہی کھولتے تمام کتابیں زمین پر پھیلا دیں تو میں نے دیکھا کہ دلفریب تصویریں اور خوشنما طلا کار جلدیں انتشار میں جگمگاتی پڑی ہیں۔ کیا کہوں، وہ بھی کیا دل خوش کُن نظارہ تھا، میرا تمام غصّہ اور غضب دفعتاً غائب ہو گیا اور میں نے اپنا سر اسکو پیار کرنیکے لئے اوپر اُٹھا دیا کیونکہ میں اپنے ابا کی کسی غیر معمولی نوازش پر شکریہ اسی طرح ادا کیا کرتی تھی +

اب میرا ماموں ایک نئی مشکل میں گرفتار نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے اس قدر عمدگی سے ہجے کرتے سُنا تھا کہ اسکے نزدیک سوائے اسکے کہ کتابیں میرے ہاتھ میں دے دی جائیں اور میں انہیں پڑھنے لگوں، کوئی اور دقت ہی درپیش نہ تھی۔ تاہم میں صرف انہیں حروف کے ہجے کرتی تھی، جن سے میں آشنا تھی اور جو میرے دماغ کے مختصر سے کتبخانہ میں محفوظ تھے۔ یہ حروف کچھ عجیب ہی وضع کے تھے۔ جنہیں میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ نیک طینت جہازران اس مشکل سے پست ہمت نہ ہُوا۔ بلکہ ایک استاد کا فرض انجام دیتے ہُوئے ان تھک کوشش اور استقامت کے ساتھ اس نے مجھے وہ تمام چھوٹے حروف پڑھا دیئے۔ جب کبھی میں اور ابا بازار کی گلگشت کے لئے اسے مستعد دکھائی دیتے۔ وہ کسی دلچسپ تفریح کی تجویز پیش کر دیتا۔ اگر ابا یہ کہدیتے کہ اس چھوٹی بچی کے لئے اس قدر دور چلنا دشوار ہے تو وہ بہت جلد مجھے اپنے کندھوں پر بٹھا کر یہ کہدیتا" تو پھر بٹسی سواری کریگی"۔ اس طریقہ سے میرا ماموں مجھے اکثر میلوں لیجایا کرتا +

یوں تو ہر روز عموماً اور ان مسرت بخش تفریحوں میں خصوصاً میرا ماموں سوسن سے کچھ نہ کچھ کھانیکی چیزیں تیار کراتا جو میرے اور ابا کیلئے ایک عرصہ تک حیرت کا سبب بنی رہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ ہم درختوں کے کسی سایہ دار کنج میں بیٹھے ہُوئے ہوں، وہ اپنی جیب سے اس چھوٹی سی پونجی کو نکالکر سب میں تقسیم کر دیتا۔ اسکے بعد میں اس کی دوسری جیب کو جھانک کر دیکھتی کہ کہیں اس میں آتشِ سیال اور خاصکر میرے لئے پانی کا چھوٹا سا شیشہ تو نہیں! لیکن اگر اتفاق سے وہ پانی لانا بھول جاتا تو دوسری ستم ظریفی یہ ہوتی کہ اس غریب بٹسی کو مجبوراً انگوری شراب کے چند قطروں سے لذت آشنا ہونا پڑتا۔

یہ میرے قطعی طفلانہ خیالات ہیں۔ کاش بجائے اسکے کہ میں اپنی اس احمقانہ کہانی کو یاد رکھتی، میرے ماموں کی برّی و بحری سیاحتوں کے وہ دلفریب قصّے ہمیشہ کے لئے میرے لوحِ دماغ پر ثبت

ہو جاتے جن کو وہ اکثر سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھاتے وقت بیان کیا کرتا تھا۔
میرے لئے میرے ماموں کی یہ طولانی صحبت میری زندگانی کا ایک ایسا اہم ترین واقعہ تھا کہ مجھے ڈر ہے کہ اسکا بار بار اور متواتر ذکر کرکے میں ناظرین کو تھکا نہ دوں۔ لیکن اسکی مفارقت کے ساتھ ہی، اے حضرات یہ یاد رکھیئے، میری بقیہ کہانی کا بھی بہت جلد خاتمہ ہوا جاتا ہے۔

موسم گرما کے مہینے گزر گئے لیکن اپنی دھیمی رفتار کے ساتھ ——— وہ دلفریب اور خوشگوار تفریحیں اور اپنے ماموں کی مہمات کی وہ دلچسپ داستانیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے، برسوں کے معاملات ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، موسم سرما کا استقبال میرے لئے ایک گرم کوٹ خرید کر کیا گیا تھا اور میں اس وقت کس قدر غرور کے نشہ میں چور تھی جبکہ میں نے اسے پہنا! مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ مجھے "رُوڈ رائیڈنگ ہُڈ" کہہ کر پکارتا، اور کہتا کہ ذرا بھیڑیوں سے خبردار رہنا۔ اس فقرہ پر میں ہنس کر یہ کہتی کہ "بھیڑیئے یہاں کہاں"؟ اسکے ساتھ ہی وہ اپنے سفر کی داستان شروع کر دیتا کہ "رابنسن کروسو" کے جزیرہ کی طرح ایک غیر آباد سرزمین میں شیر ببر اور ریچھ اور بھیڑیئے سے وہ کس طرح دوچار ہوا تھا۔ آہ! کیا بتاؤں! وہ بھی کیا مسرت خیز دن تھے۔

موسم سرما میں ہماری تفریحیں بہت کم اور مختصر ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانہ میں میرا مشغلۂ خاص کتابیں تھیں۔ اگرچہ اکثر اوقات پڑھنے لکھنے کے دوران میں کھیل کود بھی ہوا کرتی تھی جس میں عموماً میرا ساتھی میرا ماموں ہوتا اور انجام کار ہم میں جھگڑا ہوتا کیونکہ میرے ماموں کے کھیل کا طرز سپاہیانہ واقع ہوا تھا۔ تاہم مجھے اپنے ماموں سے انتہائی محبت تھی کیونکہ جس قدر بھی میں نے ترقی کی تھی وہ صرف اسی کی عنایت و تربیت کا نتیجہ تھی۔ اب میں نہایت عمدگی سے پڑھنے لکھنے لگی تھی اور اپنے ابا۔ اور ماموں کی گفتگو اور بحث و مباحث کو متواتر سُنتے سُنتے سمجھ بوجھ میں بڑی عورتوں کی ہمسری کرنے لگی تھی۔ شاید اسی مفہوم کو ابا نے میرے ماموں سے خطاب کرکے یوں ادا کیا تھا کہ "جیمز، تم نے اس چھوٹی بچی کو قطعاً ایک قابل رفاقت ہستی بنا دیا ہے"۔

اکثر میرا باپ اپنے وعظوں کے لکھنے، بیماروں کی عیادت اور غریب ہمسایوں کو مشورہ دینے کی مصروفیتوں میں، مجھے ماموں کے ساتھ تنہا چھوڑ دیتا تو وہ میرے ساتھ طویل مباحث میں مشغول ہو جاتا اور عموماً یہ کہا کرتا کہ دیکھیں، میرے جانیکے بعد تم کس طرح اپنے باپ کو خوش رکھتی اور خود کو ترقی

کے مدارجِ اعلیٰ پر پہنچاتی ہو۔ اب میں ذرا صحیح طور پر سمجھنے لگی کہ کیوں اس نے آبا کو میری ماں کے مزار کی زیارت سے باز رکھنے کے لئے اس قدر مصیبتیں جھیلیں، وہ مزار جسکو میں پہلے سب سے چھپ چھپ کر دیکھا کرتی تھی اب میری نظر کے سامنے خوف و تقدس کا ایک قابلِ احترام مجسمہ تھا۔ کیونکہ میرا ماموں میری ماں کے متعلق کہا کرتا تھا کہ وہ عجیب خوبیوں کی عورت تھی اور اسی بناء پر میں خیال کرنے لگی کہ حقیقتاً وہ میری ماں ہوگی جسے میں پہلے اپنی اس زندگی سے بے تعلق ایک خیالی چیز سمجھتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا منیر ہاؤس کی وہ عورتیں بھی جنہیں گرجا میں ایک قابلِ عزت جگہ ملتی تھی ایسی مقدس نہیں ہیں اور گاؤں کی شریف اور بہترین مستورات اس قدر اچھی اور نیک نہیں ہیں، جیسی تمہاری پیاری اماں جان تھیں۔ اگر وہ اس وقت زندہ ہوتیں تو مجھ جیسا غیر مہذب ملّاح تمہارے لئے تھوڑی بہت تعلیم کا آلہ نہ بنتا، یا سینے پرونے اور سوزن کاری میں تم کبھی سوسن کی منت پذیر نہ ہوتیں بلکہ وہ خود تمہیں تمام مرغوب نسوانی ہنروں کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کی تربیت دیتیں اور تمہارے لئے انتخابِ کتب کا فرض بھی جس کے لئے میں قطعاً نا اہل ہوں، وہ اس خوبی اور مناسبت کے ساتھ انجام دیتیں کہ اس سے تمہارے دماغ کی اعلیٰ تربیت ہوتی۔ اگر مجھے اپنی زندگی میں کسی وقت بھی برائی بھلائی میں تمیز کرنے اور موزوں نسوانی خصائل کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے تو میں سمجھونگی کہ یہ صرف اسی ناتربیت یافتہ دہقانی ماموں کی درس و تدریس اور تربیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اسکے اس قول نے کہ اگر میری ماں ہوتی تو وہ مجھے کیا سے کیا بنا دیتی مجھے یہ سکھایا کہ مجھے کیا ہونا چاہئیے۔ میرے ماموں کے ہم سے جدا ہو جانیکے بعد جب میری منیر ہاؤس کی مقدس عورتوں کے ساتھ معرفی کرائی گئی تو بجائے اسکے کہ ناشائستہ دیہاتیوں کی طرح انہیں دیکھ کر بغلیں جھانکنے لگوں (کیونکہ میں اپنے ماموں کے آنے سے پیشتر ایسا ہی کیا کرتی تھی) میں نے بڑی سہولت، سنجیدگی اور شرافت کے ساتھ ان سے گفتگو کی، یہ اس لئے کہ میری ماں کی گفتگو کا طریقہ میرے ماموں کی روایت کے مطابق بالکل یہی تھا۔ میں نے انکے خوبصورت چہروں کو غور کی نظر سے دیکھا اور اندازہ کرنے لگی کہ میری ماں کیسی عجیب عورت ہوگی جبکہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان عورتوں سے زیادہ خوبصورت اور مقدس تھی اور جب میں نے انہیں میرے باپ کو میرے پسندیدہ اطوار و سلوک پر مبارکباد دیتے ہوئے دیکھا اور یہ سُنا کہ "کیسی اچھی تربیت اس لڑکی کی تم نے کی ہے" تو میں نے خیال کیا کہ اگر میں ایک نیک لڑکی ہوں تو یہ بات، آبا کے نہیں بلکہ میرے ماموں کے حسنِ تربیت کا نتیجہ ہے جس نے مجھے اُمی جان کی طرح اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی تھی۔ اب میں اپنے ماموں کو ایسا نامہذب اور ناشائستہ نہیں خیال کرسکتی تھی

جیسا وہ خود اپنے آپ کو سمجھتا تھا، کیونکہ اسکے تمام اسباق میرے لئے ایسے اچھے اور موثر ثابت ہوئے کہ میں انہیں کبھی بھول نہیں سکتی اور توقع ہے کہ زندگی بھر وہ مجھے فائدہ پہنچاتے رہینگے۔ وہ اکثر ان الفاظ کی تشریح میرے سامنے کرتا جنہیں وہ استعمال کیا کرتا تھا جیسے دلکشی، حلم، لطافت و نزاکت، وہم اور ظاہرداری وغیرہ اسکے ساتھ وہ اپنے مطلب کو ان عورتوں اور انکی نوعمر لڑکیوں کی مثالیں دیکر واضح کر دیتا تھا جو ہمارے گرجا کو آیا کرتی تھیں۔ کیونکہ میرا باپ ایسا اچھا وعظ کیا کرتا تھا کہ "ٹینر ہاؤس" کی عورتوں کے علاوہ ہمسایہ کی تمام عورتیں گرجا میں جمع ہو جاتی تھیں۔

شاید موسم بہار کی ابتدا ہو جب میرا ماموں مجھ سے جدا ہوا۔ کیونکہ باغ میں کروکوس ابھی ابھی کھلنے لگے تھے۔ اور نوخیز باڑ کی قطاروں کے اندر سے بسنتی گلاب کے پھول بھی تاک جھانک کر رہے تھے۔ جب میں نے آخری مرتبہ اسکو سڑک پر سے جاتے ہوئے دیکھا تو میں اس قدر روئی جیسے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ میرے باپ نے شہر کے بڑے بازار تک اسکا ساتھ دیا جہاں سے وہ گاڑی میں لندن روانہ ہو گیا۔ میں نہیں کہہ سکتی، سوسن نے مجھے دلاسا دینے اور آرام پہنچانے میں کس قدر تکلیف اُٹھائی۔ اب مجھے اس سائبان کا تصور بندھا جہاں سب سے پہلی دفعہ میں نے اپنے ماموں کو دیکھا تھا۔ میں نے وہاں جاکر بیٹھنے اور اس دن کی یاد کو تازہ کرنیکا ارادہ کیا لیکن میں وہاں بیٹھنے بھی نہ پائی۔ کہ مجھے یاد آیا میں نے کس احمقانہ طریقے سے اسے اپنی ماں کی قبر پر لیجاکر رنج و غم کے مہیب غار میں اتارا تھا۔ اور پھر میری یہ کیسی عجیب شرارت تھی کہ اسی سائبان میں بیٹھ کر میں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ، جو میرے واسطے اس قدر دور کتابیں خریدنے کے لئے گیا ہے، دوبارہ واپس نہ آنے پائے۔ اور وہ تمام چھوٹے چھوٹے جھگڑے جو اسکے ساتھ ہُوا کرتے تھے، اب جبکہ میں دوبارہ اسکے ساتھ کھیل نہیں سکتی تھی، حقیقت یہ ہے کہ میرے دماغ میں آآ کر میرے دل کو زخمی کئے دیتے ہیں۔ الغرض ان قابلِ نفرین افعال کے تکلیف دہ تصور کے بعد ان سے نجات حاصل کرنیکے لئے میں سوسن کے پاس گھر میں دوڑی چلی گئی۔

اسکے کچھ دنوں بعد ایک مرتبہ سرِ شام میں اپنے باپ کے ساتھ آگ سینکنے کے لئے بیٹھی تھی۔ اندھیرا ہو جانیکے بعد اور شمع جلنے کے پہلے میں نے اپنے باپ کو اپنے دل کی وہ دُکھ بھری کہانی سنانی شروع کی جسے گرجا کے سائبان میں بیٹھ کر یاد کیا تھا کہ کس طرح میں اپنے ماموں پر جبکہ وہ پہلے پہل یہاں آیا تھا نامہربان

رہی' اور اسکے ساتھ اپنی لڑائیوں کو یاد کرکے کس طرح رنج وغم کی مصیبت میں مبتلا رہی ۔

یہ سُن کر میرے باپ کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ نمودار ہُوئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "اے ننھی نادم لڑکی! سُن، میں اسکے متعلق تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں' جب ہم سے جدا ہوجاتے ہیں' تو ہم بالکل اسی طرح محسوس کیا کرتے ہیں۔ جب ہمارے پیارے احباب ہمارے ساتھ ہوتے ہیں تو ہم انکی صحبتوں سے اس طرح لطف اندوز ہوتے ہیں کہ اس باہمی میل جول سے پیدا ہونیوالی برکتوں کا تصوّر تک دماغ میں نہیں آتا اور نہ ہم اپنے روزانہ اعمال ہی کی جانچ پڑتال کچھ خوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم اپنی مہربانیوں اور نارضامندیوں کی حالت میں انہیں حصہ دار بننے کا آزادی سے موقع دیتے ہیں۔ اور اگر چھوٹی چھوٹی ناچاقیاں ہماری دوستی میں انتشار پیدا کردیتی ہیں تو وہی آگے چلکر حالتِ مسرت میں ایکدوسرے کو محبوب سے محبوب تر بنادیتی ہیں۔ لیکن جب ہماری محبت کا کعبۂ مقصود ہمیشہ کیلئے ہم سے چھین لیا جاتا ہے تو یہی چیزیں تکلیف دہ خطائیں بنکر ہم پر مسلّط ہوجاتی ہیں' مجھ میں اور تمہاری والدہ میں کبھی جھگڑے نہیں ہوئے تاہم میری غمگین تنہائی کے ابتدائی ایّام میں کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں آئے کہ کاش میں انہیں ہر ممکن طریق پر خوش رکھ سکتا۔ تمہارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے میری پیاری بچّی، تمہارا ماموں خلوص کے ساتھ تم سے محبت کرتا تھا تم نے اسکو خوش رکھنے کیلئے وہی کیا جسکی ایک بچّہ سے توقع ہوسکتی ہے' یہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو اسوقت تمہارے نازک دماغ کو منتشر کررہی ہیں' تمہارے ماموں کو مسرت کے ساتھ یاد آئینگی۔ اُس آخری تفریح میں جسے تم نے بڑے افسوس اور حسرت کی نظر سے دیکھا تھا۔ اُس نے مجھ سے اُن دقتوں کا بیان کیا ہے جو تمہیں اپنے ساتھ مانوس کرنے میں اسے پہلے پہل پیش آئیں۔ اب جبکہ وہ ہم سے بہت دُور ہے، یہی چیزیں اسے یاد آکر اسکے لئے شادمانی کا باعث ہوجائینگی۔ اس بے بنیاد رنج کو اپنے دل سے نکالدو۔ البتہ یہ سبق تمہارے لئے کافی ہے کہ اپنے محبت کرنیوالوں پر ہر ممکن طریقہ سے مہربان رہو۔ اور یہ یاد رکھو کہ اسکے باوجود جب یہ تم سے جدا ہوجائینگے تو تمہیں یہی خیال ہوگا کہ انکے ساتھ تم نے پوری محبت نہیں کی۔ ایسے احساسات جو تم نے ابھی بیان کئے ہیں' انسانیت کا مشترک حصّہ ہیں' اسی طرح تم محسوس کروگی جب میں مرجاؤنگا اور یونہی تمہارے بعد تمہارے بچّے محسوس کرینگے۔ لیکن بٹسی تمہارا ماموں پھر واپس آئیگا اور اب ہم غور کرینگے کہ باتونی طوطے کیلئے جسے وہ ہمارے گھر لانیوالا ہے پنجرہ کا کس طرح انتظام کریں۔ اچھا بٹسی! اور اسوسن سے کہنا کہ وہ شمعدان لائے اور اس سے یہ بھی پوچھنا کہ لذیذ کیک جسکے لئے اس نے چاد کے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، پک چکا ہے یا نہیں؟ ۔

(ترجمہ)

احمد عارف (حیدرآبادی)

وجدانیات

آپکے جلوے ہیں عنوانِ خیال | پھول سے ہیں زیبِ دامانِ خیال
اے خیالِ دوست اے جانِ خیال | تجھ سے روشن ہے شبستانِ خیال
آہ وہ بھولا ہُوا عہدِ وصال | آہ وہ خوابِ پریشانِ خیال
آہ وہ مہ طلعتوں سے اُلفتیں | وہ بہارِ انجمستانِ خیال
شعلہ ہائے عاشقی قائم رہیں | دِل ہے اِک بزمِ چراغانِ خیال
عشق اِک رنگِ خط و خالِ جنوں | حُسن اِک تصویرِ عُریانِ خیال
خوب تھی اِن کے تصوّر کی بہار | خوب تھا نقشِ گُل افشانِ خیال
تمکو ظُلمت ہائے غم کی کیا خبر | تم کہ ہو مہرِ درخشانِ خیال

وہ دِلِ دیوانۂ عابدؔ کے رنگ
آہ! وہ اقلیمِ ویرانِ خیال

عابدؔ

حیاتِ اجتماعی اور علوم عمرانی[1]

یوں تو یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ انسان کی زندگی کیلئے تنہا اُسی کا وجود کافی نہیں اور نہ یہ ممکن ہے۔ کہ ایک فرد سب سے الگ تھلگ بے یار و مددگار زندگی بسر کر سکے اور کسی گوشۂ تنہائی میں رہ کر زندگی کے دن کاٹ دے لیکن زمانۂ موجودہ کی علمی اور عملی جدوجہد نے تو اسکو اور بھی زیادہ ناممکن العمل بنا دیا ہے زمانۂ قدیم میں عیسائیوں کے بڑے بڑے پیشوا مدت العمر نامعلوم اور پُر وحشت بیابانوں میں رہ کر کسی نہ کسی طرح زندگی گذار دیتے تھے لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب دُنیا کی آنکھوں نے تہذیب کی یہ چہل پہل نہ دیکھی تھی اور انسان دَورِ جدید کی ان حیرت انگیز طلسم کاریوں سے روشناس نہ ہُوا تھا جن کی حقیقت ہمارے لئے معمولی اور ناقابلِ التفات اشیا سے زیادہ نہیں۔

آج صوفیہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ گوشہ نشینی کے پابند ہیں اور اسی کی تلقین کرتے ہیں لیکن یہ گوشہ نشینی اور تنہائی ایسی نہیں جو ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کے مردم بیزار پادریوں نے اختیار کر رکھی تھی بلکہ دراصل یہ ایک عارضی تنہائی ہے اور اسکی تلقین محض اُن عوارض کے ازالہ کے لئے کی جاتی ہے جو عرصہ تک محض دنیاوی فوائد کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنے سے پیدا ہو جاتے ہیں اور اسی لئے نہ وہ مذہب کے خلاف ہے اور نہ سوسائٹی کا گناہ ہے۔

الغرض اس میں تو شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ اجتماعی زندگی حیاتِ انسانی کا غیر منفک لازمہ ہے بلکہ ارسطو انسان کو "سیاسی حیوان" کہہ کر حیوان و انسان کا مابہ الامتیاز انسانی زندگی کے اسی اجتماعی پہلو کو قرار دیتا ہے۔ اقبال نے بھی اسی حقیقت کو پیشِ نظر رکھکر کہا ہے

فرد قائم ربط ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہ ظاہر ہے کہ نہایت قدیم زمانہ میں بھی کوئی شخص تنہائی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ ایک جنگلی اور وحشی انسان کو بھی کھانے کے لئے درختوں کے پھل توڑنا پڑتے تھے اور تن ڈھکنے کے لئے پتّے

---

[1] Social Science کا ترجمہ ہے یعنی وہ علوم جو انسان کی اجتماعی زندگی کے مسائل سے بحث کرتے ہوں۔

استعمال کرنا پڑتے تھے لیکن اس مقابلتہً ابتدائی درجہ کی زندگی تک پہنچنے کے لئے بھی محض کسی ایک شخص کی کوششیں بارآور نہ ہوسکتی تھیں۔ تاوقتیکہ اس جنگلی کو بھی بچپن میں جب وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ تھا دودھ نہ پلایا جاتا اور دوسرے اسے مدد نہ دیتے وہ کیسے خود بخود بڑے سے بڑا قوی ہیکل انسان ہوسکتا تھا؟ بلکہ اسکے بعد اُس زمانہ پر نظر کیجئے جب انسان تمدن کے ابتدائی منازل طے کرکے ترقی کے ایک نئے دَور میں قدم رکھ چکا تھا اور کھیتی باڑی کرکے اپنے لئے معاش مہیا کرتا تھا تو معلوم ہوگا کہ جبتک وقت تک ایک کاشتکار ہل بیل نہ خریدتا کاشت تقریباً ناممکن تھی لامحالہ لوہار سے مدد درکار تھی لوہار کو اپنی دھونکنی بنانیکے لئے بڑھئی اور چمار کی ضرورت تھی اسی طرح یہ لاتناہی سلسلہ چلا ہی جاتا ہے اور زندگی کی اس کل کے یہ تمام پُرزے جنہیں ہم افراد کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اپنا اپنا کام کرتے نظر آتے ہیں۔

جب انسان اس منزل کو بھی طے کرلیتا ہے تو اُسے ایک وسیع تر فضا میں قدم رکھنا پڑتا ہے اور بین الموضوعی تعامل (مل کر کسی کام کو انجام دینا) کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک شہری کے ضروریات کو بہم پہنچانے کیلئے متعدد افراد درکار ہوتے ہیں اسی طرح ایک شہر دوسرے شہر کا اور ایک ملک دوسرے ملک کا محتاج نظر آتا ہے ۔

خوش قسمتی سے ہمیں اس وقت تاریخ انسانی کے ایک نہایت ہی ترقی یافتہ دور سے بحث ہے جب مختلف ممالک کے درمیان تعاون و تعامل کے رشتے اس حد تک مضبوط ہوچکے ہیں کہ ایک ملک کے خورد و نوش کی اشیا بھی دوسرے ہی ملک سے فراہم کی جاتی ہیں، دور کیوں جائیں خود برطانیہ عظمیٰ کو لیجئے کہ اگر آج ہندوستانی غلہ کی کوٹھڑی کا دروازہ بند کردیا جائے تو انگلستان میں عام طور سے ایسٹ کا رز لندن کا سماں نظر آنے لگے لیکن قابلِ غور امر تو یہ ہے کہ اس خورد و نوش کے ضروری سامان کے عوض گنتی کے چند سگرٹ کیسوں اور ٹائی کالر اور رومال کے چند ڈبوں سے زائد کچھ وصول نہیں ہوتا ۔

اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ تمدنی ترقی کا انتہائے کمال یہ ہے کہ آپس کے رشتوں کو اس قدر وسعت دی جائے اور ایک ملک دوسرے ملک کا اس طرح محتاج ہوجائے کہ ایک کا دوسرے سے علیحدہ رہنا ممکن ہی نہ رہے ۔

موجودہ صورتِ حال جو زیر غور ہے وہ اُس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جو امن و امان کا عہد خیال کیا جاتا ہے اور جہاں ایک شخص دوسرے کی آزادی میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ یہ آخری

خیال بہت بڑی حد تک صحیح ہو لیکن دراصل سلبِ آزادی میں بھی اب اجتماعی پہلو ہی زیادہ پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اور اسی اجتماعی زندگی کی کرشمہ سازیاں گولے بارود ہوائی جہاز فولادی موٹر (ٹینک) اور فوجی جہازوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر کسی ملک کی احتیاجات زیادہ بڑھ جاتی ہیں اور خدانخواستہ انکی تشفی میں ذرّہ برابر بھی دقّت محسوس ہوتی ہے تو فوراً ہمسایہ ملک پر دست درازی کی سوجھتی ہے۔ چنانچہ اگر گزشتہ جنگِ عظیم کے اسباب پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اسکی تہ میں بھی وہی اثرات کام کر رہے تھے جو یقیناً اجتماعی زندگی کی پیچیدگیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں میں معاشی اسباب بھی شامل ہیں سیاسی اور مذہبی وجوہ بھی داخل ہیں۔ جرمنی کی ہوسِ ملک گیری محض اسی لئے روز افزوں ترقی پذیر تھی کہ اُسکے سامنے اپنے ہمسایوں کے ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے اور وہ ان سب کی پیداوار کو خود ہڑپ کر جانے کے لئے تیار تھا۔ ادھر اتحادِ ثلاثہ نے اس آگ میں اسی لئے قدم رکھا کہ ایک ملک اور ایک ہی سلطنت کو اتنی طاقت حاصل ہونے نہ پائے کہ جو معاشی سیاسی اور مذہبی اقتدار حاصل کرکے سب کا گلا گھونٹ دے۔

الغرض موجودہ زمانے میں جتنی جنگیں۔ اصلاحات و معاہدات وغیرہ پیش آتے ہیں وہ سب اسی ایک اجتماعی زندگی کے گوناگوں اثرات اور ناگزیر نتائج ہیں۔ لہذا ظاہر ہے کہ اُن علوم کا مدون ہونا بھی نہایت ضروری تھا جن میں وہ اصول درج ہوں جن پر کاربند ہو کر اس حالت میں زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔

ان تمام علوم کو اگرچہ صرف ایک علم کے تحت رکھا گیا ہے جس کو Sociology تمدنیات و عمرانیات کا نام دیا جاتا ہے تاہم اس علم میں جو شاخیں پیدا ہو گئی ہیں وہ از خود عظیم الشان علوم کی شکلیں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ منجملہ اُنکے معاشیات[1] سیاسیات[2] نفسیات[3] بھی ہیں جنکا مطالعہ آج بنی نوع انسان کے لئے اُسی قدر ضروری ہے جتنا کہ علم طب کا، کیونکہ اگر علم طب کی غرض و غائت یہ ہے کہ جسم انسانی کو صحیح و تندرست کر سکے اور حیاتِ انسانی میں ترقی دے سکے تو ان علوم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی جو اب انفرادی نہیں بلکہ اپنی انتہائی وسعتِ معنی میں اجتماعی ہو گئی ہے اُسے برقرار رکھ سکے۔

---

[1] Economics [2] Political Science [3] Psychology

یہاں معاشیات کے متعلق چند باتیں کہنا ہیں اول تو یہ کہ اس علم کا ارتقا ابھی ہو رہا ہے اور معلوم نہیں اسکی تکمیل کیلئے کتنی صدیاں درکار ہونگی اور آیا وہ زمانہ کبھی آئیگا بھی یا نہیں جب یہ علم حدِکمال کو پہنچ گیا ہو بہرحال موجودہ زمانہ میں جب آپس کے تعلقات پیچیدہ ہوتے چلے جاتے ہیں اس علم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے کیونکہ یہ براہ راست حیاتِ انسانی اور اُسکے لوازم سے بحث کرتا ہے، انسان کیلئے زندگی برقرار رکھنے کے اُن وسائل کی تلاش سب سے زیادہ ضروری ہے جو اس عظیم الشان کشمکش کے زمانہ میں دراصل اس علم کے باقاعدہ یا بے قاعدہ مطالعہ کے بغیر ناقابلِ حصول ہیں ۔

بے قاعدہ کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا کہ گو اس وقت معاشیات نے ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر لی ہے اور بڑے بڑے کتبخانے اسکے ذخیرہ سے پُرنظر آتے ہیں تاہم بمبئی کے سیٹھ اور سواحل ہند کی تجارت پیشہ اقوام جو آج کاروباری دنیا میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں غالباً اُن میں سے ۹۹ فیصدی ایسے افراد ہونگے جنہوں نے اس علم کا شاید نام بھی مشکل سے سُنا ہو گا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے کاروبار میں اُسی عمدہ طریق سے کامیاب ہو رہے ہیں جس طرح ایک معاشیات کا جاننے والا کامیاب ہو سکتا ہے ۔

اسکی وضاحت و توجیہ کیلئے یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ تقریباً ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اپنی صحت کو کیسے برقرار رکھے وہ رات کو سرد ہوا میں برہنہ جسم اسلئے نہیں نکلتا کہ سردی سے اکڑ جائیگا۔ دھوپ میں جسم کی حفاظت اسلئے کرتا ہے کہ بخار سے محفوظ رہے تاہم جب کسی بیماری سے سابقہ پڑتا ہے تو اپنے روزمرہ کے قائم کئے ہوئے اصولِ حفظانِ صحت کو طاق پر رکھ کر حکیم صاحب ہی کے دروازے پر دم لیتا ہے اسلئے کہ طبیب اُن امراض کے علاج سے واقف ہے جو انسان پر نازل ہُوا کرتے ہیں۔ بس یہی کیفیت ایک عالم معاشیات کی ہے جس وقت کاروباری مسائل میں پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتی ہیں معاشیات کی قدر نہیں ہوتی لیکن جب اس قسم کی گتھیاں پڑ جاتی ہیں تو عالم معاشیات کی آستاں بوسی کے سوا چارہ نہیں رہتا ۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جہاں مسائل میں پیچیدگیاں پڑ جاتی ہیں وہاں تدوینِ اصول کی جانب سب کی نگاہیں اُٹھ جاتی ہیں اور یہی اصول رفتہ رفتہ عظیم الشان علوم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ جب اجتماعی زندگی انسان کیلئے ضروری ہے اور اسکے ارتقا میں پیچیدگیوں کا پیدا ہونا لازمی تو ان پیچیدگیوں کے رفع کرنیکے لئے تدوینِ اصول بھی لازمی ہے اور یہی اصول جنکا مجموعہ علم کہلاتا ہے ہر اُس مرد کے مطالعہ کیلئے ضروری ہیں جو اس اجتماعی زندگی کی عظیم الشان کشمکش میں ایک حصہ رکھتا ہے اور جسے آخر کار کسی نہ کسی طرح ایک کامیاب انسان بننے کی کوشش کرنا ہے ۔

جامِ صہبائی

۱

رشکِ جم و کَے ہے مے پرستی میری — وہ مست ہوں جاوداں ہے مستی میری
موجِ مئے ارغواں ہے ہر سانس مری — میخانۂ رنگ و بُو ہے ہستی میری

۲

شوقِ چمن و نگار و مینا ہے مجھے — پیتا ہوں کہ چند روز جینا ہے مجھے
کیوں بادۂ ناب سے نہ سرمست ہوں آج — کل زہرِ فنا کا جام پینا ہے مجھے

۳

تدبیرِ خرد کی کامرانی معلوم! — تاثیرِ بُکا و نوحہ خوانی معلوم!
ہنگامِ بہار رقصِ مستی ہو اثر — انجامِ بہارِ زندگانی معلوم!

اثر صہبائی

غزل

ستم کر، یا کرم، تو جانِ جاں یوں بھی ہے یوں بھی ہے — دلِ پُرشور تیرا نغمہ خواں یوں بھی ہے یوں بھی ہے
نہیں کچھ شکوۂ دردِ محبت، اے غمِ دنیا! — کہ دشمن اہلِ دل کا آسماں یوں بھی ہے یوں بھی ہے
جوانی ننگِ پیری اور پیری ننگِ ہستی ہے — ہمارے باغ میں عہدِ خزاں یوں بھی ہے یوں بھی ہے
شہیدانِ نگہ پر خضر کو بھی رشک آتا ہے — چلو مانا حیاتِ جاوداں یوں بھی ہے یوں بھی ہے
خموشی بھی وہاں ہوتی ہے ہم آہنگِ گویائی — مرا رازِ نہاں اُس پر عیاں یوں بھی ہے یوں بھی ہے
وفا تیری، جفا سے کم نہیں غارت گرِ ہستی — تری گردن پہ خونِ دو جہاں یوں بھی ہے یوں بھی ہے

ہنسا دیتی ہے پھولوں کو رلا دیتی ہے شبنم کو
ہمارے دردِ دل کی داستاں یوں بھی ہے یوں بھی ہے

حامد علی خاں

کشتۂ محبت

ریجن فلوری

ریجن فلوری فرانس کی وہ مشہور رقاصہ اور ایکٹرس تھی جس نے دنیا میں اسٹیج پر نیم برہنہ آنیکی رسم جاری کی۔ یہ رسم اخلاقی نقطۂ خیال سے کیسی ہی قابلِ اعتراض کیوں نہ ہو لیکن اسکی بنیاد ڈال کر ریجن فلوری کو اپنا جوہرِ قابلیت نمایاں کرنے میں بہت مدد ملی کسی زمانہ میں فرانس، بلکہ یورپ بھر کا ایک بہت بڑا طبقہ اس حسن کی دیوی کی پرستش کیا کرتا تھا۔ لیکن آخر اس تشنۂ محبت نے اپنے ہاتھوں اپنا کام تمام کیا۔ ذیل میں اسی مشہور عورت کی زندگی کے بعض دلچسپ حالات درج کئے جاتے ہیں:۔

پیرس میں شاید چند ہی لوگ ہونگے جنکے ساتھ ریجن فلوری نے گہرے دوستانہ تعلقات قائم کئے ہوں، لیکن جس کسی نے بھی اسکو اسٹیج پر ایکٹ کرتے ہوئے دیکھا اسکے دل میں اسکی محبت کی بنیاد پڑگئی اور وہ ہمیشہ اسکی تعریف کرتا رہتا۔ اور جنکو اسکے ساتھ واقعی دوستی کے تعلقات کا فخر حاصل تھا، وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ریجن فلوری کیا چیز ہے لیکن وہ جانتے تھے کہ فلوری حسنِ محبت کی دیوی ہے، اور اسکا دل نورِ محبت کی شعاعوں سے منور ہے۔

مگر قسمت کو کون دیکھ سکتا ہے؟ کون جانتا تھا کہ فرانس کی یہ پری، جسکا تمام یورپ گرویدہ تھا، ایک دن خود اپنے ہاتھوں اپنا فیصلہ کریگی! اور دنیا کی کوئی شئے اور کوئی امید ——— سوائے ایک کے! ——— اسے اپنے ارادہ سے باز نہ رکھ سکیگی!! وہ ایک امید کیا تھی؟ کیا اسے دولت کی خواہش تھی؟ کیا وہ شہرت اور نام کی خواہاں تھی؟ نہیں، ہرگز نہیں!! جس وقت اس نے خودکشی کی ہے اس وقت ہزاروں مالدار اور مشہور لوگ اسے اپنی رفیقۂ زندگی بنانے کو تیار تھے۔ یورپ کے تمام تھیٹر اور رقص گاہ اسکو بلانے کے لئے صرف اسکی خوشامد ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اسکے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کرنیکو تیار تھے۔ اور مرتے وقت اس نے مال و دولت کے علاوہ صرف زیور ہی پندرہ لاکھ روپیہ کا چھوڑا۔ پھر وہ کونسی خواہش تھی جس نے فلوری کو عالمِ شباب ہی میں دنیا کی تمام راحتوں اور مسرتوں سے منہ موڑ کر اپنی

زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور کیا؟ یہ حضرتِ عشق کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ تھا کہ فلوری کے تمام دوست اور شائقینِ دیدار ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو گئے۔ ریجن فلوری! جسکا نام یورپ میں بچّہ بچّہ جانتا تھا، جسکو سوائے گانے اور ناچنے کے دنیا میں کسی چیز سے محبت نہ تھی اور جس کو اس قدر غرورِ حسن تھا کہ مرد سے دوستی پیدا کرنا بھی وہ اپنے لئے عار سمجھتی تھی، آخر ایک مرد ہی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئی! اور وہ بھی پیرس کے ایک تھیٹر کا معمولی مصوّر!! لیکن کیا فلوری یہ جانتی تھی کہ اسے اپنی پہلی ہی محبت میں ناکامی ہوگی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ اسکا تمام غرورِ حسن آنِ واحد میں کافور ہو جائیگا؟ اسکو تو یہ یقین تھا کہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے نامور، دولتمند اور خوبصورت آدمی پر اگر وہ ایک نگاہِ ناز ڈالدے تو وہ ہمیشہ کے لئے اسکی غلامی کرنیکے لئے تیار ہو جائیگا۔ لیکن فلوری کو معلوم ہو گیا کہ دنیا میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس پر اسکے حسن کا جادو نہیں چل سکتا ——— اس مصوّر نے جس پر فلوری دل و جان سے شیدا تھی، اسکی محبت قبول نہ کی اور اسے اپنی رفیقۂ حیات بنانے سے انکار کر دیا!!

یہ صدمہ ریجن فلوری کے لئے معمولی نہ تھا۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اسکی محبت کو رد کیا ہو۔ ریجن فلوری کو اسکے ساتھ کچھ معمولی محبت نہ تھی کہ اسے دل سے بھلا دیتی۔ وہ اس مصوّر پر دل و جان سے شیدا تھی۔ اور اسے دنیا بھر میں اپنی محبت کے لئے بہترین شخص خیال کرتی تھی۔ لیکن اسی کے ہاتھوں اسکے دل کے ٹکڑے ہو جانیکا فیصلہ قضا و قدر کے ہاتھوں سے ہو چکا تھا، دنیا اسکے لئے ہیچ ہو گئی، فلوری پہلی بار پیرس میں خودکشی کی کوشش میں ناکام رہی، لیکن اسکا ارادہ نہ بدلا۔ آخر دو سال کے بعد حال ہی میں اس نے لندن میں خودکشی کر لی +

آج سے چونتیس سال پہلے ریجن فلوری فرانس کے مشہور شہر مارسیلز میں پیدا ہوئی۔ اسکے ماں باپ کی حیثیت بالکل معمولی تھی لیکن وہ بچپن ہی سے ریجن کو گھور گھور کے دیکھتے اور حیران ہوتے کہ کس ہوا نے اس گلاب کے پھول کو اڑا کر انکے گھر میں لا ڈالا ہے۔ اور سوچتے کہ معلوم نہیں یہ کیا ہو کر رہیگی دس ہی سال کی عمر سے ریجن کا چلبلا پن ظاہر ہونے لگا۔ اسکے ماں باپ کی تمباکو کی دکان میں جب کوئی خریدار آتا تو وہ اسکی وضع قطع اور طریقِ گفتگو کی نقل اتارا کرتی۔ اسکا دل پڑھنے اور گھر کے کام میں لگنے سے گھبراتا تھا۔ اسکی غریب ماں آخر اسکی ان حرکات سے تنگ آ گئی اور اپنے پڑوسیوں سے بطور شکائیت کے کہا کرتی کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ریجن کا کس کام میں دل لگیگا۔ وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر گھنٹوں منہ

چڑایا کرتی ہے۔ ابھی تک اسے گوشت کاٹ کر ابالنا بھی نہیں آتا ایسی لڑکی سے گھر بار کے سنبھالنے کی کیا امید کیجا سکتی ہے؟"

آخر ربجن کے ماں باپ کو جس بات کا ڈر تھا وہ ہو کر رہی پندرہ ہی سال کی عمر میں ربجن نے اپنے گھر کو خیر باد کہہ دی اسکے ماں باپ کو اسکا سخت صدمہ ہوا۔ اور خصوصاً جب انہوں نے یہ خبر سنی کہ ربجن پیرس کے ایک تھیٹر، اسکالا میں شریک ہوگئی ہے تو انکے رنج و غم کی کوئی حد نہ رہی لیکن ربجن ان باتوں سے بے پروا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا ہے اور کیا ہو کر رہیگی، وہ اسکالا تھیٹر میں اپنا پارٹ کرنیکے بعد وہاں کی بہترین ایکٹرس کو اس طرح گھورا کرتی جیسے ایک شکرا اپنے شکار پر نظر جمائے رکھتا ہے، اور جب وہ اپنے کمرہ میں اکیلی ہوتی تو اسکی اس طرح نقل اتارا کرتی گویا کل ہی اسے اسکا پارٹ کرنا ہے۔ اسکی تمنّا یہ تھی کہ وہ پیرس کی بہترین ایکٹرس ہو جائے۔ لیکن انسان کی خواہش جلد کبھی پوری نہیں ہوتی، البتہ اگر ارادہ مستقل ہو تو ہر خواہش آج نہیں تو کل ضرور پوری ہو کر رہتی ہے +

اُس زمانہ میں اسکالا میں جو تنخواہ ایکٹروں کو ملتی تھی وہ بالکل ناکافی تھی۔ اس میں وہ مشکل سے اپنا گذارہ کر سکتے تھے۔ حالانکہ اُس زمانہ میں اسکالا پیرس کے بہترین تھیٹروں میں سے تھا۔ ربجن کو وہاں ترقی کا کوئی موقع نہ ملا۔ آخر ۱۹۰۹ء میں ربجن نے اپنی ایک تصویر اخباروں میں شائع کرائی۔ جس سے اسے کچھ شہرت حاصل ہوگئی اسکے بعد اس نے ایک مشہور مصوّر سے اپنی ایک قلمی تصویر کھنچوائی، ربجن جب پہلی بار مصوّر کے سامنے تصویر اتروانے کے لئے کرسی پر بیٹھنے لگی، تو اس نے کہا کہ "تم شرماؤ مت۔ میں نے بہت سی عورتوں کی تصویریں اتاری ہیں لیکن تم سا خوبصورت اور سڈول جسم میں نے کسی عورت کا نہیں دیکھا" اس تصویر نے بھی ربجن کی شہرت میں مدد دی"

ربجن فلوری کو جلد ہی اسکا احساس ہونے لگا کہ وہ زیادہ دن اسکالا میں کام نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اسکی وہاں اسکی شان کے شایاں قدر نہیں کی جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب اسکی شہرت اور ترقی کے دن آگئے ہیں۔ اور اسکی شہرت کے دن واقعی آئے۔ یعنی اس وقت جب دو سال کے بعد وہ اسکالا چھوڑ کر کنسرٹ میال میں شریک ہوگئی تھی!

ایک شب جب کنسرٹ میال کی بہترین ایکٹریس تھیٹر کے مالک سے کسی ناچاقی کی وجہ سے تھیٹر چھوڑ کر چلی گئی تو ربجن فلوری نے فوراً اسکی جگہ پر اپنی خدمات پیش کیں۔ تھیٹر کا مالک ربجن کو اچھی طرح سے جانتا تھا اور اسے یقین تھا کہ ربجن اگر اس سے اچھا کام نہیں کر سکتی تو اس جیسا ضرور کر سکتی ہے چنانچہ اس نے اسکی درخواست خوشی سے منظور کر لی +

لیکن ریجن نے مالک سے کہا" مجھے اس بات کی اجازت دی جائے کہ میں اپنا لباس جس طرح چاہوں پہنوں"
اور اسکی اجازت ملنے کے پندرہ منٹ بعد ریجن فلوری جب دوبارہ تھیٹر کے مالک کے کمرہ میں داخل ہوئی تو وہ اسکو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ پاؤں سے کمر تک اس نے ریشمی کپڑے کا ایک تنگ پائجامہ پہن رکھا تھا جو اسکے جسم کے ساتھ بالکل چمٹا ہوا تھا۔ اور کمر سے اوپر کا حصہ بالکل برہنہ تھا!

مالک نے غصہ سے کہا" میں تمکو اس حالت میں اپنے تھیٹر کی اسٹیج پر آنیکی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا"
کیونکہ اس وقت تک یہ پہلا موقع تھا کہ ایک لڑکی عوام کے سامنے نیم برہنہ آنے کے لئے تیار ہوئی ہو۔ لیکن ریجن فلوری نے اسکا مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ تھیٹر کی دُنیا میں ایک نئے رواج کی بانی ہوگی۔ اس نے تھیٹر کے مالک سے عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ مجھے اپنی قسمت آزمائی کا صرف ایک بار موقع دیا جائے، آخر ریجن کے بھولے حسن اور سحرِ تقریر نے اسے مجبور کیا کہ وہ اسے ایک بار اسٹیج پر نیم برہنہ آنیکی اجازت دے۔ اجازت دیتے ہوئے اس نے کہا" ریجن فلوری! آج رات کو تمہارے اس طرح اسٹیج پر آنیکے بعد یا تو پولس مجھے اپنا تھیٹر بند کرنے پر مجبور کریگی، یا کل تم پیرس کی بہترین اور مشہور ترین ایکٹرس ہو جاؤ گی"
آخر اس کا دوسرا ہی خیال صحیح نکلا۔ اس رات کو کنسرٹ میال کے تماش بینوں کو اتنی مسرت ہوئی کہ اس وقت تک کسی تماشے سے نہ ہوئی تھی، کھیل کے دوران میں ریجن فلوری جس کا کمر سے اوپر کا جسم بالکل برہنہ تھا اور جسکے نیچے کے جسم کا لباس اس قدر تنگ تھا کہ وہ بالکل برہنہ معلوم ہوتی تھی۔ اسٹیج پر آئی۔ اسکے اسٹیج پر داخل ہوتے ہی تمام تھیٹر حیرت اور مسرت کی چیخوں سے گونج اُٹھا۔ اسکے علاوہ ریجن نے اپنا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا کہ اس رات تمام تماشبین اسکے حسن اور اسکے ایکٹ کی تعریف کرتے ہوئے واپس ہوئے۔

دوسرے دن پیرس میں تمام لوگوں کی زبان پر ریجن فلوری کا نام تھا۔ ہر جگہ اس کے چرچے ہو رہے تھے۔ تمام اخباروں نے اسکی تعریف لکھی۔ اور لکھا کہ کنسرٹ میال کو ریجن سے بہتر ایکٹرس ملنا مشکل ہے اسکی طرزِ ادا اور اسکے حسن کی تعریف جدا تھی۔ کیونکہ ریجن فلوری پہلی عورت تھی جس نے تمام یوروپ میں اسٹیج پر نیم برہنہ آنیکی ابتدا کی تھی۔

پولس نے کوئی مداخلت نہ کی۔ بلکہ دوسرے تھیٹروں نے بھی اسکی تقلید شروع کر دی۔ اور سب نے خوبصورت لڑکیوں کو نیم برہنہ تھیٹر کی اسٹیج پر لانا شروع کیا۔ یہی سال یعنے ۱۹۱۰ء پیرس کی نیم برہنہ ایکٹرسوں کی ابتدا کا تھا۔ اس رسم کی ابتدا ریجن نے کی اور بعد میں یہ یوروپ بھر میں عام ہوگئی۔

پھر کیا تھا۔ ریجن فلوری کی قسمت بن گئی؛ اب وہ صرف کنسرٹ سیال ہی کی نہیں بلکہ تمام پیرس کی ہردلعزیز اور مقبول عام ایکٹریس بن گئی تھی۔ ہزاروں لوگ اسکو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ ریجن اتنی مدت سے جو خواب دیکھ رہی تھی اب اس کی تعبیر اسکی آنکھوں کے سامنے موجود تھی؛ ہر شام کو کنسرٹ سیال میں اسکے کمرہ کے اندر بہترین پھولوں کے گلدستوں کا ڈھیر لگا رہتا۔ اور جلد ہی اسکے ہاتھوں میں اور گلے میں نہایت قیمتی جواہر چمکنے لگے اب اسے دنیا رہنے کے قابل جگہ معلوم ہونے لگی۔ اس وقت اسکی عمر مشکل سے اٹھارہ سال کی ہوگی۔ لیکن تمام پیرس اسکا غلام ہو چکا تھا۔ اب اسے محبت کے خواب بھی نظر آنے لگے۔ لیکن ریجن کے سینہ میں ایک دل تھا۔ اور وہ اسکے اصلی خریدار کی تلاش میں تھی +

جن ڈرامانویسوں نے صرف ریجن کی خاطر ڈرامے لکھے ان میں پیرس کا مشہور ڈرامانویس پی۔ ال۔ فلرس بھی تھا۔ ۱۹۱۵ء میں ریجن فلوری نے فلرس کے لکھے ہوئے دو مشہور ڈراموں میں اس خوبصورتی سے ایکٹ کیا کہ اسکی شہرت تمام یورپ میں عام ہوگئی۔ اسوقت اسکی عمر بیس برس کی تھی۔ اس کے بعد اس نے اسی مصنف کی لکھی ہوئی ایک اور کامیڈی میں تھیٹر ڈانا کے اسٹیج پر ایکٹ کیا۔ اس وقت ریجن فلوری ہر ڈرامامیں اس عمدگی اور خوبی سے پارٹ کرسکتی تھی کہ تمام پیرس میں کوئی اسکا ثانی نہ تھا +

ریجن کے دل میں دنیا کو دیکھنے اور دنیا کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش بھی موجود تھی، وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ تفریح کے لئے مونٹ مارٹ بھی جایا کرتی تھی۔ لیکن تھیٹر سے اسے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ تفریح سے اس قدر جلد واپس آجاتی کہ اپنا پارٹ بخوبی یاد کرکے رات کو اسٹیج پر کرسکے پیپلس تھیٹر لندن میں ریجن فلوری نے پہلے ہی کھیل میں تمام لندن کی پبلک کو اپنا دلدادہ بنالیا۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن دل ہی دل میں اسے کسی شے کی تلاش لگی ہوئی تھی +

مادام پولیر اس وقت پیرس میں سیگال تھیٹر کی بہترین ایکٹریس ہے، وہ ریجن فلوری کے چند خاص دوستوں میں رہ چکی ہے، حال ہی میں ریجن فلوری کی افسوسناک موت کے بعد اس نے ایک ہوٹل میں اپنے دوستوں سے ریجن کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا: "غریب ریجن! اسکی موت میرے لئے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ میں جانتی تھی کہ ریجن کا خاتمہ کس طرح ہونے والا ہے لیکن وہ کسی کی رائے کو خاطر ہی میں نہیں لاتی تھی۔ آج سے چودہ سال پہلے جب میں اسکے ساتھ لندن گئی تو میں نے اسے اسکی آئندہ زندگی کے متعلق بہترین دوستانہ مشورہ دیا۔ لیکن ریجن نے اسکا جواب تمسخر آمیز ہنسی سے دیا۔ اور

مجھ سے پوچھا کہ کیا میں دن کو بھی خواب دیکھا کرتی ہوں ؟
اس نے کہا "میں ایک بہترین موقع کی تلاش میں ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ موقع مجھے لندن میں ملیگا" "لیکن اس موقع کا راز مجھے بھی معلوم نہ تھا۔ اور زیجن کی مخفی محبت سے میں بھی واقف نہ تھی میں صرف اتنا جانتی تھی کہ اسکے دل پر کچھ نہ کچھ صدمہ ضرور ہے۔ اور مجھے یقین تھا کہ اسکا نتیجہ اچھا نہیں نکلیگا کیونکہ میں زیجن کی نازک دلی اور نازک دماغی سے اچھی طرح واقف تھی۔ اور آخر میرا خیال صحیح نکلا"
مادام پولیر کیا، پیرس بھر میں کوئی بھی زیجن کی خانگی زندگی سے واقف نہ تھا۔ اور اسکی موت سے پہلے کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ زیجن کو ایک تھیٹر کے مصور سے اس قدر محبت ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ مغموم رہنے لگی تو تمام پیرس میں اسکی مختلف توجیہیں ہو رہی تھیں، لیکن صداقت ایک میں بھی نہ تھی اور کسی کو بھی اسکی اصل وجہ معلوم نہ تھی ۔
آخر ایک دن یکایک تمام پیرس میں یہ سنسنی پیدا کرنے والی خبر مشہور ہو گئی کہ زیجن فلوری نے دریائے سین میں کود کر خودکشی کرنی چاہی، لیکن اس سے بال بال بچا لی گئی۔ اسکے بعد ہی فوراً تمام لوگوں نے اسکی اصل وجہ دریافت کرنیکے لئے اپنی تمام قوت صرف کر دی اور آخر زیجن کی ناکام محبت کا راز سب پر افشا ہو گیا۔ زیجن کو خود اسکا اقرار کرنا پڑا۔
اس حادثہ کے بعد تین ماہ تک زیجن فلوری کی زندگی موت اور زیست کے درمیان رہی۔ جب اسکی حالت کچھ سنبھلی اور وہ اپنے گھر واپس آئی تو اسکے کمرہ میں خطوں کے کئی بنڈل موجود تھے۔ جو صرف پیرس ہی سے نہیں بلکہ تمام یوروپ سے اسکے نام آئے تھے۔ سینکڑوں نے اس سے شادی کی درخواست کی تھی اور لکھا تھا کہ وہ اسے عمر بھر اپنے سر آنکھوں پر بٹھائینگے۔ سیکڑوں نے اپنے آپ کو اس لئے پیش کیا تھا کہ وہ اسکی ہر طرح سے مدد کر کے اسکی پریشانی اور فکروں کو دور کرنے کے لئے تیار ہیں اور ہزاروں نے لکھا تھا کہ زیجن فلوری دنیا میں رہنے کے قابل ہے، اسکے نہ ہونے سے تمام یوروپ پر افسردگی چھا جائیگی، وہ خودکشی کے خیال کو دل سے نکال دے کیونکہ دنیا رہنے کے قابل جگہ ہے۔ لیکن زیجن ان خطوں کو پڑھتی جاتی تھی اور مسکرا کر چاک کرتی جاتی تھی۔ جس خط کو اسکی آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں وہی ان میں نہ تھا اور سب خط پڑھ لینے کے بعد زیجن فلوری نے ایک آہ بھری اور کہا کہ "خیر اس بار مجھے ناکامی ہوئی لیکن انشاءاللہ دوسری مرتبہ میں ضرور کامیاب ہونگی"

جنگ عظیم کے زمانہ میں زیجن اپنی ایکٹنگ سے کامیابی کے ساتھ پیرس اور لندن میں پھر اپنی شہرت میں چار چاند لگاتی رہی اس عرصہ میں پیرس کی ایک اور مشہور ایکٹرس گیبی ڈرلی کے ساتھ زیجن کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ ایک شام کو پیرس میں گیبی کے مکان پر ہیری پلیبر اور گیبی کے سفر سے واپس آنیکی خوشی میں ایک ٹی پارٹی دی گئی، جہاں زیجن فلوری اور پیرس کی تمام مشہور ایکٹریسیں موجود تھیں اس پارٹی میں بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ شمپین اور کئی قسم کی شرابیں موجود تھیں۔ جنہیں تمام مہمان مسرت سے پی رہے اور لطف اندوز ہو رہے تھے، لیکن زیجن کے لبوں پر ایک بار بھی مسکراہٹ نہ آئی۔ اور اس نے شراب کا ایک قطرہ بھی زبان پر نہ رکھا۔

اسی رات گیبی نے ایک ناچ کا بھی انتظام کیا تھا۔ ایک بڑے ہال کے آخری حصہ میں ایک چبوترہ بنایا گیا تھا، پارٹی کے بعد تمام مہمان اس ہال میں جمع ہو گئے اور گیبی اور زیجن فلوری نے اس چبوترہ پر ہوائین بینڈ کے ساتھ ایک نہایت ہی عمدہ ناچ سے تمام مہمانوں کو خوش کیا، ناچ کے ختم ہو جانیکے بعد زیجن فلوری تھک کر اسی چبوترہ پر ایک تختہ کے آڑ میں لیٹ گئی، چبوترہ کے سامنے ہی ایک اور تختہ کی آڑ میں ہوائی کے بینڈ بجانے والے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کو زیجن نے اشاروں سے اپنے پاس بلایا۔ اور پوچھا "میں نے سنا ہے کہ تمہارا ہوائی بہت خوبصورت ملک ہے"

ہوائین نے مسکرا کر جواب دیا "ہمارے ملک کی خوبصورتی میں کیا شک ہے؟"

زیجن نے کہا "اور وہاں ایک بہت بڑا کوہ آتش فشاں بھی ہے۔ کیوں؟"

اس نے کہا "ہاں ہمارے ملک کا آتش فشاں دنیا کے سب سے بڑے اور خوبصورت ترین آتش فشاں پہاڑوں میں سے ہے"

زیجن نے پوچھا "کیا وہ ہمیشہ دہکتا رہتا ہے؟"

اسکے جواب میں ہوائین نے اس کوہ آتش فشاں کے مختصر حالات بیان کئے جنکو زیجن فلوری نہایت دلچسپی سے سنتی رہی، پھر اس نے پوچھا "اگر کوئی شخص اس پہاڑ پر چڑھ کر اسکے دہکتے ہوئے دہانہ میں کود جائے تو کیا وہ فوراً مر جائیگا؟"

ہوائین نے حیرت سے زیجن کے منہ کو تکتے ہوئے کہا "یقیناً"

زیجن نے مسکراتے ہوئے کہا "پھر میں ضرور تمہارے ملک کو آؤنگی" اسکے بعد اٹھ کر چلی گئی۔

اس گفتگو سے اسکے خیالات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح خودکشی کے ارادہ پر مضبوطی سے قائم تھی اور اسکے لئے کتنے مختلف طریقے وہ سوچتی رہتی تھی، اس واقعہ کے چند ہی ماہ بعد آخر زیجن نے لندن میں خودکشی کر لی۔

(ماخوذ) حسن یار جنگ

نوائے اختر

ہزار بزم، مہیائے "مرگِ نیم شبی" است
ہنوز مطربِ اسیر نوائے زیرلبی است

زبانِ شوق و گناہِ بیاں! چہ بوالعجبی است؟
کہ در حضورِ تو عرضِ نگاہ بے ادبی است

غرورِ عشق، گدا را مجالِ شکوہ نداد
ستارہ سرِ مژگاں دعائے نیم شبی است!

دو چیز آنکہ جوان است و ہم جواں سازد
نگارِ شوخ و فسونساز و بادۂ عنبی است

چہ طور ضبط کنند، رازِ ربطِ پنہاں را؟
نگاہِ شوق کہ مستِ ادائے بے ادبی است

ز دوستانِ منافق مدار چشمِ وفا
میانِ پیکرِ اسلام، روحِ بولہبی است

شہادتے است بر آئینِ اختصاصِ کرم
جفائے دوست کہ آئینۂ وفاطلبی است

جوابِ شعرِ گرامی نوشتہ ام اختر
اگرچہ عرضِ ہنر پیشِ یار بے ادبی است

اختر شیرانی

غزل

کچھ آبلہ پا بیٹھے روتے ہیں بیاباں میں
کچھ نیند کے متوالے سوتے ہیں شبستاں میں

دل اور ہواداری اُس زلفِ مسلسل کی
کمبخت پھنسا جاکر کس بھول بھلیاں میں

اللہ رے بیدردی جب پس گئے دل لاکھوں
تب جاکے رچی مہندی انگشتِ حسیناں میں

بن بن کے بگڑ جانا اُس زلفِ مسلسل کا
اک اور اضافہ ہے طولِ شبِ ہجراں میں

مسعود الحسن تاباں

جذباتِ کیفی

میں ہوں وہی لیکن وہ نوازش تو نہیں ہے
کچھ میری طرف سے انہیں کاوش تو نہیں ہے

حیرت ہے یہ خط کس نے لکھا ہے مجھے یارب
اُس دستِ نگاریں کی نوازش تو نہیں ہے

بے وقت ہے اتنی نہ پیو حضرتِ کیفی
گرمی کے ہیں دن موسمِ بارش تو نہیں ہے

مرسلہ م - ن - حیدرآباد - دکن

سرگوشیاں

معمولی باتیں۔ کس قدر معمولی باتوں میں ہماری زندگی گذرتی ہے۔ کس قدر معمولی باتوں کو ہم غیر معمولی سمجھتے ہیں، لباس مکان سواری گفتگو چال یہ تمدن ہے اوروں کی کہی ہوئی باتیں دہرانا دور دراز کے واقعات سننا سنانا ورق گردانی کرنا۔ ورق سیاہ کرنا یہ تعلیم ہے اور ان پر ہمیں ناز ہے غرور ہے تکبر ہے، کوئی شخص ڈھیلا پاجامہ پہنے آرہا ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ اسکی روح ناقص ہے۔ کسی کے مکان کی طرز تعمیر سیدھی سادی ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حسن تناسب سے متاثر نہیں۔ کسی کا گھوڑا چست و چالاک نہ ہو تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی سست و نابکار ہے کوئی جا و بیجا "تھینک یو" نہ کہے تو ہم کہتے ہیں کہ کسی خاتون سے ملنے کے قابل نہیں کوئی اکڑ کر نہ چلے تو ہم کہتے ہیں کہ اس میں خودداری کا مادہ نہیں، پھر کوئی انگریزی مدرسے میں ٹٹ بٹ انگریزی نہ بولے روزانہ خبروں کی لغات نہ بن چکا ہو ہر فن میں تھوڑی سی دستگاہ نہ رکھتا ہو تو خواہ اسکی فطنت و ذکاوت اعلیٰ معیار کی ہو وہ ہمارے نزدیک جاہل مطلق نہ سہی پرانے زمانے کا گدھا ضرور قرار پاجاتا ہے، سچ یہ ہے کہ باتوں اور آدمیوں کی صحیح قدر و قیمت شاید کسی گذرے ہوئے زمانے میں ہوتی ہو۔ آجکل تو نہیں ہوتی، اور اگر یہ وجہ ہے کہ آجکل ترقی بہت ترقی کر رہی ہے تو تف ہے ایسی بے چین متحرک تیز رفتار ترقی کی ترقیوں پر، لیکن نہیں یہ کچھ ترقی کی خوبی نہیں یہ تنزل کی علامات ہیں۔ جب ترقی کا خیال زیادہ پیدا ہو جائے اور اپنے نقائص کے خیال پر بھی ناک بھوں چڑھائی جائے تو انسان کے دماغ کا کوئی نہ کوئی پرزہ ضرور زنگ آلود ہو چکا ہوتا ہے یا گھس چکا ہوتا ہے غالباً گم ہو گیا ہوتا ہے، ہماری زندگی میں اب وہ باتیں غیر معمولی ہو چکی ہیں جو اک معمولی سی زندگی میں عام ہونی چاہئیں، اک بہار کی صبح یا پھیلے ہوئے میدان سے ہمیں تسلی نہیں ہوتی چڑیا کی چہک چنبیلی کی مہک ہمیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ کوئی غریب اپنے گھر میں فاقہ مست ہو تو ہمیں فرصت نہیں کہ اس کا حال معلوم کرنا تو کجا اس بات کا خیال بھی دل میں لائیں۔ ہماری مشغولیت اک بھکاری کو شاہ راہ سے ہٹا دینا اس کا خود بخود وہاں سے غائب ہو جانا شہریت کا حق سمجھتی ہے۔ ماں کی محبت بچوں کی ہنسی بہنوں کی ہمدردی یہ ہماری باندیاں ہیں اور ہم انکے خود سر آقا۔ ہم خود صرف اس قابل ہیں کہ بناوٹی ہنسی ہنس سکیں رسمی ہمدردی کر سکیں محبت کو غلط کار جوانی کا اک معما سمجھ کر سن سکیں۔ قدرت کی ان بخششوں کو ہم حقارت سے دیکھتے ہیں ہمیں انکے استعمال کی فرصت نہیں ملاحظہ و تجربہ کی ضرورت

نہیں ہمیں تو صرف ٹھنڈی سڑک پر چلنے موٹر پر گھومنے کا شوق ہے اک سیاسی لیکچر سننے کا ذوق ہے متحرک تصویر دیکھنے کی آرزو ہے کسی نئے وضعدار سے ملنے کی کاوش ہے اپنے ہمعصروں کو یہ جتانے کی تمنا ہے کہ ہمارا دل دُنیا کی تازہ ترین حالت کا آئینہ ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ انگلستان کے موجودہ وزیر اعظم کی دادی کون تھی وہ ابھی مری نہیں کونسے کھیل کھیلتی ہے لیکن اس کا پتہ نہیں کہ ہماری اپنی پھوپھی کو دو وقت کا کھانا بھی میسر ہے کہ نہیں + ہم انسان بنے انسان بنے رہنے کو عار جانتے ہیں! تو کیا ہم جنّ یا شیطان بن سکنے کے تمنائی ہیں ؟ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمیں خدا کی ہستی کا یقین ہوتا جو نہیں ہے تو اپنی موجودہ روش کے ساتھ شاید ہم اُسکے ہم پلّہ ہونے کا دعوےٰ کرتے۔ فی الحال ہمکو اس پر غصّہ آتا ہے کہ اگر کسی کا خدا ہے تو وہ ہماری طرح شاہِ راہ ترقی پر کیوں گامزن نہیں ہوتا ؟

آزادیاں ۔کبھی جوش میں آکر میں کہتا ہوں کہ دُنیا کے موجودہ طریقے معاشرت کی یہ روش بالکل لغو ہے۔ انکو تبدیل کر دیا جائے + امارت موقوف نہ کیجائے لیکن کوئی شخص زیادہ غریب نہ ہو + شادیاں ہُوا کریں لیکن مرد عورت کے دوستانہ تعلقات کو گناہ نہ سمجھا جائے، گناہ کو جڑ سے اُکھیڑ کر الگ کر دیا جائے + روپیہ اچھی طرح اور کھُلی طرح صرف کیا جائے - ہاں بے سود ضائع نہ کیا جائے۔ ایک کوڑی بھی نامناسب طرح صرف نہ ہو + چوری یک قلم بند کر دی جائے۔ سلطنت کے خزانے میں سے ہر ایک کو قوتِ لایموت لینے کا حق حاصل ہو + ادب آداب بھی ضروری نہ ہوں۔ بُری بات نہ کہی جائے لیکن اچھّی بات کا کہنا بھی لازم نہ ہو + وقت ضائع نہ کیا جائے لیکن تقسیم اوقات کا قاعدہ چھوڑ دیا جائے + جب بُری باتیں کرنیکی رغبت جاتی رہے تو پھر بندشوں کے کیا معنی۔ ہر شخص آزاد ہو خود بخود کام کرے جہاں چاہے جائے جو چاہے کرے۔ قواعد قیود قوانین سب "اوقات" موقوف کر دیئے جائیں + مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں نہیں کر دیا جاتا ایسا کیوں خود بخود نہیں ہو جاتا ایسا ہمیشہ سے ہی کیوں نہ ہُوا ؟

اگر خدا نہیں لیکن خیر ہم فرض کئے لیتے ہیں کیونکہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ خدا ہے جب خدا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ دُنیا کو اپنی طرح آزاد نہ کر دے، کیا وہ خود آزاد ہے ؟ ضرور ہے اور اگر نہیں تو اس کا آزاد ہو جانا یقینی ہے۔ جب یہ یقینی ہے تو دُنیا بھی یقیناً جلد آزاد ہو جائیگی +

"باغبان"

محفلِ ادب

مناظرِ قدرت

برسات کی راتیں

از

جناب محمد یسین صاحب تسکین قریشی

پھر درد بھری ہر سو، کوئل کی صدا آئی ــــ پھر کالی گھٹا اُٹھی، پھر ٹھنڈی ہوا آئی
بادل کے گرجنے سے پھر ہوک اُٹھی دل میں ــــ برسات کی رُت آئی، پھر مجھ پہ بلا آئی

دعوت ہے جوانی کی، ہنگامۂ مستی ہے ــــ تاثیر کا عالم ہے، تاثیر برستی ہے
چھایا ہے اندھیرا سا، تابش ہے نہ تاریکی ــــ یہ خلد نما منظر، سرمایۂ ہستی ہے

ہر باغ ہے میخانہ، ہر نخل ہے مستانہ ــــ ہر بوندہے صافی، ہر پھول ہے پیمانہ
موروں کی ہم آہنگی، سبزہ کی یہ خوشرنگی ــــ جمگھٹ سے حسینوں کے گلشن ہے پری خانہ

صحرا ہو کہ آبادی، معمورِ تکلّم ہے ــــ کانٹوں میں ہے شادابی غنچوں میں تبسّم ہے
چڑھتے ہوئے دریامیں ہے شانِ دلآویزی ــــ پانی پہ جوانی ہے، موجوں میں ترنم ہے!

یہ جنّتِ نظارہ، یہ جلوۂ بستانی! ــــ موسم کی یہ رنگینی، فطرت کی یہ ہریانی

اس رُت میں بھلا کیونکر احساس نہ جاگ اُٹھے
حاصل ہے مجھے اس سے اک نسبت پنہانی

بجلی کی ہے بیتابی اس دل کے دھڑکنے میں
بادل کی تراوش ہے اشکوں کے ٹپکنے میں
ان ٹھنڈی ہواؤں میں شامل ہیں مری آہیں
ہے سوزِ جگر پنہاں، کوندے کے لپکنے میں

ہوجاتا ہوں سودائی جب آتی ہیں برساتیں
یاد آتی ہیں رہ رہ کر کچھ گذری ہوئی باتیں
اُس بھولنے والے سے اے کاش کوئی کہدے
کاٹے سے نہیں کٹتیں برسات کی یہ راتیں

(معارف)

غالب کا مذہب

اس میں شک نہیں کہ غالب کا ازروئے اعتقادات ولائے اہلبیت اطہار میں حددرجہ کا غلو اُنکی تصنیفات ومکتوبات سے ثابت ہے جو اُنکے اثنائے عشری شیعہ ہونے پر ایک حد تک دال ہے لیکن چند انتخاب انکے مکتوبات سے پیش کئے جاتے ہیں جس سے غالب کا سُنّی ہونا ثابت ہے۔

مکتوب بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح۔ اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۶ - ۱۲۷۔

ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جاکر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جاکر نماز تراویح پڑھتا ہوں +

مکتوب بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۶ - ۱۲۷۔

میاں نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم کے وہ خلیفہ تھے مولوی فخرالدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا +

غالب مرحوم کے اکثر احباب اور لہارو کا خاندان حضرت مولانا فخرالدین کے سلسلہ میں مرید تھے جفرات شیعہ مرید نہیں ہوتے مگر غالب مرحوم کا مرید ہونا خود ان کے مکتوب سے ظاہر ہے۔ علاوہ اسکے چشتی نظامی فقراء و چشتی صابری فقراء اور ان کے مریدین محبت اہلبیت میں بہت غلو رکھتے ہیں اور بارہ اماموں سے بھی خاص تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے غالب نے اپنے کو اثنا عشری شیعہ لکھا ہے +

ماہ رمضان المبارک میں مسجد جامع جاکر نماز تراویح پڑھنا خاص دلیل سنّی ہونے کی ہے کیونکہ جامع مسجد دہلی میں شیعوں کی کبھی باجماعت نماز ہونا معلوم۔ حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ نے اپنی کتاب "غالب کے روزنامچہ"

میں غالب کے سنی ہونے پر کافی روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں :-

"غالب چشتی نظامی تھے شیعہ نہ تھے اگر شیعہ ہوتے تو علی گنج شاہ مردان کے قبرستان میں دفن ہوتے جو صفدر جنگ کے قریب ہے۔ اور جہاں اس وقت کے تمام شیعہ اُمرا دفن ہُوا کرتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں۔ سُنیوں خصوصاً چشتیوں نظامیوں کے قبرستان میں دفن ہونا اور درگاہ حضرت سلطان جی صاحب میں جو نظامیہ سلسلہ کے بانی ہیں اُنکی میت کا لایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ سنی تھے شیعہ نہ تھے۔ انکی قبر بھی سنی طریقہ کی بنائی گئی ہے۔ یعنی اُس پر اُونچا اونٹ کے کوہان کی شکل کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے۔ شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں"

لہذا کوئی گنجائش نظر بحالات و دلائل مندرجۂ بالا شک و شبہ کی باقی نہیں رہتی۔ جس سے غالب کو شیعہ کہا جائے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ غالب کو حقیقی اور سچی محبت اہلبیت اطہار سے تھی۔ سیاسی محبت نہ تھی اور یہی طریقہ و عقیدہ سنیوں کا ہے ؂ (زمانہ)

قدیم روما کے دنگل۔ دنگل یا باہمی زور آزمائی مقابلۂ سپہگری کی نمایش بہت قدیم چیز ہے لیکن اہل روما میں اسکا خاص ذوق تھا۔ وہاں صرف کشتی ہی کا رواج نہ تھا بلکہ اسلحہ کے ساتھ باہم مقابلہ کرتے تھے اور اُنکے جسم سے جو خون جاری ہوتا تھا اس سے انکی لذت و کیفیت حماست میں اور زیادہ جوش پیدا ہوتا تھا۔ خاص خاص مدارس تھے جہاں اس فن کی تعلیم دی جاتی تھی دنگلوں کا قیام مختلف موقعوں پر ہُوا کرتا تھا۔ کبھی اس سے محض تفریح مقصود ہوتی تھی اور کبھی جنگ میں فتح پانے کی خوشی میں اسکا انعقاد ہوتا تھا۔ دنگل میں حصہ لینے والے زیادہ تر غلام ہوتے تھے یا وہ مجرم جنکو سزائے موت کا حکم سُنایا جانے والا تھا۔ جنگی قیدیوں میں سے بھی توی مضبوط لوگ شریک کئے جاتے تھے، روما میں تین سو قبل مسیح سے لیکر ۴۰۰ سال بعد مسیح تک اسکا بہت زور رہا۔ ایک دنگل میں کم از کم تیس چالیس جوڑیں ہوتی تھیں اور مقابلہ اس وقت تک ختم نہ ہوتا تھا، جبتک کوئی خون آلود ہوکر زمین پر نہ گر پڑے۔ غالب فرد مغلوب کے سینے پر قدم رکھکر کھڑا ہو جاتا اور بادشاہ کی طرف دیکھ کر حکم کا منتظر رہتا اگر وہ اجازت دیتا تو چھوڑ دیتا ورنہ نہیں، لیکن اکثر یہی ہوتا کہ غالب مغلوب کو قتل کر ڈالتا اور اسکی لاش جانوروں کے سامنے ڈالدیتا۔

اگر مغلوب قوی الجثہ ہوتا اور زخم معمولی ہوتے تو معاف کر دیا جاتا اور جب وہ اچھا ہو جاتا تو پھر مقابلہ کیلئے طلب کیا جاتا صرف شاہ تراجان کے زمانہ میں دس ہزار آدمی دنگلوں میں مقتول ہُوئے ؂

(نگار)

مطبوعاتِ جدیدہ

کتابیں

لمحاتِ نور۔ مؤلفہ جناب مولوی نورالدین صاحب نور۔ اردو شعر کے جس قدر انتخابات ہماری نظر سے گزرے ہیں اُن میں لمعاتِ نور کو نہ صرف اپنی جامعیت اور حسنِ ترتیب کی وجہ سے ایک خاص درجہ حاصل ہے بلکہ ظاہری صورت کے لحاظ سے بھی یہ کتاب نہایت درجہ جاذبِ توجہ ہے۔ مختلف عنوانات کی تحت میں مؤلف ممدوح کو جس قدر اشعار قابلِ اندراج ملے انہوں نے نہایت محنت اور عرقریزی سے جمع کر دئے ہیں، ناظرین کی اطلاع کے لئے بعض عنوانات ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ مثلاً تصوف، توحید، نعت، دعا، بے ثباتی دنیا، اخلاق، مناظرِ قدرت، رزم و بزم، جذباتِ فطرت، عشق، حسرت و مایوسی، ہجر و فراق، جنون، رندی و بادہ خواری، نوحہ و مرثیہ، مدح، عید، کہہ مکرنیاں، اور پہیلیاں، ذومعنیاں، لطائف وغیرہ کتاب میں متعدد ہاف ٹون تصاویر بھی اس کے لئے مزید رونق کا باعث ہو رہی ہیں۔ ابتدا میں جناب مؤلف کی تصویر اور اس کے بعد خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب مدیر مخزن کی تصویر درج ہے اور اس کے بعد غالب، اقبال، حالی، شبلی، اکبر، ہمایوں، احمد حسین خاں۔ آزاد، مولانا ظفر علی خاں صاحب اور اسی قسم کے بعض اور بزرگوں کی تصاویر درج ہیں۔ یہ کتاب اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس کی قدر کریں۔ اور نہ صرف مؤلف کی بلکہ اس کے ناشر حافظ قمرالدین صاحب کی حوصلہ افزائی فرمائیں جنہوں نے اس حسنِ اہتمام سے اس کتاب کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ بعض جگہ کتابت کی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں امید ہے کہ طبع دوم میں صحت کا زیادہ خیال رکھا جائیگا۔ کتاب کا سرورق نہایت خوبصورت اور جلد نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔ ذیل کے پتے سے طلب فرمائیے:۔

حافظ قمرالدین اینڈ سنز تاجرانِ کتب موچی دروازہ لاہور

صدائے درا۔ مولنا سید برکت علی شاہ صاحب گوشہ نشین وزیر آبادی نے اپنی نظموں کا مجموعہ خاص اہتمام

سے شائع کرایا ہے۔ نظمیں مدح اہلِ بیت علیہم السلام، اخلاق و آداب پند و نصائح وغیرہ پر مشتمل ہیں حقیقت میں شاہ صاحب نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ کتاب کے مطالب مختصراً یوں بیان ہو سکتے ہیں:۔

انبیاء، آئمہ، و اولیاء اللہ کے مراتب کی توضیح ہمت و تدبیر کی فضیلت، رہبانیت اور گداگری کی تنقیص، ظلم ریاکاری وغیرہ۔ بدترین گناہ ہیں، احکام شریعت پر عمل ضروری ہے، ناجائز عیش و عشرت کا انجام اور اسی قسم کے بعض اور اہم اور نتیجہ خیز موضوعات پر بہت سی دلپذیر نظمیں صدائے درا میں موجود ہیں۔ حجم ۱۳۰ صفحے کتابت کاغذ اور طباعت عمدہ قیمت صرف ۹ر جو کتاب کی خوبیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ ذیل کے پتے سے طلب فرمائیے۔

مینیجر خواجہ بک ایجنسی موچی دروازہ لاہور۔

طبیبہ حصہ اوّل۔ یہ کتاب علی احمد صاحب زاہد جبل پور کی تصنیف ہے اس میں عورتوں کی خاص بیماریوں کے نہایت سہل الحصول علاج نہایت سادہ اور واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں کتاب کا حجم ۱۱۲ صفحہ کے قریب ہے اور تمام کی تمام کتاب عورتوں کے لئے نہایت مفید اور ضروری معلومات پر مشتمل ہے ہمارے خیال میں کوئی گھر اس کتاب سے خالی نہیں رہنا چاہیئے اس قسم کی مفید کتابوں کو جس قدر مقبولیت ہو کم ہے۔ کاغذ کتابت طباعت نہایت نفیس قیمت۔ عہ ذیل کے پتہ سے طلب فرمائیے:۔

ایس۔ اے احمد اینڈ کمپنی متصل جامع مسجد جبل پور

پردۂ غفلت۔ یہ ڈراما جناب سید عابد حسین صاحب کی تصنیف ہے اس میں نہایت دلچسپ پیرایہ میں ایک زمیندار گھرانے کا قصہ درج کیا گیا ہے اور زمینداروں کی معاشرت کی نہایت صحیح تصویر کھینچی گئی ہے کتاب کا حسن طباعت اور کاغذ قابلِ داد ہے۔ یہ کتاب ٹائپ کے حروف میں برلن سے طبع کرائی گئی ہے۔ سرورق نفیس ہے حجم ۱۴۶ صفحے قیمت عہ جو کتاب کی خوبیوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ نہیں شرکت کا دبیہ علی گڑھ سے طلب فرمائیے

اخبارات و رسائل

تجارت۔ یہ ہفتہ وار مصور اردو اخبار حال ہی میں بمبئی سے جاری ہوا ہے اور چونکہ تجارتی حالات اور معلومات

کی نشرو اشاعت کے مقاصد کو پیش نظر رکھکر جاری کیا گیا ہے۔ اس لئے اپنی قسم کا ایک خاص اخبار ہے جسکی ملک کو بے انتہا ضرورت تھی یہی وجہ ہے کہ یہ اخبار بہت جلد مقبول عام ہو گیا ہے۔ تجارتی مضامین کے علاوہ ملک کے عام سیاسی حالات پر بھی نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بحث کی جاتی ہے اور ایسی حالت میں جبکہ ملک میں چپہ چپہ پر جماعت بندیاں ہو رہی ہیں اس اخبار کی متین اور مرنجاں مرنج روش بغایت مستحسن ہے۔ تجارت نے صحافت کے صحیح مفہوم کو سمجھا ہے اور اس کامیابی کیلئے ہم اسکے قابل ایڈیٹر جناب قاضی محمد عطاالله صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ہر [illegible] عکسی تصاویر شائع ہوتی ہیں حجم ۲۰ صفحہ ان خوبیوں کے مقابلہ میں چندہ حیرت [illegible]

(پتا) دفتر تجارت۔ بھنڈی بازار بمبئی۔ ع ۹

پھول کا سالگرہ نمبر ۔ بچوں کے اخبارات میں پھول (لاہور) سب سے قدیم اور سب سے زیادہ وقیع ہے ۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو پھول کا سالگرہ نمبر خاص اہتمام سے شائع ہوا۔ اس کا حجم ساٹھ صفحے کے قریب ہے اور بچوں کی دلچسپی کے بہت سے مضامین کہانیاں نظمیں اور تصاویر درج ہیں۔ دوسری تصویروں کے علاوہ سات خوبصورت ہاف ٹون عکسی تصاویر بھی شامل ہیں سرورق خوبصورت رنگین ہے۔ بچوں والے ہر ایک گھر میں پھول ضرور موجود ہونا چاہیئے۔ دفتر اخبار پھول، لاہور سے طلب فرمایئے۔

سہیلی امرتسر کا خاص نمبر ۔ نومبر میں رسالہ سہیلی امرتسر کا ایک نمبر خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے اس پرچہ کا حجم ۱۲۸ صفحہ کے قریب ہے۔ خواتین کی دلچسپی کی متعدد ہاف ٹون اور رنگین تصاویر رسالہ کو زینت دے رہی ہیں۔ اکثر مضامین مشاہیر ملک سے لکھوائے گئے ہیں اور دلچسپ اور مفید ہیں، ہم خواتین سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس قابل قدر رسالہ کو ضرور دیکھیں۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ سرورق سنہرا۔ قیمت فی پرچہ ۱۲ ذیل کے پتے سے طلب فرمایئے:۔

مینجر رسالہ سہیلی امرتسر